

ستمبر 2012

بہنوں کا اپنا مآہنامہ

شعاع

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

www.paksociety.com

www.paksociety.com



مستقل سلسلے

278	خالہ جیلانی	خط آب کے	28	رضیہ جمیل	کھلتا کیسی پہ
274	خالہ جیلانی	مُسکراہٹیں	267	ساترہ غلام نبی	موسم کے یگان
290	ادارہ	ایتنی خالے میں	282	تبصیر نشاط	خوبصورت بنے
		یا لول سے خوشبو لے	271	شگفتہ جاہ	
		یا رخ کے جھروکے	286	امت الصور	

ستمبر 2012

جلد 27 شمارہ 1
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلمیں حسن پر نشنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقابلاً ۲۰/۱۱/۲۰۱۱ء لری سی بیج ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

ناولٹ

234	فائزہ افتخار	سندریلا
142	ام طیفور	دیدہ بینا

افسانے

136	کیز نبوی	روٹے کا آدمی
224	سمیرا حمید	کھیل ختم
60	فرح طاہر	چمکے دکھ
66	ام میم	وہ مختسب

نظمیں، غزلیں

266	مسعود صدیقی	غزل
266	عینی زاسید	غزل
265	انور خالد	نظم
265	خمار بارہ بکوی	غزل

ذرا سا لڑنے بک لکھتے ریگسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

10	رضیہ جمیل	پہلی شعاع
11	اقبال عظیم	حمد
11	سراج المنیر تسنیم	نعت
12	ادارہ	نئی کی باتیں

انسٹروپو

17	عائشہ گل	بندھن
24	شاہین رشید	دستک
280	امیر خالد	مشاعری

ناول

36	عالیہ بخاری	دلوار شب
158	آمنہ ریاض	ستارہ شام

مکمل ناول

180	نمرہ احمد	جنت کچیتے
74	ساترہ رضا	دل موم کا دیا

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

شعاع کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
بچھلا شمارہ سالگرہ نمبر تھا۔ حسب روایت قارئین نے سالگرہ نمبر کی بھرپور پذیرائی کی۔ خط لکھ کر، فون کر کے لہجہ پسندیدگی اور برخلوس جذبات کا اظہار کیا۔ ان تمام خطوط کی اشاعت اور فرداً فرداً جواب دینا ممکن نہیں ہے۔ ہم ان تمام بہنوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دل سے ان کی قدر کرتے ہیں جنہوں نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھے۔ آپ کے خطوط نہ صرف ہمارے لیے آپ کی دل لگائی جانے کا ذریعہ ہیں۔ بلکہ ہمیں اپنی قارئین کی صلاحیتوں اور ذہانت سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ دور دماز کے کسی چھوٹے سے گاؤں سے آئے ہوئے یہ خطوط ہمیں بتاتے ہیں کہ شعاع کی شعاعیں کتنی دور دور پھیل رہی ہیں۔ شعاع کی قارئین کتنی ذہین اور باصلاحیت ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار وہ کتنی خوبصورتی سے کرنے پر قادر ہیں۔
شعاع آج مقبولیت کی اس منزل پر ہے جہاں بے شمار قارئین اسے پڑھتے ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ ہمارے لیے اس مقبولیت کو اس اعتماد کو قائم رکھنا اور اس کے معیار کو برقرار رکھنا بہت بڑا امتحان ہے۔ ہم ہر گھڑی اسے خوب سے خوب تر بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ ایسے میں آپ لوگوں کا تعاون، اعتماد، مشورے اور محبتیں ہمارا حوصلہ بندھاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ شعاع کا معیار ہمیشہ قائم رہے اور آپ کی محبتیں یوں ہی ہمارے ساتھ رہیں۔

اس شمارے میں،

انسان اس کائنات کی سب سے عظیم اور غیر یقینی تخلیق ہے۔ وہ کس بل کیا کر جائے، کون سا روپ اختیار کر جائے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کے ناقابل فہم رویوں کی لاکھ توجہ نہیں پیش کی جائیں لیکن اس معنی کو حل کرنا آسان نہیں۔ کوئی دوسرا تو کیا کبھی کبھی انسان اپنے آپ کو خود بھی نہیں سمجھ پاتا۔ وہ اپنے رویوں کے پس پشت جذبات و احساسات سے لاعلم رہتا ہے۔
سائرہ رضوانے ایک ایسے ہی کردار پر مبنی ناول لکھا ہے۔ یہ ان کا قریبی مشاہدہ ہے، جسے انہوں نے بڑی خوبصورتی سے کہانی کا روپ دیا ہے۔ آپ اس ناول کو پڑھ کر اس کرطاس کے بارے میں اپنا تجربہ ضرور لکھیں۔
نمرو احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے ایک نئے موڑ پر،
فائزہ افتخار اور ارم طیفور کے ناول،
کینز نبوی، سمیرا حمید، اتم مریم اور فرح طاہر قریشی کے افسانے،
عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
عائشہ گل اور محمد امین پراچہ کا بندھن،
معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ بندھن،
سارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
خطاب کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
شعاع کا یہ شمارہ کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

اقبال عظیم

تیری مدحت اور میں مغزور و سرتاپا قصور
میں کہاں سے لاؤں اتنا حوصلہ اتنا شعور
صرف تیرے آسرے پر لب کشا ہوتا ہوں میں
اس سعادت کی مجھے توفیق دے رب غفور
غنیہ و گل آئینہ تیرے جمالِ قدس کا
ماہ و انجم سے عیاں تیری تجلی تیرا نور
ہے رواں تیرے اشارے پر نظام کائنات
گردش افلاک بھی سجدہ کنناں تیرے حضور
ذرہ ذرہ خاک کا تیری عظمت کا نقیب
بڑا بڑا ملک تان کا تیری قدرت کا ظہور
سرخرو ہیں تیری رحمت سے ترے سجدہ گزار
سزنگوں ہے تیرے آگے کفر و باطل کا غرور
مل چکا اقبال کو سب کچھ تری سرکار سے
بخش دے اس کی خطائیں بھی میرے رب غفور

سراج المنیر تسنیم

زبان پر محمد کا نام میرے اللہ
دروہوں کا لطف کلام میرے اللہ
روضہ پاک خیر الانعام میرے اللہ
کس قدر ہے ادب کا مقام میرے اللہ
قرینہ سکھایا ہے جینے کا ہسم کو
شریعت بھی کیا ہے نظام میرے اللہ
آسمان و زمین چاند سورج تارے
سبھی بھیجتے ہیں سلام میرے اللہ
دل ہے مسرور یاد محمدؐ میں ایسے!
جیسے تسنیم و کوثر کا جام میرے اللہ
سامنے مصطفیٰ کے حقیقت کیا ان کی
پھول ہوں یا کہ ماہ تمام میرے اللہ
دُعائیں قبول ہو گئیں تیری تسنیم
مدینے سے آیا پیام میرے اللہ

صبر کا اجر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا وہ مومن بندہ جس کی محبوب ترین چیز میں واپس لے لوں، لیکن وہ اس پر ثواب کی نیت (سے صبر و رضا کا مظاہرہ) کرے، اس کے لیے میرے پاس جنت کے سوا کوئی بدلہ نہیں ہے۔“ (بخاری)

فائدہ: بچے، بیوی اور والدین وغیرہ سب انسان کے لیے محبوب ترین چیزیں ہیں۔ ان کی وفات پر اللہ کا حکم سمجھ کر صبر کرنا کمال ایمان کی علامت ہے اور بے صبری، جزع و فزع اور اول فoul بکنا ضعف ایمان کی دلیل۔ پہلی بات کا صلہ جنت ہے اور دوسری بات اللہ کی ناراضی کا باعث۔

عذاب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا: ”یہ عذاب تھا، جس پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اسے نازل فرماتا۔ اب اللہ نے اسے مومنوں کے لیے رحمت (کا ذریعہ) بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو بندہ طاعون (کی بیماری) میں مبتلا ہو جائے اور وہ اپنے (طاعون زدہ) شہری میں صبر کرتا ہوا ثواب آخرت کی نیت سے ٹھہرا رہے۔ اسے یقین ہو کہ اسے وہی کچھ پہنچے گا جو اللہ نے اس کے لیے لکھ دیا ہے تو ایسے شخص کے لیے شہید کی

مثل اجر ہے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1- طاعون یا اسی قسم کی دیگر وبائی بیماری میں اللہ کی تقدیر و مشیت پر ایمان رکھتے ہوئے اسی شہر میں رہنا اور اس میں مبتلا ہونے کی صورت میں جزع و فزع اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کرنا، ایک مومن کو شہادت کے رتبے سے ہمکنار کر سکتا ہے اسی طرح اور بھی بعض لوگوں کو یہ اجر ملے گا مثلاً ”غرق ہو کر مرنے والوں کو“ حالت زچگی میں فوت ہونے والی عورت کو وغیرہ وغیرہ۔

2- یہ حکم اس لیے ہے تاکہ یہ وبائی مرض دوسرے شہروں میں نہ پھیلے۔ علاوہ ازیں دوسرے شہروں کے رہنے والوں کے لیے حکم ہے کہ وہ طاعون زدہ شہر میں جانے سے اجتناب کریں۔

3- اس سے معلوم ہوا کہ حفاظت اور علاج کے اسباب اختیار کرنا تقدیر الہی پر ایمان رکھنے کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح مرض پر صبر اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر رضامندی کی دلیل ہے جو کمال ایمان ہے۔

4- اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاید بیماری از خود متعدی ہوتی ہے، اس لیے طاعون میں مبتلا شخص کو دوسری جگہ جانے سے روکا گیا ہے۔ جبکہ دوسری حدیث میں ہے کہ بیماری متعدی نہیں ہوتی۔ اس کی تطبیق یہ ہے کہ سب ذریعہ کے طور پر روکا گیا ہے کہ کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس کا یہ عقیدہ نہ بن جائے کہ مجھے فلاں کی وجہ سے بیماری لاحق ہوئی

ہے۔

آنکھیں

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جب میں اپنے بندے کو اس کی دو پیاری چیزوں کے ذریعے سے یعنی آنکھوں سے محروم کر کے آزمائوں پس وہ اس پر صبر کرے تو میں اس کے بدلے میں اسے جنت دوں گا۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل:

آنکھیں اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بطور احسان ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔ عدم بصارت (آنکھوں کا نہ ہونا) دنیا میں بہت بڑی محرومی ہے اور اللہ تعالیٰ جزا بھی بقدر مشقت عطا فرماتا ہے، اس لیے اس محرومی پر صبر بہت بڑا عمل ہے جس کی جزا جنت ہے، بشرطیکہ نابینا ایمان کی دولت سے مالا مال ہو۔

جنتی عورت

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: ”کیا میں تجھے جنتی عورت نہ دکھلاؤں؟“ میں نے کہا: ”کیوں نہیں؟“ ضرور دکھلائیے! انہوں نے فرمایا: ایک کالی عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے کہا مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے جس سے میں تنگی ہو جاتی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے اللہ سے دعا فرمائیں (کہ اس بیماری سے مجھے نجات مل جائے)۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر تو چاہے تو اس تکلیف پر صبر کر، اس کے بدلے میں تیرے لیے جنت ہے اور اگر تو چاہے تو میں اللہ سے دعا کر دیتا ہوں کہ اللہ تجھے اس بیماری سے عافیت دے دے۔“ اس نے کہا میں صبر ہی اختیار کرتی ہوں، تاہم (دورے کے وقت) میں تنگی ہو جاتی ہوں، آپ صلی

اللہ علیہ وسلم اللہ سے یہ دعا فرمادیں کہ میں تنگی نہ ہوں کروں۔“ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- رخصت کے مقابلے میں عزیمت کو اختیار کرنا، بشرطیکہ انسان اسے استقلال کے ساتھ برداشت کرے، بہت اجر و ثواب کا کام ہے۔ اسی طرح علاج معالجے کے ساتھ بارگاہ الہی میں دعا سے بھی اجتناب نہ کیا جائے۔ دونوں کی اپنی اپنی اہمیت و افادیت ہے۔

2- بیماری اور آزمائش سے عافیت طلب کرنی چاہیے اور صحت کو غنیمت سمجھنا چاہیے، تاہم بیماری کی حالت میں صبر کیا جائے۔ واویلا اور ناشکری سے اجتناب کیا جائے کیونکہ اس سے بیماری تو کم نہیں ہوتی البتہ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

بیماری اگر طول پکڑ جائے تو اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونے اور شکوہ کرنے کے بجائے تقدیر پر راضی رہنا چاہیے۔

3- کسی سے دعا کروانا صبر کے خلاف نہیں ہے، تاہم دور حاضر میں مشکل کے وقت مزاروں اور قبروں سے مانگنا جائز نہیں۔ خاتون کے عقیدے کا بھی علم ہوتا ہے کہ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ نہیں کہا اسے درست کروں بلکہ یہ کہا اللہ سے دعا کریں۔ مجھے درست کر دے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ صحت اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے اس قسم کے اختیارات اسی کے پاس ہیں، اس کے علاوہ کوئی مختار کل، مشکل کشا اور حاجت روا نہیں ہے۔

دعوت حق

ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہ السلام میں سے کسی نبی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، جنہیں ان کی قوم نے مار کر لہو لہان کر دیا اور وہ اپنے چہرے سے خون

پوچھتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ یا اللہ! میری قوم کو معاف فرمادے اس لیے کہ وہ بے علم ہے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1- بعض کے نزدیک یہ پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام اور بعض کے نزدیک خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس اخلاق و کرم کا بیان ہے جس میں داعیانِ دین کے لیے بڑا سبق ہے کہ تبلیغ و دعوت کی راہ میں تکلیفیں برداشت کی جائیں، لوگوں کی بد اخلاقی اور بد سلوکی کے مقابلے میں غصہ و درگزر سے کام لیا جائے اور اللہ سے ان کے لیے معافی اور ہدایت کی دعا مانگی جائے، نیز جاہلوں سے جاہلوں والا معاملہ نہ کیا جائے۔ یہ اخلاقی خوبی اور کردار کی بلندی، ایک دینی دین کے لیے نہایت ضروری ہے۔

دنیا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے:

”دنیا ملعون ہے۔ اس میں جو کچھ ہے، سب ملعون ہے، سوائے اللہ کے ذکر کے اور اس سے تعلق رکھنے والی اشیاء کے اور سوائے عالم اور طالب علم کے۔“

فوائد و مسائل :

1- لعنت کا مطلب اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی ہے، یعنی دنیا چونکہ اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے اس لیے یہ لعنت کا باعث ہے۔

2- ہر وہ چیز یا عمل جس کا اللہ کی یاد سے کسی بھی انداز سے کوئی تعلق ہو اس پر یا اس کی وجہ سے رحمت نازل ہوتی ہے، چنانچہ تلاوت، نماز، اللہ کے لیے جانور کی قربانی اور حج و عمرہ کے اعمال سب رحمت کا باعث ہیں۔ ایسے اعمال انجام دینے والا اللہ کی لعنت سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح کعبہ، صفا و مروہ، منی، عرفات، مزدلفہ اور ہر مسجد و مدرسہ اللہ کی رحمت کے مقامات ہیں۔ یہاں دین کی خدمات انجام دینا اور دین کے خادموں کی ضروریات مہیا کرنا، دینی کتابیں چھاپنا

اور دوسروں تک پہنچانا، ان کی تعلیم دینا اور تعلیم حاصل کرنا، علماء و طلباء کی ضروریات پوری کرنے کی نیت سے حلال روزی کمانا یہ سب اللہ کی رحمت کے اسباب ہیں۔

3- دین کے علم سے کسی بھی انداز سے منسلک ہونا اللہ کی رحمت کا باعث ہے، اس لیے اگر دنیوی علوم و فنون بھی خدمتِ دین کی نیت سے حاصل کیے جائیں تو وہ بھی دین کے خادم علوم ہونے کی وجہ سے لعنت کے دائرے سے خارج ہو جائیں گے۔ اگر یہ نیت نہ ہو تو یہ علوم رحمت کا باعث نہیں ہوں گے۔

4- حلال روزی کمانا اللہ کا حکم ہے، اس لیے اللہ کے حکم کی تعمیل کے لیے حلال روزی کمانا اور حلال کاموں میں خرچ کرنا ثواب کا کام ہے۔

دنیا قید خانہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔“

فوائد و مسائل :

1- جس طرح قیدی جیل میں بہت سے قوانین کا پابند ہوتا ہے، بلا اجازت وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مومن دنیا میں مبنی نہیں کرتا بلکہ ہر قدم پر اللہ کے احکام پر عمل کرتا ہے، اس کے بدلے میں اسے جنت ملے گی۔

2- کافر دنیا میں آزادی کی، یعنی بے قید زندگی گزارتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اسے جہنم کا عذاب ملنے والا ہے۔ جہنم کے عذابوں کے مقابلے میں دنیا کی سخت سے سخت زندگی بھی جنت کے برابر ہے۔

جس شخص کو اہمیت نہیں دی جاتی

حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”کیا میں تمہیں جنت والے نہ بتاؤں؟ ہر ضعیف آدمی، کمزور سمجھا جانے والا (جنتی ہے)۔ کیا میں تمہیں جہنم

والے نہ بتاؤں؟ ہر درشت، خوں زہر پرست، متکبر (جہنمی ہے)۔“

فوائد و مسائل :

1- ”کمزور سمجھا جانے والا“ سے مراد شریف النفس آدمی ہے، جو کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی زیادتی کرے تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ لوگ اسے کمزور سمجھتے ہیں، اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے اور نہ اس کے شر و عیوہ ہی کا کوئی خوف ہوتا ہے۔

2- انفرادی معاملات میں نرمی اور درگزر کا چلن عام ہو جائے تو معاشرہ امن کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ فساد و فحشاء اس وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی اپنی مالی، جسمانی یا خاندانی اور انفرادی طاقت پر گھمنڈ کر کے دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ اگر وہ کسی پر زیادتی نہ کرے، خواہ اسے کمزور سمجھا جائے تو یہ اعلیٰ اخلاق کا نمونہ ہے جس کا ثواب جنت ہے۔

3- درشت خو سے مراد بات چیت کے انداز میں اور برتاؤ میں سختی اختیار کرنے والا ہے۔ اس قسم کے بد اخلاق آدمی سے ہر کسی کا بھگڑا ہوتا ہے جس سے فساد جنم لیتا اور برہتا ہے۔

4- یعنی ایسا حریص آدمی جو مال جمع کرتا رہتا ہے لیکن بخیل بھی ہے، خرچ نہیں کرتا۔ مومن میں حرص اور بخل کی عادتیں نہیں ہوتیں بلکہ یہ منافقوں اور کافروں میں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

5- متکبر سے مراد دوسرے کو حقیر سمجھنا اور حق واضح ہو جانے کے باوجود تسلیم نہ کرنا ہے۔ یہ برتری کا غلط احساس بہت سی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کا باعث ہے۔

قابل رشک مومن

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل رشک وہ مومن ہے جو ہلکا بھلکا (کم آمدنی والا) ہو اسے نماز سے وافر حصہ ملا ہو (نفل نماز اور تہجد زیادہ پڑھتا ہو) لوگوں میں گناہ ہو، اس کی پروا نہ کی جاتی ہو اسے ضرورت کے مطابق رزق میسر ہو (اتنا زیادہ رزق نہ ہو کہ بچا کر رکھا جائے) وہ اس پر صبر کرے (مزید کالاچ نہ کرے) اسے جلدی موت آجائے، اس کا ترکہ تھوڑا ہو اور اسے رونے والیاں بھی کم ہوں۔“

سادگی

حضرت ابو امامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”سادگی ایمان میں سے ہے۔“

راوی نے کہا: سادگی سے مراد معمولی لباس و غذا پر اکتفا کرنا ہے۔

فوائد و مسائل : 1- تکلفات سے پرہیز ایمان کا جزو ہے، لہذا سادہ عادات کا حامل عام نعمت پر بھی اللہ کا شکر کرتا ہے جب کہ زیب و زینت کا عادی بعض اوقات ایک بڑی نعمت کو بھی اپنے معیار سے کمتر سمجھتا ہے اور شکر کی بجائے شکوہ کرتے لگتا ہے۔

2- سادگی میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، مثلاً: پیوند لگا کپڑا پہن لینا، زمین پر بیٹھ جانا، مفلس اور غریب کی بات سننے اور حتی الوسع مدد کرنے کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھنا، غریب کی معمولی دعوت قبول کر لینا اور اس کا پیش کیا ہوا سادہ کھانا کھا کر احسان مندی کا اظہار کرنا۔ ملازموں سے تحقیر آمیز رویہ رکھنے سے اجتناب کرنا، اپنے سے کم تر درجے کے لوگوں کی خوشی اور غمی میں شریک ہونا وغیرہ۔

بہترین افراد

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا،

بندھن

عائشہ کل تمہارا کٹر محمد امین پرچہ

شایدین رشید

”کچھ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتاؤ؟“
”میں خوجہ (اسماعیلی فرقے) فیملی سے تعلق رکھتی ہوں اور اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں۔ پہلے میں دہلی میں تھی اب ہم دونوں میاں بیوی یہاں پاکستان میں ہیں۔ میرے میاں بھی ڈاکٹر ہیں جو کہ ”سناؤ تھ شہ اسپتال“ میں کام کرتے ہیں۔“

”دہلی سے پاکستان کیوں آئیں اور تمہاری ڈاکٹری کیسی چل رہی ہے اور کہاں جاب کر رہی ہو؟“

”میں نے پاکستان اس لیے آئی کہ میرے میاں صاحب کی یہاں جاب ہے اور میں پریکٹس نہیں کر رہی، کیونکہ مجھے شوبز میں کام کرنے میں زیادہ مزا آرہا ہے۔“

”میں بڑی حیران ہوتی ہوں اس بات سے کہ اکثر لڑکیاں اور لڑکے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لیتے ہیں مگر پھر شوبز میں آجاتے ہیں یا کچھ اور کرنے لگتے ہیں۔ ایسا کیوں کرتے ہیں؟“

”یہ بھی تو دیکھیں کہ ہم اپنی اداکاری سے کتنے لوگوں کی زندگیوں میں اچھا تاثر ڈال دیتے ہیں۔ ہنستے ہوئے کورلا دیتے ہیں اور روتے ہوؤں کو ہنسادیتے ہیں، ایسی اچھی جاب کوئی اور ہو سکتی ہے۔“

”مگر میڈیکل تو ایک بہت ہی ضروری اور پروقار پروفیشن ہے۔“

”زندگی کے کافی سال دہلی میں گزارنے کے بعد جب عائشہ کل پاکستان آئیں اور ڈراموں میں پرفارم کرتی ہوئی نظر آئیں تو سوچا کیوں نہ غائب ہونے کے بعد دوبارہ فیلڈ میں آنے کا سبب پوچھیں اور ساتھ ہی ”بندھن“ کے لیے انٹرویو بھی کر لیں کہ نئی زندگی کیسی گزر رہی ہے۔“

عائشہ کل نہ صرف بہت اچھی فنکارہ ہیں بلکہ بہت بااخلاق بھی ہیں۔ اپنی میٹھی زبان سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔

”عائشہ کل! کیسی ہو؟“
”الحمد للہ۔ آہ! آپ کیسی ہیں۔“

”بالکل ٹھیک ٹھاک۔ کیا ہو رہا ہے آج کل؟“
”بس جی کام ہی ہو رہا ہے۔ آج کل کافی ڈرامے بن رہے ہیں اور اس لحاظ سے ہمیں بھی کام مل رہا ہے۔“

”ڈرامہ سیریل ”کاسے کو بیابا بدلیں“ میں بہت تیز طرار بھابی کا رول تم نے کیا تھا۔ اصل میں کیا صورت حال ہے؟“

”میں بالکل بھی ایسی نہیں ہوں۔ اور کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں ایسی بھابی ہوں گی اور ویسے یہ بات مجھ سے زیادہ میرے شوہر جانتے ہیں کہ میں کیسی بھابی اور کیسی بہو ہوں۔ وہ زیادہ بہتر طریقے سے جتا سکیں گے۔ کوئی بھی انسان اپنے آپ کو برا نہیں کہتا۔“

فوائد و مسائل :

1- غریب مسلمان اگرچہ گناہ ہو، دنیا والوں کی نظروں میں اس کا کوئی مقام نہ ہو لیکن اللہ کے ہاں ایسا ایک آدمی بھی دنیا بھر کے ان انسانوں سے بہتر ہے جو ایمان و تقویٰ سے محروم ہوں۔

2- اللہ کے ہاں اصل اہمیت اور قدر و منزلت ایمان و تقویٰ کی ہے نہ کہ مال و دولت، شان و شوکت، ذات برادری اور نام و نسب کی۔

3- نکاح کے لیے نیک مردوں اور نیک عورتوں کا انتخاب کرنا چاہیے، خواہ وہ غریب ہی ہوں۔ غریب نیک آدمی، امیر نیک آدمی کا ہم پلہ ہے لیکن بد عقیدہ یا بری عادتوں والا دولت مند شخص، نیک آدمی کا ہم پلہ نہیں۔

ناداروں کے مقام و مرتبے کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نادار مومن دولت مندوں سے آدھادوں، یعنی پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔“

1- اللہ کے ہاں ہزار سال کی مدت ایک دن کے برابر ہے۔ (سورۃ حج، آیت: ۴۷) اس لیے دولت مندوں سے آدھادوں پہلے جنت میں جانے کا مطلب دنیا کے حساب سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہونا ہے۔

2- پہلے جنت میں جانا ان کے بلند درجات کو ظاہر کرتا ہے اور انہیں محشر کی مشکلات بھی کم برداشت کرنی پڑیں گی۔



آپ فرما رہے تھے: ”کیا میں تمہیں تمہارے بہترین افراد کی نشان دہی نہ کروں؟“
صحابہ نے عرض کیا: ”کیوں نہیں اللہ کے رسول!“
”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہارے بہترین افراد وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آئے۔“

تنگ دستی کی فضیلت

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

انہوں نے عرض کیا: ”اس کے بارے میں آپ کی رائے زیادہ صحیح ہے۔ ہم تو (اپنی معلومات کے مطابق) یہ کہتے ہیں: یہ شخص معزز (دولت مند) افراد میں سے ہے۔ اس کے بارے میں یہی توقع ہے کہ اگر (کسی گھرانے میں) نکاح کا پیغام دے تو اس کا پیغام قبول کیا جائے، اگر (کسی کی) سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے اور اگر بات کرے تو اس کی بات سنی جائے (اور اسے اہمیت دی جائے)۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔
(پھر) ایک آدمی گزرا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟“
انہوں نے کہا: ”اللہ کے رسول! قسم ہے اللہ کی! ہم تو کہتے ہیں کہ یہ ایک غریب مسلمان ہے۔ اس کے

بارے میں توقع ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اسے رشتہ نہ دیا جائے۔ اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے۔ اگر بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ (غریب مسلمان) اس (پہلے) شخص جیسے زمین بھر آدمیوں سے بہتر ہے۔“



ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے آئیڈیا ہو گیا کہ یہ بہت اچھے انسان ہیں۔

میرے دوست ہیں۔ ہر بات میں سپورٹ کرتے ہیں۔ ان کا دل بہت اچھا ہے۔ کبھی کبھی کسی بھی ضرورت مند کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ سے ایسے ہی لائف پارٹنر کی خواہش تھی جو کہ پوری ہو گئی۔ یہ میری زندگی کا بہترین فیصلہ تھا۔

”شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا۔ اور سسرال کو کیسا پایا۔ کتنے لوگ ہیں سسرال میں۔“

”شادی کو ماشاء اللہ دو سال ہو گئے ہیں۔ بچے فی الحال نہیں ہیں۔ اور سسرال ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ میری ایک نند اور دو دیور ہیں۔ میری ساس بہت سیدھی سادھی اور محبت کرنے والی شخصیت ہیں۔ سسرال میں سب ہی بہت اچھے ہیں اور پڑھے لکھے ہیں۔ ایک دیور ڈینٹسٹ ہیں اور نند ہاؤس وائف ہیں اور بہت اچھی لک بھی ہیں۔“

”محمد امین صاحب پراچہ فیملی سے اور تم اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتی ہو تو رسم و رواج میں تو فرق ہو گا۔“

”بالکل فرق ہے اور میں نے رسموں کو انجوائے کیا اور یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انسان ایک کچر سے دوسرے کچر میں جائے اور مجھے ذرا بھی میل نہیں ہوا کہ میں کسی اجنبی خاندان میں آگئی ہوں۔“

”کھانے پینے میں اور ذائقہ میں فرق ہے؟“

”جی جی۔ بالکل ہے۔ ہمارے کھانے زیادہ اسپاٹسی (چٹ پٹے) ہوتے ہیں۔ ہمارے کھانوں کا ذائقہ مختلف ہوتا ہے۔ ہم ہندی زیادہ استعمال کرتے ہیں اپنے کھانوں میں۔ جبکہ ان کا تعلق کوہاٹ سے ہے اور کوہاٹ والے زیادہ اسپاٹسی کھانوں کو پسند نہیں کرتے۔ اب میں ان کے رنگ میں رنگ گئی ہوں اور جو یہ پسند کرتے ہیں وہ ہی میں بھی پسند کرتی ہوں۔“

”غیر برادری میں جاتے وقت کچھ خدشات تھے

”تو پھر سروس فری ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں پیسے نہیں لینے چاہئیں۔“

”یہ کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر تو کسی بھی پروفیشن میں پیسے نہیں لینے چاہئیں۔ ویسے میڈیکل کی تعلیم کیوں حاصل کی؟“

”پڑھائی تو اچھی لائف گزارنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ اور میڈیکل کی ڈگری ہے میرے پاس۔ میں کسی وقت بھی اس فیلڈ کو جوائن کر سکتی ہوں۔“

”گٹھ۔ وہ کیا کرتے ہیں اور پاکستان میں رہنا کیسا لگ رہا ہے۔“

”میرے میاں محمد امین ٹراما سرجن ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہت قیمتی وقت پاکستان سے باہر گزارا ہے۔ میں پاکستان کو بہت مٹس کرتی تھی تو بس اس لیے یہاں آگئی ہوں۔ میں ابھی بھی باہر آتی جاتی رہتی ہیں لیکن اب یہاں میری مصروفیات زیادہ ہو گئی ہیں تو مجھے یہاں رہنا زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔“

”محمد امین پراچہ صاحب سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی اور آپ دونوں کا بندھن کیسے بندھا؟“

”ان سے میری ملاقات ایک دوست کے ذریعے ہوئی۔ میں اپنی دوست کی برتھ ڈے تقریب میں گئی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

میں نے کہا کہ ایکسکس کیوزی دوستی کیا ہوتی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ آپ مجھے اچھی لگی ہیں اور میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ میری فیملی سے بات کریں اور بس پھر چھ ماہ کے اندر اندر ہماری شادی ہو گئی۔ ہم نے کوئی بوائے فرینڈ گرل فرینڈ والا ٹائم نہیں گزارا۔“

”پراچہ صاحب نے جب پروپوز کیا تو مانڈ کیا تھا؟“

”نہیں میں نے بالکل مانڈ نہیں کیا۔ بلکہ کہہ دیا کہ انی فیملی کو بھیج دیں اور میں آپ کو بتاؤں کہ آج کل اچھے انسان کا ملنا بہت دشوار ہے۔ اور جب میری

انہیں۔ اور میں دعا کرتی ہوں کہ ان جیسا شوہر اللہ ہر لڑکی کو دے۔ میں غصے کی تیز ہوں۔ یہ بالکل بھی تیز نہیں ہیں کوئی خیر نہیں ہے۔“

”تم اپنی فیلڈ میں مصروف رہ اپنی فیلڈ میں مصروف تو مسئلہ ہوتا ہے کیا؟“

”ان کی ٹائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے اور میں صبح کام پہ جاتی ہوں تو جب میں گھر سے جا رہی ہوتی یہ پھر آرہے ہوتے ہیں زندگی میں جو بھی وقت گزاریں وہ کوالٹی ٹائم ہونا چاہیے۔ ورنہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر بور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے درمیان بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے اور میرے میاں مجھے میرے کام میں

ذہن میں؟“

”نہیں ایسے کچھ خدشات نہیں تھے کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ سب سے پیاری زبان پیار کی زبان ہوتی ہے اور آپ کو پیار کروانا آنا چاہیے۔ دو قدم آپ آگے بڑھیں پھر دوسروں سے آگے بڑھنے کی امید رکھیں۔“

”نکاح کے وقت کیا تاثرات تھے۔ رونا آیا تھا؟ اور مزاج کا کیسا پایا؟“

”بالکل رونا آیا تھا اور تھوڑا بہت ڈر بھی تھا کیونکہ یہ ساری زندگی کا سوال ہوتا ہے۔ ہاتھ پیر کپکپا رہے ہوتے ہیں۔ سب آپ کا مذاق اڑا رہے ہوتے ہیں کہ آگے جاؤ گی تو ہاتھ چلے گا۔ مزاج کا بہت اچھا پایا میں نے



بات ہے تو اللہ تعالیٰ ہر انسان کو مختلف صلاحیتیں دیتا ہے تو جو جس کی صلاحیت رکھتا ہو اسی کا استعمال کرنا چاہیے۔ ہم دونوں اپنی فیلڈ میں کامیاب ہیں۔“
”آپ بھی چاہیں گے اس فیلڈ میں آنا؟“

”نہیں۔ میں اپنے کام سے بہت خوش ہوں جو ریوارڈز مجھے اس کام سے ملتے ہیں جو سکون مجھے لوگوں کی خدمت کر کے حاصل ہوتا ہے وہ شوبز میں کام کر کے حاصل نہیں ہوگا۔ اہمیت میری فیلڈ کی بھی بہت ہے ان کی فیلڈ کی بھی ہے۔ میں ایمر جنسی ان ٹراما سرجری میں اسپیشلائزڈ ہوں۔ تو جو لوگ ایمر جنسی میں آتے ہیں چاہے وہ ٹراما سے متعلق ہوں یا میڈیسن سے۔ ان کو لک آفٹر اسپیشلسٹ کرتے ہیں اور میں بھی اس فیلڈ کا اسپیشلسٹ ہوں۔“

”پاکستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹرز تو یہاں رہنا پسند نہیں کرتے۔ آپ کو خیال نہیں آیا ملک سے باہر جانے کا؟“

”میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو بادشاہی اس ملک میں ہے کسی اور ملک میں نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا وقت آیا کہ میں محسوس کروں کہ اب میرا جانا لازمی ہے تو شاید میں چلا بھی جاؤں۔ لیکن فی الحال تو میں اس ملک میں کافی خوش ہوں۔ ہمیں پرائیویٹ پریکٹس کرنے کی بھی سہولت ہے اور ویسے بھی میرا ایمان ہے کہ رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آتا ہے۔ جو آپ کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ آپ کو ضرور ملتا ہے۔“

”عائشہ گل سے آپ کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟“

”دو ڈھائی سال قبل دوست کے گھرانے سے ملاقات ہوئی تھی میرے اور ان کے دوست مشترک ہیں۔ ان سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ یہ مجھے اچھی لگتی تھی پھر میں نے انہیں صاف طور پر اپنی پسند سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے کہا آپ بیویوں سے بات کریں اور بس پھر بات ہو گئی۔“

”آپ کو ان کی کون سی بات پسند آئی؟“
”ویکھیں۔ ہر انسان مکمل نہیں ہوتا اور ہر انسان

”نہیں بالکل نہیں۔ یہ اتنے اچھے انسان ہیں کہ میں بار بار ان سے شادی کرنا چاہوں گی اور میری خواہش ہے کہ جب میں مر جاؤں تو جنت میں بھی وہ میرے ساتھ ہوں۔“
”جن لڑکیوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے کچھ کتنا چاہو گی؟“

”سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ جو ہیں وہی رہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ شادی سے پہلے آپ کچھ اور ہیں اور شادی کے بعد آپ کچھ اور ہوں۔ جب لوگ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ شادی کے بعد تم بدل گئے ہو یا گئی ہو تو اس میں میرا خیال ہے کہ آپ بھی کہیں نہ کہیں بدل جاتے ہیں۔ اس لیے آپ شکایت کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ جو ہیں وہی رہیں۔ خوش رہنے کے لیے سب سے بڑا فارمولا یہ ہے کہ آپ خود خوش ہوں۔ آپ خوش ہوں گے تو دوسروں کو خوشی دے سکیں گے۔“

”آخری سوال کہ کمرے میں آکر میاں صاحب نے پہلا جملہ کیا بولا تھا؟“

”ہم دونوں اتنے تھکے ہوئے تھے کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ہوٹل کے کمرے میں آتے ہی میں نے کہا کہ میں چیخ کر رہی ہوں۔ تب انہوں نے کہا کہ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں تم کو پا کر کتنا خوش ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میری یہ زندگی اور مرنے کے بعد زندگی بھی تمہارے ساتھ گزرے۔“

محمد امین پراچہ

”کہے ہیں پراچہ صاحب۔“

”حمد اللہ۔“

”عائشہ نے تو آپ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کیا آپ بھی ان کی ایسی ہی تعریف کریں گے؟“
عائشہ نے تو اپنی فیلڈ چینیج کر لی۔ آپ کو خیال آیا اس قسم کا؟“

”مگر تعریف کے قابل نہ ہوتیں تو ان سے میری شادی نہ ہوئی ہوتی اور جہاں تک فیلڈ چینیج کرنے کی

بہت سپورٹ کرتے ہیں۔“

”تمہارے کام کو پسند کرتے ہیں؟“

”بہت زیادہ۔ میرے ساتھ اسکرپٹ کو ڈسکس کرتے ہیں اور میری ساسو ماں تو میرے ڈراموں کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں اور باقاعدہ بھروسہ بھی کرتی ہیں۔“

”منہ دکھائی میں کیا ملتا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟“

”ہنی مون تو ساری زندگی چلتا ہے۔ میرا ہنی مون تو ابھی تک چل رہا ہے اور ان شاء اللہ تاحیات چلتا رہے گا۔ ملک سے باہر ان کی جو کانفرنس وغیرہ ہوتی ہیں تو میں ان کے ساتھ ہی جاتی ہوں۔ منہ دکھائی میں مجھے ڈائمنڈ رنگ ملی تھی۔“

”فضول خرچ کون ہے؟ اور گھر کو بنانے سنوائے کا شوق کس کو ہے؟“

”میں بہت زیادہ فضول خرچ ہوں اور ”محمد“ مجھے کبھی روکتے بھی نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو آپ کی خواہش ہے آپ خریدیں۔ شاپنگ مل کر کرتے ہیں۔ اور گھر کو بنانے سنوارنے کا شوق ہم دونوں کو ہے۔ ان میں کوئی بری عادت نہیں ہے۔ میں جیسا شخص چاہتی تھی وہ ویسے ہی ہیں اور وہ کیسی بیوی چاہتے تھے یہ آپ ان سے پوچھیں۔“

”شروع میں محبت زیادہ ہوتی ہے یا آہستہ آہستہ پروان چڑھتی ہے؟“

”محبت آہستہ آہستہ پروان چڑھتی ہے۔ جب ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں ایک دوسرے کے مزاجوں کو سمجھتے ہیں تب محبت بڑھتی ہے۔“
”امین صاحب تمہیں کس روپ میں اچھے لگتے ہیں سادگی میں یا تھری پیس سوٹ میں یا شلوار قمیص میں؟“

”مجھے تو وہ ہر انداز میں اچھے لگتے ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی لباس میں ہوں۔ ان کا ہر روپ سارا ہے۔“
”بیویاں تو اکثر اپنے شوہر کی برائی بھی کرتی ہیں کیا تمہیں کوئی شکایت نہیں ہے ان سے؟“

ایک دوسرے کو اس کی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ میں ان سے بات چیت کرتا رہتا تھا۔ ہماری دوستی بہت اچھی تھی اور مجھے ان کی بہت سی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ ان کا بناؤ سنگھار کرنا مجھے بہت پسند تھا۔ کیونکہ انسان آنکھوں سے پہلے دیکھتا ہے اور بعد میں کچھ اور پرکھتا ہے۔ پھر ان کے بات کرنے کا طریقہ پھر ان کا دل جو کہ بہت کاندھ ہے۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ لوگوں پر لٹا دیں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتیں۔ شادی کے بعد بھی مجھے ان میں کوئی چیخ نظر نہیں آیا۔ جیسی یہ پہلی تھیں ویسی ہی اب بھی ہیں۔ ہم میاں بیوی بھی ہیں اور اچھے دوست بھی۔“

”عائشہ بتا رہی تھیں کہ آپ کو غصہ کم آتا ہے اور انہیں زیادہ کیا ایسا ہے؟ اور کیا وہ سکھ رہیں؟“
”جی بالکل ایسا ہے۔ غصے کی کافی تیز ہیں۔ اپنے کام میں جنونی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ کام جلدی ہو۔ حالانکہ ہر کام کا ایک ٹائم ہوتا ہے۔ اور سکھ رہی بہت ہیں۔ جب پہلی مرتبہ انہوں نے میرے لیے کھانا پکایا

رکھنا ہوتا ہے۔ انسان دنیا میں بہت تھوڑے ٹائم کے لیے آتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ سب سے بنا کر رکھے۔

”رسمیں انجوائے کیس؟“

”بہت زیادہ۔ عائشہ نے جو کہا، جیسا کہا، ہم نے ویسا ہی کیا، میوزک سے لے کر ہر رسم، ہم سب نے بہت انجوائے کی۔“

”جن لڑکوں کی شادیاں ابھی نہیں ہوئیں ان کے لیے کیا کہنا چاہیں گے۔“

”جن کی شادیاں نہیں ہوئی ان سے میں یہ ضرور کہوں گا کہ شادی سوچ سمجھ کر کریں اور ہر چیز کو ٹائم دیں۔ کوئی کام جلد بازی میں نہ کریں۔ اگر آپ اپنے پیروں پہ کھڑے ہیں اور تمام حقوق پورے کر سکتے ہیں تو پھر ضرور کر لیں، کیونکہ نکاح کا حکم ہے اور نیت اچھی ہو تو اللہ خود برکت دیتا ہے۔“

”آپ دونوں ایک دوسرے کو کس نام سے بلاتے ہیں اور لڑائی جھگڑا ہوتا ہے دونوں میں؟“

”ہمیں انہیں عائشہ اور یہ مجھے ”محمد“ کہتی ہیں۔ لڑائی جھگڑا عموماً اپنی وجہ سے نہیں ہوتا۔ کام کا بوجھ ہو یا کسی اور بات پر غصہ آ رہا ہو انہیں تو پھر لڑائی جھگڑا ہوتا ہے اور نہ نہیں۔“

”آپ دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت ہو یا کوئی بات جو آپ اس انٹرویو کے ذریعے کہنا چاہیں تو بتائیے۔“

”یہ زندگی اسٹارٹس کا ڈراما نہیں ہے کہ ایک بات کو آٹھ قسطوں میں پورا کیا جائے۔ آپ کے دل میں جو ہے، جیسا ہے، صاف گوئی سے بولیں۔ اچھا برا جو

بھی آپ کو لگے۔ اور میرا نہیں خیال کہ میں کوئی بات عائشہ سے کہنا چاہتا ہوں اور میں نے نہ کہی ہو۔ جو بات میرے دل میں ہوتی ہے میں کہہ دیتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے ان سے اجازت چاہی۔



تھا تو میں بہت حیران ہوا تھا۔

”کھانا باہر کھانے کا شوق ہے یا گھر پہ کھانے کو ترجیح دیتے ہیں؟ باہر جاتے ہیں تو کہاں کھانا پسند کرتے ہیں؟“

”دیکھیں! یہ زندگی پارٹنرشپ کے اصولوں پہ چلتی ہے۔ جہاں ٹائم ملے ایک دوسرے کے حقوق پورے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب میرے پاس ٹائم ہوتا ہے تو میں کوکنگ کر لیتا ہوں اور جب ان کے پاس ٹائم ہوتا ہے تو یہ کر لیتی ہیں اور جب دونوں کے پاس ٹائم نہیں ہوتا تو پھر ہم باہر کھانے کے لیے چلے جاتے ہیں اور آج کل ہم ”پورٹ گرینڈ“ بہت جا رہے ہیں۔“

”بجٹ کی عادت کس کو ہے؟ اور سسرال سے تعلقات کیسے ہیں؟“

”ہم دونوں شاہ خرچ ہیں۔ لیکن انہی چیزوں پر خرچ کرتے ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ کی فضول خرچی نہیں کرتے اور سسرال سے تعلقات کے لیے تو میں یہی کہوں گا کہ جیسے کسی بھی داماد کے اپنے سسرال کے ساتھ ہوتے ہیں۔“

”یعنی اچھے نہیں ہیں۔“

”تقصیر۔“ اگر ایسا ہوتا تو پھر مردان لاء والے لطیفے نہ ہوتے۔ رشتوں سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ کچے دھاگوں کی طرح ہوتے ہیں ان کو بہت سنہل کر

دستک دستک

شایدین رشید



عیشا اور

”کیسی ہو؟ تمہارا ”خوشبو کا گھر“ بہت ہی عمدہ سیریل تھا اور تم نے بہت عمدہ پرفارمنس دی تھی۔“
”جی بہت شکریہ۔ سب نے ہی میری پرفارمنس کو پسند کیا ہے اور مجھے خود بھی کام کر کے بہت مزا آیا۔“
”جی چھی خاصی پیاری شکل ہے۔ اور پرفارمر بھی بہت اچھی ہو پھر کیا بات ہے کہ تم مزید ڈراموں میں نظر نہیں آرہی؟“
”میرے کافی ڈرامے انڈر پروڈکشن ہیں اور ان کے آن ایر آنے میں ابھی کافی ٹائم ہے۔ میرا خیال ہے کہ دو چار مہینوں میں آن ایر ہو جائیں گے۔“
”خوشبو کا گھر“ میں تو بہت ڈری، سہمی دیکھائی دیں۔ عام زندگی میں کیسی ہو؟“

”عام زندگی میں بہت زیادہ مختلف ہوں۔ بالکل الٹ ہوں۔ بہت بولڈ ہوں اور چونکہ فیملی میں بڑی ہوں۔ اس لیے پراعتماد بھی سب سے زیادہ ہوں۔“
”ڈرامے میں بہت سادہ نظر آئیں تو کیا عام زندگی میں فیشن ایبل ہو؟“
”یہاں میں ڈرامے جیسی ہوں۔ یعنی بہت سہیل، سادہ سی۔ فیشن سے بہت زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔ میک اپ بھی ہلکا ہی کرتی ہوں اور مزاج کی بھی بہت سادہ ہوں۔“

”اس فیلڈ میں مزا آرہا ہے؟“
”جی مزا تو بہت آرہا ہے۔ مگر اس فیلڈ میں جھوٹ بہت بولنا پڑتا ہے۔ سب ہی بولتے ہیں۔ مگر میں کوشش کرتی ہوں کہ کم سے کم بولوں۔ بس ان ہی باتوں پر مجھے اکثر غصہ بھی آجاتا ہے پھر لوگ کہتے ہیں کہ تمہیں غصہ بہت آتا ہے اسے کنٹرول کرو۔“
”جی چھا! غصے کی تیز ہو؟ ڈرامے میں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے تمہیں غصہ آتا ہی نہیں ہے۔ ویسے ”خوشبو کا گھر“ جیسا شو ہر اصل زندگی میں مل گیا تو؟“
”اصل زندگی میں ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں ڈرامے کے کردار سے بالکل برعکس ہوں اور اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح کا آپ کا موڈ ہوتا ہے آپ کو پارنٹر بھی ویسا ہی ملتا ہے۔ اس لیے پارنٹر اچھا ہی ملے گا۔“

”ویسے غصہ کن باتوں پر ہے آتا؟“
”جب میڈیا کے لوگوں کے ساتھ انٹرویوز کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ ایسا

میرے ساتھ ہو بھی چکا ہے۔ یقین کریں! مجھے بہت غصہ آیا تھا۔“

”جی چھا؟ کس کے ساتھ آیا تمہارا نام؟“
”خوشبو کا گھر“ کے ڈائریکٹر کے ساتھ میرا نام آیا۔ لوگوں نے بہت غلط سلطباتیں کیں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میرے ڈائریکٹر مجھ سے کافی بڑے ہیں اور بالکل میرے بھائیوں جیسے ہیں۔ محسن مرزا صاحب سے میری بڑی اچھی کیمسٹری رہی اور ان کے ساتھ سیریل کر کے بہت مزا بھی آیا۔ اب شکر ہے کہ لوگوں کی غلط فہمی دور ہو چکی ہے۔“
”شہرت تو تمہیں ”خوشبو کا گھر“ سے ملی۔ مزید ایسے ڈرامے ہیں جو تمہاری شہرت کو اسی طرح قائم رکھیں؟“

”جی بالکل! عنقریب میرا ایک سیریل آن ایر ہونے والا ہے جس کا نام ”بھابھی بھی میری سہیلی“ ہے۔ اس میں میرا نیکیٹو رول ہے اور بہت اچھا ہے۔ ”خوشبو کا گھر“ سے بالکل مختلف ہے۔“
”ویسے کیا کرنا چاہتی ہو نیکیٹو یا پوزیٹو؟“
”ہر طرح کے رول کرنا چاہتی ہوں۔ بس اچھے اور پاور فل ہونے چاہئیں۔ نیکیٹو پوزیٹو سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ میری خواہش ہے کہ میں بھکارن اور گورنگی بھری لڑکی کا رول کروں۔ اس میں پرفارمنس کی بہت گنجائش ہے۔“

”کیا بیرون ملک گئیں؟ اور ماڈلنگ وغیرہ کی؟“
”جی۔۔۔ میں بیرون ملک جا چکی ہوں۔ بنگلہ دیش، سری لنکا اور ساؤتھ افریقہ گئی ہوں۔ ریمپ پر ماڈلنگ کی۔ آج کل کمرشلز بھی کر رہی ہوں اور ان دنوں میرے کئی کمرشلز آن ایر ہیں۔“
”عیشا! تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم اس فیلڈ میں کیسے آئیں؟“

”میں اپنی ایک دوست کے ساتھ کمرشل شوٹ دیکھنے گئی تھی۔ میری ”سٹ ماڈلنگ“ کی فیلڈ میں ہے۔ تو میں تو یوں ہی آگئی تھی مگر ہوا یہ کہ ڈائریکٹر نے مجھے

بھی ایک کمرشل کے لیے سلیکٹ کر لیا اور یوں میں حادثاتی طور پر کمرشل میں آگئی۔“

”اور پھر ڈراموں میں؟“
”بس کمرشلز کی وجہ سے ہی ڈراموں میں آگئی۔ میں نے انجم شہزاد کے ساتھ اپنا پہلا ڈراما کیا تھا۔ پھر میرا نام کے ساتھ ”سٹ کام“ کیا تھا۔ ڈرامے تو میں کافی سارے کر چکی ہوں۔ بس شہرت ”خوشبو کا گھر“ نے دی۔“

”اس فیلڈ کو مستقل بنانے کا ارادہ ہے؟“
”جی بالکل۔ فیلڈ اچھی ہے۔ مگر بہت سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا ہے اور ابھی تک تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ آگے بھی اللہ خیر کرے۔ کیونکہ اس فیلڈ میں منافقت بہت ہے۔“
”تعلیم کتنی ہے تمہاری؟ اور ہنس، بھائی کتنے ہیں؟“

”بیچلر ڈگری ہے اور کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہی ہوں۔ میرا ایک بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔“
”اس فیلڈ میں آئیں تو گھر والے خوش ہوئے؟“
”پہلے پہل اعتراض بھی ہوا احتجاج بھی ہوا۔ مگر پھر میری ضد کے آگے سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ شروع میں میری امی میرے ساتھ جاتی تھیں۔ لیکن جب سب سے اچھی ”ہیلو ہائے“ ہو گئی تو پھر میں خود ہی آنے جانے لگی۔“

”کس رائٹر کے ڈرامے میں کام کرنے کی خواہش ہے اور کبھی پرانے ڈرامے دیکھے؟“
”مجھے حسینہ معین کے ڈرامے میں کام کرنے کی بہت خواہش ہے اور اداکاروں میں میری خواہش ہے کہ میں فیصل قریشی کے ساتھ کام کروں اور میں پرانے ڈراموں میں ڈراما سیریلز ”بچھن دھواں“ اور

”شکول“ دیکھے ہیں جو بہت پسند آئے۔ ”مانوس اجنبی“ جو کہ شبیر جان کا تھا بہت پسند آیا۔“
”اور آج کل کے ڈرامے؟“

”آج کل کے ڈرامے آج کل کے حساب سے ہیں اور گزریں دور کے ڈرامے اپنے دور کے حساب سے اچھے تھے۔ آج کل لوگ ڈراموں کو زیادہ غور سے دیکھتے ہیں، تھوڑی سی بھی غلطی ہو جائے تو فوراً بتاتے ہیں کہ ایسا ہوا تھا۔“

”ایم بی اے کے بعد کیا ارادے ہیں؟“
”ایم بی اے کرنے کے بعد سائیڈ بزنس کرنے کا ارادہ ہے۔ مجھے فیشن ڈیزائننگ سے بہت دلچسپی ہے تو ہو سکتا ہے کہ میں فیشن کی فیلڈ میں آ جاؤں۔“
”اور جناب! پیداکب اور کہاں ہوئیں اور فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟“

”میں 13 جون کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔ اگرہ اور لکھنؤ سے ہمارا تعلق ہے۔ میرے والد ”کے ای ایس سی“ میں ہیں اور امی ہاؤس وائف ہیں۔“

”اے ہو۔۔۔ والد ”کے ای ایس سی“ میں ہیں تو بہت باتیں سنتے ہوں گے؟“



”جی! بہت باتیں سنتے ہیں۔ ہم سے بھی اور لوگوں سے بھی۔ مگر وہ کیا کر سکتے ہیں وہ تو ایسا لڑائی ہیں۔ ان کا تو کوئی قصور ہی نہیں ہے۔ مگر کیا کریں لوگ سناتے ہیں تو سنتے ہیں۔“

عائزہ خان

”کیسی ہو عائزہ! پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“
”جی! اٹھیک ہوں۔ اور پڑھائی بھی اٹھیک جارہی ہے۔“

”آج کل تو ہر دوسرے ڈرامے میں تم ہوتی ہو؟“
”ڈرامے مختلف اوقات میں ریکارڈ ہوتے ہیں مگر جب ایک ساتھ سب ڈرامے آن ایر ہو جاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں ہی ہوں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔“

”کیوں ایسا نہیں ہے؟“
”میں ہر کردار قبول نہیں کرتی۔ بہت سوچ سمجھ کر

آفر قبول کرتی ہوں۔ اگر تمام آفرز قبول کرنے لگوں تو پھر شاید گھر جانے کی بھی فرصت نہ ملے۔ اس لیے وہ ہی آفر لیتی ہوں جس میں کام کی گنجائش ہوتی ہے۔“
”کردار کس قسم کے پسند ہیں۔ بولڈ یا نارمل؟“
”مجھے اچھے اور پاور فل کردار پسند ہیں۔ مگر بولڈ نہیں۔ شاید میں ابھی اتنی بولڈ نہیں ہوتی کہ بولڈ کردار کر سکوں۔ اس لیے جب مجھے اس قسم کے کردار ملتے ہیں تو میں شکریے کے ساتھ انکار کر دیتی ہوں۔ طوائف کا کردار ہو یا بہت ہی زیادہ مارڈرن کہ جس میں لباس بھی ٹھیک نہ ہو میں نہیں لیتی۔“

”اور نیگیٹو؟“

”ہاں! نیگیٹو تو ضرور کروں گی۔ اسے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نیگیٹو کردار کرنے میں تو کافی گنجائش ہوتی ہے اور مزا بھی آتا ہے۔“

”فیلڈ میں اتفاقاً ”آمیں یا سوچ سمجھ کر؟“
”ماقاعدہ منصوبہ بندی کر کے یا سوچ سمجھ کر تو نہیں

آئی۔ البتہ اداکاری کا شوق ضرور تھا، سو اس فیلڈ میں آئی۔ قدرت کو میری ترقی منظور تھی کہ مجھے کامیابی پہ کامیابی ملتی چلی جارہی ہے۔“

”شوہر میں سب سے دوستی ہے یا کچھ ہی لوگوں سے؟ کام کس کا پسند ہے اپنے ہم عصر میں۔“

”ہیلو ہائے تو سب سے ہے، لیکن دوستی سب سے نہیں ہے اور اپنے طور پر سب ہی بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ سینئرز سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور اپنے ہم عصروں میں ٹائٹلنگ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایمین بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ نیلم منیر بہت اچھی ہے۔ مجھے تو سب ہی اچھے لگتے ہیں۔“

”شوہر کو مستقل اپنانا ہے یا شادی کے بعد چھوڑ دینا ہے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتی۔ بہت موڈی ہوں۔ دل بھر گیا یا پڑھائی متاثر ہوئی تو چھوڑ بھی سکتی ہوں اور شادی کا فیصلہ ابھی نہیں کیا تو اس کے بعد فیلڈ چھوڑنے کا فیصلہ تو بہت دور کی بات ہے۔“

”تم اس فیلڈ میں کسی پلاننگ کے تحت نہیں آئیں مگر کیا پلاننگ یہ یقین رکھتی ہو؟“

”سچ پوچھیں تو میں تو پلاننگ پہ یقین ہی نہیں رکھتی۔ اس فیلڈ میں آنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر راستے بنتے چلے گئے اور راستے تو قدر خود بناتی ہے اور ہم اس پر چلتے چلے جاتے ہیں۔“

”مستقبل میں جاب کرنے کا ارادہ ہے؟“

”ہاں! بھی جو کام کر رہی ہوں، وہ بھی ایک طرح سے جاب ہی ہے۔ صبح اٹھنا، شوٹ پر جانا، پھر رات کو گھر آ جانا۔ یہ سب جاب ہی تو ہے اور جہاں تک پڑھائی کے بعد جاب کی بات ہے تو مارکیٹنگ میرا مضمون ہے۔ ان شاء اللہ مارکیٹنگ میں جاب کروں گی۔“

”اداکاری کے علاوہ کیا مشاغل ہیں؟“
”میں ایک گھریلو لڑکی ہوں۔ اس لیے میرے مشاغل بھی گھریلو ہی ہیں۔ گھر کو سجانا۔ فرنیچر کو بدلنا یا ان کی سیٹنگ تبدیل کرنا۔ گھر کی سجاوٹ کے لیے

اچھی اچھی چیزیں لے کر آنا میرے مشاغل میں شامل ہیں۔ جو بڑے فخر سے کہتی ہیں کہ ”ہمیں تو ایڈاپٹا بلانا چھی نہیں آتا۔“ تو میں تو ویسی اور بدیسی سب کھانے پکالتی ہوں اور سیکھتی بھی رہتی ہوں۔“

”گھر کے کھانے زیادہ پسند ہیں یا باہر کے اور کھانے کی شوقین ہو؟“

”مجھے گھر کے کھانے زیادہ پسند ہیں۔ باہر کھانے پینے بہت کم جاتی ہوں اور میں کھانے کی بے حد شوقین ہوں۔ ہر اچھا کھانا میری کمزوری ہے۔“

”موسیقی سے لگاؤ ہے؟“
”بہت زیادہ۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتی کہ کون سا میوزک پسند ہے۔ اس لیے کہ موسیقی کے لیے پسند مخصوص نہیں بلکہ موڈ پر منحصر ہے۔ کافی لوگ بہت اچھا گارہے ہیں، لیکن مجھے سونو نغم اور حدیقہ کیانی بہت پسند ہیں۔“

”شہرت پانے کے بعد کیا تبدیلی آئی؟“
”کوئی خاص نہیں، سوائے اس کے میں بہت مصروف ہو گئی ہوں۔ باقی میں عام لوگوں جیسی ہوں اور تبدیلی ہوگی بھی کیا عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہی تو ہوں۔“

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
آسیہ سلیم قریشی کے 3 دکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
دو خطی سی دیوانی سی	500/- روپے
آرزو گھر آئی	450/- روپے
تھوڑی دور سا چلو	400/- روپے

ناول نگار کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ 45/- روپے

نگار کا پتہ:
کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی صحت، عافیت، سلامتی اور
خوشیوں کے لیے دعا میں۔

رب کریم آپ کو ہم کو ہمارے پیارے وطن کو اپنے
حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

اب آتے ہیں آپ کے خطوں کی طرف۔ پہلا خط
تمثیلہ اصغر نے لادیاں ضلع گجرات سے لکھا ہے، لکھتی
ہیں۔

پہلے اگر کبھی ڈائجسٹ میں شمولیت کی تو گجرات کے نام
سے ہی کی ہے۔ اس دفعہ میں آپ کو اپنے گاؤں کے بارے
میں بتاتی ہوں۔ میرے گاؤں سے ہر وہ بندہ واقف ہے جو
”مہجراجہ عزیز بھٹی شہید“ کے نام سے واقف ہے۔ جی
ہاں میرے گاؤں کا نام ”گادیاں“ ہے۔ مہجراجہ عزیز بھٹی
کا گاؤں۔ اب جناب میں شعاع کی طرف آتی ہوں۔ نمبر
احمد کا ناول ”جنت کے پتے“ بھی مصحف، قراقرم کا تاج
محل کی طرح یادگار ناول ہو گا۔ ستارہ شام اور دیوار شب
بھی زبردست جا رہا ہے۔ شہزادہ عباس خلیجی کا ناول
”رنگ، خواب اور ریشم“ اس کا ہر لفظ ریشم کی طرح تھا۔
زبردست شہزادی جی۔ ”میری سوچ کے محور“ میری ایک
چھوٹی سی کاوش، کیا اس کو شعاع میں جگہ ملے گی ضرور
بتائیے گا۔

ج تمثیلہ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آپ کا افسانہ مل گیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ قابل
اشاعت نہیں ہے۔

ڈی جی خان سے ایس عظمیٰ نے لکھا ہے

دس سال سے شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ بہت بار
کوشش کی مگر سستی آڑے آگئی۔ اب خط لکھنے کی وجہ
صرف اور صرف آپ سے ایک فرمائش اور وہ بھی آپ
نے ارجمند پوری کر لی ہے، میں بہت پیار سے آپ سے
ریکوسٹ کر رہی ہوں۔ آپلی پلیز پلیز ایف ایم 101 کے
پروگرام ”گڈ مارنگ“ ملتان کے R.T عامر عزیز ملک کا
انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں اور نوک گلوکار شہناز اللہ خاں
کھڑی کا انٹرویو شائع کریں۔

ج پیاری عظمیٰ! آپ کی فرمائش شاہن رشید تک پہنچا
رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

وئے تو شعاع کی دس سالہ وابستگی کی پسندیدگی کا ثبوت
ہے، لیکن اچھا ہوتا ہے کہ شعاع کی تحریروں کے بارے
میں بھی اپنی رائے کا اظہار کرتیں۔ اب آئندہ دس سال
کے لیے خاموشی نہیں اختیار کیجئے گا۔

اسماء خان نے کیمٹری کراچی سے لکھا ہے

اگست کا شمار ہاتھ آتے ہی بے تابی سے کھولا اور سب
سے پہلے ”جنت کے پتے“ پڑھا۔ واہ جی کیا شان دار
استوری ہے۔ نمبر سے پسندیدگی مزید بڑھ گئی ہے۔ یہ جان

کر کے ان میں اور مجھ میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے
شرعی پردہ! ”ستارہ شام اور دیوار شب“ بہت سلور فائر سے
آگے بڑھ رہا ہے۔ فائزہ افتخار کا ”سنڈریلا“ بھی بہت شان
دار جا رہا ہے۔ مجھے تو زین پر سخت غصہ آیا۔ فائزہ جی کا اپنا
ایک اچھوتا انداز تحریر ہے۔ مگر ایک بات جو میں نے نوٹ
کی ہے کہ ان کے ناول کے ہیرو ہمیشہ شرمیلے اور بیرونی کافی
بولڈ ہوتی ہے۔

ج اسماء شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمبر احمد اور
دوسری مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے
پہنچائی جا رہی ہے۔ آپ کا افسانہ موصول ہو گیا ہے۔ ابھی
پڑھا نہیں گیا۔

سارہ عبید اور عمارہ عبید نے ڈنگ شہر سے لکھا ہے

ٹائٹل میں آج کل کے فیشن کے مطابق ڈریس دکھایا
کریں۔ تاکہ ہم نئی نئی ڈیزائننگ دیکھ کر اپنے کپڑوں کی
ڈیزائننگ کر سکیں۔ اب آتے ہیں شمارے کی طرف!
ہمیشہ کی طرح زبردست۔ شعاع اور خواتین تمام مسلم
عورتوں کے لیے بھلائی کا ذریعہ ہے۔ ”جنت کے پتے“ اتنا
منفرد ٹائپ اور اتنا ہی خوب صورتی سے لکھا جانے والا ناول
جو تاحیات ہمارے دلوں میں زندہ رہے گا۔ اس دفعہ حلیمہ
آئی کی باتیں دل کو چھو گئیں، لیکن ایک بات کہوں گی جو
کچھ حیا کے ساتھ ہوتا رہا ہے، کیا حقیقی زندگی میں کسی لڑکی
کے ساتھ اتنا کچھ ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو ویری
امیزنگ؟ فائزہ افتخار ایک خوب صورت اور بے مثال تحریر
کے ساتھ۔ پڑھ کر بہت مزا آیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ واقعی
سنڈریلا ہو۔ صوفیہ بشیر کا مکمل ناول بہت اچھا لگا، جبکہ
شہزادی عباس کا ناول وہی عام سی پرانی استوری۔ ہیروئن کی
حد سے زیادہ سادگی، باقی ہر چیز بہت تھی۔ میری نالی اماں
جو کہ اپنے زمانے کی شاعرہ تھیں، انہوں نے بہت سی
نظمیں لکھیں، لیکن صرف خود تک محدود رکھیں۔ اس
دفعہ میں ان کی ایک نظم بھیج رہی ہوں، ان کی عمر اب
80 سال ہے۔

ج سارہ اور عمارہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ شہزادی
عباس کا ناول کا موضوع آپ کو عام سا لگا، لیکن اس ناول کی
اصل خوب صورتی اس کی تحریر کی دلکشی تھی۔ انداز بیان
ہی کسی تحریر کو دوسری تحریروں سے منفرد کرتا ہے۔ شعاع

کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر
اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

فریحہ شبیر نے شاہنکدر سے لکھا ہے

اس دفعہ شعاع خلاف معمول 30 کو مل گیا۔
ٹائٹل بس اچھا لگا۔ مگر مندی اور دھیمی سی مسکان دل کو
چھو گئی۔ ساگرہ نمبر ساگرہ نمبر ہی تھا۔ ہمیشہ کی طرح بہت
اچھا۔ دستک میں اسماء، امبر اور نمبر سے مل کر اچھا لگا اور
سروے کی تو کیا ہی بات تھی۔

”جنت کے پتے“ نمبر احمد اتنا زبردست ناول۔ ہر قسط
میں نمبر کچھ بتاتی، کچھ سمجھاتی نظر آتی ہیں۔ نمبر یو آر سو
گریٹ یار اور ہاں یہ استوری ختم ہوتے ہی آپ ”رہو“
میں تشریف لا رہی ہیں۔ سمجھیں آپ! ”ایک نئی
سنڈریلا“ فائزہ افتخار بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ”دیوار
شب“ اور ”ستارہ شام“ بھی اچھا رہا۔ دونوں میں کچھ غلط
ہونے کا ڈر ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔
”اداس چاند“ صوفیہ بشیر بہت زبردست ناول۔ اتنا اچھا
لکھنے پر ڈھیروں مبارک باد، اگلی تحریر کا انتظار رہے گا۔
”رنگ، خواب اور ریشم“ شہزادی جی اتنا زبردست لکھنے پر
مبارکباد اور مسکراہٹ (میری طرف سے) قبول کریں۔ یہ
تحریر مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ خصوصاً ”زہرہ کا لکھا خط اور اس
میں بیان اپنی محبت اور ریشم کے گھر کا پیارے پیارے
رنگوں سے بچنا۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین تحریر تھی۔ مکمل
ناول دونوں ہی اچھے تھے۔ اب بات ہو جائے افسانوں کی تو
سارے ہی اچھے تھے۔ مگر بہت ربا ”تبدیلی“ حقیقت
سی حقیقت ہی ہوتی ہے۔ ”اتنے مانوس“ نعیمہ نے بھی
اچھا لکھا۔ ”فیصلہ“ ایہ ہانے بھی اچھا لکھا۔ ناولٹ ”چاند
رات“ نازیہ جمیل۔ ہلکی پھلکی اور طنز و مزاح سے بھرپور یہ
تحریر مزادے گی۔ آپلی اگر میں ”شاعری سچ بولتی ہے“ کے
لیے اپنا انتخاب بھیجوں تو شائع ہو گا۔

ج پیاری فریحہ! ہمیں افسوس ہے کہ سروے میں آپ
شامل نہ ہو سکیں۔ شاعری سچ بولتی ہے کے سلسلے میں ضرور
شرکت کریں۔ مصنفین کے نام خط آپ ہمارے ایڈریس
پر بھیجوا دیں۔ شعاع کی پسندیدگی اور تفصیلی تبصرے کے
لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے
ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ انتخاب بھجوانے کے لیے بوجھے

کی ضرورت نہیں، ضرور شائع ہوگا۔ بس یہ خیال رکھیں کہ آپ کی انتخاب کردہ شاعری پہلے شائع نہ ہو چکی ہو۔

انتہا حفیظ نے حویلی لکھا، نہ پال پور سے لکھا ہے میرے اس دفعہ خط لکھنے کی وجہ سرورق ہے، جو مجھے بہت ہی پیارا لگا۔ نمرو احمد کی تحریر ”جنت کے پتے“ بہت ہی زبردست ہے۔ جو جلدی بھولنے والی نہیں۔ عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے سلسلے وار ناول بھی اچھے جارہے ہیں۔ فائزہ افتخار بہترین رائٹر ہیں۔ وہ جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ ”باتوں سے خوشبو آئے“ اور ”تاریخ کے جھوکوں سے“ یہ دونوں سلسلے میرے پسندیدہ ہیں۔ یہ ڈائجسٹ پہلے میرے والد صاحب پڑھتے تھے اور پلیز میری ایک فرمائش ہے شاید آفریدی کا انٹرویو شائع کریں۔ وہ بھی پورے دو ڈھائی صفحات کا۔

ج پیاری انتہا شاعر کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

مردان سے موش شریک محفل ہیں، لکھتی ہیں۔

اس ماہ کے شمارے کا ٹائٹل نہایت عمدہ اور ریفریشننگ تھا۔ فائزہ افتخار میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کا نیا ناولٹ ”ایک نئی سنڈریلا“ بہت ہی اچھا ناولٹ ہے۔ اس میں میٹھا اور مار کا کردار مجھے بہت پسند ہے اور مکمل ناول مجھے بالکل بھی پسند نہیں ناول شروع ہوتے ہی ہم کو پتا لگ جاتا ہے کہ اس لڑکی کی شادی اس لڑکے سے ہوگی۔ آپنی آپ سے ہمارے بہت شکوے ہیں۔ ایک تو آپ ہمارے خط شائع نہیں کرتیں اور ہم نے آپ کو پیسے بھجوائے تھے ڈائجسٹ منگوانے کے لیے میں یہ ڈائجسٹ کبھی نہیں خریدتی، اگر اس میں ”ستارہ شام“ اور ”جنت کے پتے“ نہ ہوتے۔ رخسانہ نگار کو کہیں سے ڈھونڈ لائیں۔ آپنی معذرت چاہتی ہوں۔ آپ سے اتنے گلے شکوے کیے۔ یہ بھی لوگ ہر کسی سے نہیں کرتے میں نے بھی آپ کو اپنا جان کر گلے شکوے کیے کہ ہم پٹھانوں کے ساتھ ہر جگہ امتیازی سلوک ہو رہا ہے۔

ج پیاری موش! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے پیسے بھجوائے اور آپ کو ڈائجسٹ نہ مل سکے ہو سکتا ہے آپ نے اپنا صحیح ایڈریس نہ لکھا جس کی بنا پر آپ کو برچے

نہ مل سکے۔ اس خط میں بھی آپ نے اپنا ایڈریس نہیں لکھا۔ نہ ہی یہ لکھا ہے آپ کو کون سے مہینے کے شمارے چاہئیں۔ آپ اس نمبر پر فون کر کے تفصیل بتادیں پرچے آپ کو بھجوا دیے جائیں گے۔

0345-2852056

موش! ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کی نظر میں پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی اور مہاجر کے درمیان کوئی تفریق ہو، لیکن ہماری نظر میں سب انسان برابر اور ہم ان میں کوئی تفریق نہیں کرتے، بلکہ جو لوگ تفریق کرتے ہیں ہم انہیں شدید ناپسند کرتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں تو ایسی کسی تفریق کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اسلام رنگ، نسل ذات بات، زبان، گورے، کالے، عجمی اور عربی کی تفریق مٹانے کے لیے آیا ہے۔

شاعر کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

سعدیہ ہارون نے کراچی سے لکھا ہے

اگست کا شمارہ جلد ہی مل گیا اور جلد ہی ختم بھی کر ڈالا اور فوراً ”نئی خط لکھنے بھی بیٹھ گئی اور اس کا سب سے بڑا محرک نمرو احمد کے ”جنت کے پتے“ ہے۔ کہانی جتنی تیزی سے موڑ لے رہی ہے، یقین کریں کہ میں اپنے آپ کو اس کہانی کا حصہ محسوس کرتے ہوئے ہر تکلیف اور خوشی کو خود محسوس کر رہی ہوں۔ ان سب باتوں کے لیے نمرو احمد بے حد مبارکباد کی مستحق ہیں اور خاص کر احادیث اور قرآن کا حوالہ بہت ہی زبردست ہے۔ اب دیگر مستقل سلسلوں کی اگر بات کروں تو ”ستارہ شام“ کی کہانی تو ایک جگہ ہی رکی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی کہانی میں کچھ تیزی لائیے آمنہ جی! یہی حال دوسرے مستقل سلسلے ”دیوار شب“ کے ساتھ چل رہا ہے۔ جو یا معاذ کا سلسلہ ہو یا ٹیلی کی ”کہانی“ آگے بڑھتی ہوئی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ ”صوفیہ بشیر کا“ ”اداس چاند“ اچھا تھا، لیکن کہانی میں

کہیں کہیں جھول سا محسوس ہوا اور ایسا ہی رنگ خواب اور ریشم میں بھی محسوس ہوا۔ ابتاج کا ایک دم سے غلط فہمی کا شکار ہونا اور پھر یک دم دور ہونا، کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔ البتہ نازیہ جمال کا ”چاند مبارک“ ایک لکا پھلکا اور سادہ سا ناول تھا جو اچھا لگا۔ مصاح خادم کی تبدیلی سے کچھ

اختلاف محسوس ہوا کیونکہ آج کل ایسا کم ہوتا ہے۔ ج پیاری سعدیہ شاعر کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف و تحقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

حنّا صدف اور مقدس نے لکھنؤ وال کلاں سے لکھا ہے

ٹائٹل اچھا تھا فائزہ افتخاری یو آر دا بیسٹ رائٹر، لیکن پلیز میٹھا کے ساتھ کچھ برامت ہونے دینا۔ سالگرہ نمبر اچھا تھا۔ ناول اور باقی افسانے سب ٹھیک تھے۔ میں نے پوچھنا تھا کہ ایک کہانی بھی جس کا نام نہیں یاد اور خواتین میں بھی یا شاعر میں یاد نہیں اس کہانی کے کردار میں جو یا، ملکہ، نادر تھے۔ ثریا اور ملکہ کزنز تھیں، ملکہ زیادہ تر ثریا کے گھر میں رہتی، مگر جب ثریا کے ابو کو جیل ہو گئی تو وہ لوگ ملکہ کے گھر ٹھہرنے گئے۔ ملکہ بالکل ثریا کے برعکس تھی اس سے سارے گھر کے کام کرواتی۔ پلیز ضرور بتائیے گا کہ یہ کس شمارے میں تھی۔

پیاری حنا! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے سات خط شامل نہ ہو سکے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے خط لکھے ہوں اور پوسٹ کرنا بھول گئی ہوں کیونکہ ہمیں وہ خطوط موصول نہیں ہوئے۔

جس کہانی کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے۔ ہمیں یاد نہیں ہے۔ شاید قارئین میں سے کسی کو یاد ہو تو ہمیں لکھ دیں۔

شہناز راجپوت نے گوجرانوالہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اگست کا شمارہ کتنا زبردست تھا۔ یہ کوئی ہم سے پوچھے۔ ٹائٹل خوش کر گیا۔ ماڈل کی معصومیت بھری مسکان نے تو مانوئل ہی لوٹ لیا۔ (سارا نہیں آدھا) آدھا دل لوٹنے کے لیے نمرو احمد جو موجود تھیں۔ ”جنت کے پتے“ نمرو احمد کا ایک اور شاہکار۔ نمرو احمد کی کہانی ہو اور ہم کوئی اندازہ لگائیں، نہیں جی ہماری اتنی محال کہاں؟ غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ سنڈریلا کی تیسری قسط بھی اچھی تھی۔ مگر چوتھی قسط جو سب قسطوں سے اچھی ہوگی۔ ارے اس میں ہماری پیاری سی میٹھا اور مار کی ملاقات جو ہوگی۔ ویلڈن فائزہ جی، چاند رات نازیہ جمال کا ناولٹ بھی ٹھیک تھا۔ جبکہ مکمل ناولوں میں رنگ، خواب، ریشم

شہنازی عباس خلجی کا مکمل ناول اچھا لگا۔ اداس چاند بھی ٹھیک تھا۔ ”دیوار شب“ تو شاعر کی جان ہے۔ ”ستارہ شام“ بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ افسانے بھی سارے دلچسپ تھے۔ باقی سارا شمارہ زبردست تھا۔

ج شہناز! تفصیلی تبصرے اور شاعر کی پسندیدگی کے لیے یہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

اقراء عروج فتح پور لیتے سے شریک محفل ہیں، لکھتی ہیں

اس ماہ کا شاعر پڑھا، بہت اچھا لگا۔ ”دیوار شب“ کا کب اینڈ ہوگا۔ سب رائٹرز اچھا بلکہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مگر کنیز نبوی کی تو بات ہی اور ہے۔ کنیز نبوی سب سے الگ اور منفرد لکھتی ہیں۔ اتنی خوب صورتی سے کہ بندہ حیران رہ جائے۔ میرا موسٹ فیورٹ ناول آتش عشق ہے، جس کی تعریف میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے اتنی توجہ اور محبت سے کبھی بار بار کوئی ناول پڑھا ہو، جیسے آتش عشق پڑھا۔ نمرو احمد بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ فائزہ افتخار نے تو کمال ہی کر دیا۔ ”اک نئی سنڈریلا“ میٹھا نام بہت پیارا ہے۔ اگر ہو سکے تو اس نام کا مطلب ضرور بتائیں۔ اب تو میٹھا کو ایک پرائل گیا۔ ”اداس چاند“ بھی اچھی تھیں۔ طیب کتنا معصوم تھا ساری کہانی میں اور خاص کر اینڈ میں۔ نمرو اقرء کو ضرور ضرور پڑھتی ہوں کہ انہوں نے اس ماہ باتوں سے خوشبو آئے میں کیا لکھا ہے۔ میرے ماموں جیل جو فوج میں ہیں۔ وہ مجھے سارے رسالے پارسل کرتے ہیں۔ پکوان بند کر دیں اور آئینہ خانے میں بھی۔ یہ خبریں تو ٹی وی پر بھی آتی ہیں۔

ج اقرء! شاعر کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ پکوان آپ نے بھی نہیں بنائے اس لیے آپ اس سلسلے کو بند کرنے کے لیے کہہ رہی ہیں، جبکہ ہماری بیشتر قارئین کو یہ سلسلہ بہت پسند ہے۔ آئینہ خانے کا سلسلہ شاعر کا مقبول سلسلہ ہے۔ اور معذرت کے ساتھ شاعر کا سلسلہ ٹی وی کی خبروں سے بہت مختلف ہے پھر بھی اگر آپ کی تجویز کی دیگر قارئین نے بھی تائید کی تو غور کریں

سائہ منیر احمد اور مریم منیر مشرق پور شریف سے
شریک محفل ہیں لکھا ہے

فرست پر نظر مار کر پہلی شعاع پڑھی اور وہ ناول نکالا
جس کا اب ایک بل کا انتظار بھی صدیوں پر محیط ہے۔ اف
نمرہ جی۔ آپ کیا ہیں، کوئی جادوگرنی یا پھر سچ کی پری؟
آپ کے سحر سے کوئی نکل کیوں نہیں پاتا آخر۔ فائزہ افتخار
کیا عمدہ تحریر لائی ہیں۔ ہم پھر سے بچپن میں لوٹ جاتے
ہیں۔ (ویسے ابھی بڑے ہوئے ہیں نہیں مابودلت بچوں میں
ہی شمار ہوتے ہیں۔) رومان کی انٹری مجھے بہت پسند آئی اور
میشا اور اس کے فیری مین رومان کی گپ شب مزادے گئی،
اکلی قسط کا انتظار ہے۔ ”ستارہ شام“ بس سو سو چل رہا
ہے۔ پتا نہیں کیوں پُر پُرسی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ”دیوار
شب“ بہت اچھا چل رہا تھا۔ پر اس قسط کی آخری کچھ پیرا
ایچھے نہیں لگے۔ کہتی کو نیل کے سامنے گرانے کی کیا
ضرورت تھی اور عالیہ جی یا معاذ اور جویا پر تھوڑا رحم کریں
اور اب کمال صاحب اور خیام کی بھی ملاقات کروادیں۔
”خواب اور ریشم“ بھی ایک اچھی کاوش تھی جو ہر محبت
کرنے والے دل کو اچھی ہی لگے گی۔ نمرہ جی کے ناول کے
علاوہ اس بار جو ایوارڈ وننگ ناول رہا۔ وہ مکمل ناول ”اداس
چاند“ تھا۔ اف صوفیہ صاحبہ نے اتنا پیارا ناول لکھا کہ بس
بیچ میں کچھ پر تنگ مس نیک تھی۔ مگر کاوش بہت اڑ پیکٹو
تھی۔

”پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی
پیاری باتیں“ ہمیشہ کی طرح پیاری لگیں۔ (عمل کی
کو شش جاری ہے) ”لمحے جب تصویر ہوتے ہیں“ پڑھ کر
مزا آیا اور انٹرویوز بھی سب سے اچھے تھے۔ اور آل
اگست کا شمار سپر ہٹ رہا۔

ج سائہ اور مریم شعاع آپ کو پسند آیا۔ تہ دل سے
شکریہ۔

رضوانہ کوثر نے راہوالی کینٹ گوجرانوالہ سے لکھا
ہے۔

ساگرہ کی بہت بہت مبارک باد۔ اوہر مینے کا آغاز ہوتا
ہے، اوہر شعاع کے لیے بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔
اس دفعہ کا شمار بھی بہت زبردست لگا۔ میں بہت سالوں
سے شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ مگر نمرہ احمد نے خط

لکھنے پر مجبور کر دیا۔ باقی افسانے، ناولز اور ناولٹ بہت اچھے
لگے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں بہت
اچھی تھیں۔

ج پیاری رضوانہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔
شاہد آفریدی کے انٹرویوز کی فرائش نوٹ کر لی ہے، جلد
پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

نورین شفیع نے چاہ بل غوالا کھوہ ملتان سے شرکت کی
ہے

شعاع بہت ہی خوب صورت اور معیاری رسالہ ہے۔
آئی جی میں نے شعاع میں ایک کہانی رقص جنوں پڑھی
تھی وہ کہانی آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ میں نے یہ
پوچھا ہے کہ بشری احمد اور بشری سعید ایک ہی ہیں۔
شعاع میں میری موسٹ فیورٹ کہانی نمرہ احمد کی ”جنت
کے پتے“ ہے۔ فروری کے شمارے میں سروسوں کے پھول
شائع ہوئی تھی۔ یہ کہانی مجھے بہت پسند آئی۔ ایسا لگا جیسے یہ
کہانی ہمارے اوپر ہی لکھی ہو۔ اب کچھ تعارف اپنے
بارے میں۔ ملتان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی
ہوں جس میں سولہ سترہ گھر ہیں۔ ہر طرف سبز ہی سبز
درمیان میں ہمارے گھر۔ اوہر تقریباً ہر چیز کی سہولت
ہے۔ سڑکوں جتنی چوڑی اور پکی گلیاں، بجلی اور گیس آگئی
ہے۔ یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ عورتیں
مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ بس تعلیم کا تھوڑا
مسئلہ ہے۔ اسکول ہے، مگر تھوڑے سے فاصلے پر۔ تقریباً
سب ہی لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کے
پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ میں گاؤں کی سادہ سی پیاری
سی لڑکی ہوں جسے کوئی بھی کام کرنے میں شرم محسوس
نہیں ہوتی۔ جسے کبھی خواہشیں پریشان نہیں کرتیں اور
ایچھے اور خوب صورت گھروں میں رہنا، اچھا کھانا اور پہننا
میری ترجیح نہیں ہے، جو ہر حال میں مطمئن اور پرسکون
رہتی ہے۔ جسے اپنا ایک کمرے کا چھوٹا سا کچا گھر بے حد
پیارا لگتا ہے اور بننا سنورنا کبھی اچھا نہیں لگتا اور جو ہر کسی
کے درد کو اپنا دکھ سمجھتی ہے۔ لوگوں کی خوشی میں خوش
رہتی ہے اور اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، میں بھی
کھیتوں میں کام کرتی ہوں بس میرے لیے اتنا کافی ہے، میں
اپنے اللہ سے محبت کرتی ہوں اور میرا مالک مجھ سے محبت

کرتا ہے اور ہاں پلیز نمرہ بخاری سے کہیں، تبیلی اور جواد
کے اوپر ایک اور خوب صورت کہانی لکھیں۔
ج پیاری نورین! آپ کے گاؤں اور آپ کے اپنے
بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ ہمارے ملک کی دیکھی
آبادی کا بیشتر حصہ محنتی، جھانٹش اور قانع ہے۔ سادہ زندگی
گزارنے والے یہ لوگ اپنے وطن سے اپنے مذہب سے
محبت کرتے ہیں۔ ان کی محنت کی بدولت ہی آج ہم اناج
میں خود کفیل ہیں۔ رقص جنوں شعاع میں نہیں خواتین
ڈائجسٹ میں شائع ہوئی اور یہ کہانی بشری سعید نے لکھی
تھی۔ بشری سعید اور بشری احمد ایک نہیں ہیں۔ دونوں میں
کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔ بشری سعید کا تعلق اوکاڑہ سے
اور بشری احمد کا تعلق بہاول پور سے ہے۔

شعاع میں خط لکھنے کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط
لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

زوباریہ خالد لاہور سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں

ٹائٹل زبردست تھا اور مہندی کا ڈیزائن بھی۔ فائزہ
افتخار کا ”اک نئی سنڈریلا“ میرا پسندیدہ ناولٹ بن چکا ہے۔
اس میں میشا اور مار کے کردار مجھے بہت پسند ہیں۔ جس
طرح۔ رومان نے میشا کو پارٹی میں پہنچایا بہت اچھا لگا۔
صوفیہ بشیر کے ناول ”اداس چاند“ میں دجانے عثمان نام
بہت اچھا اور مختلف لگا۔ اشعار میں ثمرانہ تنویر کا شعر پڑھ کر
منہ سے بے ساختہ واہ نکلا۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین
تھا۔

ج زوباریہ! شعاع آپ کو اچھا لگا۔ یہ جان کر بہت خوشی
ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی
رہیں گی۔

سلمیٰ قمر نے چیچہ وطنی سے لکھا ہے

میں پچھلے پندرہ سال سے خواتین اور شعاع کی مستقل
قاری ہوں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب میں نے شعور کی
پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو یہ ڈائجسٹ میرے ہم قدم تھے۔
زندگی کے بہت سے کٹھن معاملات میں رہنمائی اور حوصلہ
ملا۔ زندگی کو سمجھنے اور برتنے کا سلیقہ ملا۔ یہ میرا مطالعہ ہی
ہے جو مجھے لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ بے
شک یہ شعاع اور خواتین کی مصنفات ہی کا کمال ہے کہ
انہوں نے ایسے لازوال کردار تخلیق کیے ہیں۔ ارد گرد پھیلے

ہوئے مسائل میرے حساس دل پر بھی دستک دیتے ہیں۔
کئی بار دل چاہا کہ ذہن میں کلبلا تے ہوئے ان منتشر
خیالات کو کہانی کے قالب میں ڈھال دوں۔ مگر اتنی کہنے
مشق مصنفات کے سامنے احساس کتری کا شکار ہو جاتی
ہوں۔ لیکن اب بالآخر میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ عمل
بھی ضروری ہے، تکمیل تمنا کے لیے۔ ورنہ رہنمائی
خیالات سے کیا ہوتا ہے۔

ج پیاری سلمیٰ! آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ
لکھ سکتی ہیں۔ جو افسانے لکھ رکھے ہیں وہ بھجوادیں۔
نئے لکھنے والوں کی صلاحیتیں سامنے لانے میں ادارہ شعاع
کا بہت بڑا کردار ہے۔ آپ کی کہانیاں قابل اشاعت
ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

رومینہ جعفر خان نے کھلائیٹ ٹاؤن شپ سے لکھا ہے
شعاع، کرن اور خواتین سے وابستگی اتنی پرانی ہے کہ خود
ٹھیک سے مجھے بھی یاد نہیں، شاید اس وقت میں ساتویں
کلاس میں پڑھتی تھی۔ یہ 99ء کی بات ہے اور
گزرتے وقت نے اس جنون کو اور ہوا دی ہے۔ امی بابا
نے بھی کبھی روک ٹوک نہیں کی، بلکہ بابا کہتے ہیں، بیٹا ہر
کتاب پڑھا کر، اس سے انسان کو شعور و آگئی ملتی ہے۔
امی کبھی کبھی ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ مگر بابا اور دادا جان کی
حمایت تھی۔

ج : رومینہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ یہ جان کر
خوشی ہوئی کہ آپ کے والد اور دادا جان سمجھ دار انسان ہیں
اور مطالعہ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ
مطالعہ سے شعور و آگئی میں اضافہ ہوتا ہے۔ شعاع کی
پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھ کر
اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

زاہدہ چوہدری نے گجرات سے لکھا ہے

میں شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کی بہت پرانی اور
خاموش قاری ہوں۔ خط اس لیے نہیں لکھتی کہ مجھے پتا
ہے کبھی بھی شائع نہیں ہوگا۔ کیونکہ آپ صرف خاص خط
ہی شائع کرتے ہیں۔ اب تو مجھے بھی ماشاء اللہ جوان ہو گئے
ہیں۔ آج بھی خط نہ لکھتی، لیکن میرے خط لکھنے کی وجہ
ماریہ شاہ ہیں۔ جنہوں نے ماہ اگست کے شعاع میں نمرہ احمد
پر تنقید کی ہے اور یہ تنقید میرے دل پر لگی ہے۔ یقین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ
 ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
 ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
 ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
 اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
 آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
 لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

لکھے گا۔ آخر میں شاہین رشید کی تعریف کروں گی کہ وہ
 اتنے اچھے اچھے فنکاروں کے انٹرویو لے رہی ہیں ان سے
 بھی ایک فرمائش ہے کہ پلیز ایف ایم 102 کے پریزنٹر
 مسعود احمد خان اور سلیمان شوکت کا بعد تصویر انٹرویو کیا۔
 ج: نورین شعاع کے پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہین
 رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچائی
 جاری ہے۔

شازیہ قیصر نے گاؤں نروال شریف ضلع گجرات سے
 لکھا ہے۔

خواتین اور شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ 1999ء
 کے اگست خواتین کا شمار پہلی بار پرچا تھا۔ اتنے طویل
 عرصے میں زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ شادی ہوئی۔
 بچے ہوئے۔ شادی کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور
 ماسٹرز مکمل کیا۔ بی ایڈ کیا لیکن ایک عادت نہیں چھوٹی اور
 وہ تھی باقاعدگی سے شعاع کا مطالعہ۔ میں جہلم شہر کے
 ایک چھوٹے سے گاؤں نروال شریف کی رہائشی ہوں جہاں
 گاؤں کے ایک طرف دریائے جہلم بہتا ہے اور دوسری
 طرف نہر تاحہ نظر پھیلے ہوئے سرسبز شاداب کھیت جس کو
 ٹیوب ویل کے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اس چپتی اور
 جھلسا دینے والی گرمی میں ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانی میں
 نہانے کا جو مزہ اور سرور ہے وہ میں لفظوں میں بیان نہیں
 کر سکتی اور اگر اس پانی میں ٹھنڈے ہوئے آم ہو جائیں تو
 کیا بات ہے۔ شعاع اس ادارے کی اور لکھاری بہنوں کی
 محنت اور کوششوں کا بھرپور اور منہ بولتا ثبوت ہے۔ شعاع
 کے تقریباً "سارے ہی سلسلے بہت زبردست ہیں لیکن مجھے
 تاریخ کے جھوکے والا سلسلہ بہت پسند ہے اس سے اپنی
 تاریخ سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ سلسلے وار ناول دونوں
 ہی بہت زبردست ہیں۔

پیاری شازیہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں۔
 شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ! امید ہے آئندہ بھی
 خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

جانے مجھے اتنی تکلیف پہنچی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔
 ماریہ شاہ اگر نہرو جی نے تقسیم کو ناقص لکھ دیا تو کون سا گناہ
 ہو گیا۔ انہوں نے ناقص ہی لکھا ہے کوئی اور نام تو نہیں لکھ
 دیا تا۔ انہوں نے لکھا بھی ہے کہ تقسیم اسکو از ہی نام ہے۔
 کسی نے انہیں ناقص اسکو از ہی کہا ہو گا۔ تب ہی انہوں
 نے ناقص لکھا۔ ٹاپ کی اور توپ قابلی میں بھی کوئی فرق
 نہیں۔ باقی نہرو جی کو ایک بات کہنی ہے کہ آپ ہیروئن پر
 بہت زیادہ ظلم کرتی ہیں۔ منصف میں بھی آپ نے ہیروئن
 کو شدید زخمی کیا اور اب "جنت کے تے" کی حیا کو بھی
 شدید زخمی کیا۔ پلیز انہیں کم تکلیف دیا کریں، ہمیں بھی
 تکلیف ہوتی ہے۔

ج: پیاری زائدہ! آپ نے صحیح لکھا کہ ہم خاص خط شائع
 کرتے ہیں، لیکن شاید آپ کو یہ نہیں پتا کہ ہماری ساری
 قارئین ہی ہمارے لیے بہت خاص اور بہت اہم ہیں۔ اور
 ان کے لکھے ایک ایک خط کو ہم بہت محبت اور توجہ سے
 پڑھتے ہیں اور شائع کرتے ہیں۔ آپ کا خط شامل اشاعت
 ہے اور آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ آپ بھی خاص لوگوں
 میں شامل ہیں۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

نورین ہنیاء گجرات سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے
 کلرورق پر بہت کیوٹ سی لڑکی مسکرانے کی کوشش میں
 متوجہ کر رہی ہے۔ اس کی ہندی کارنگ گرمی کی وجہ سے
 پھیل گیا ہے۔ آپنی میں تاریخ کی طلبہ ہوں تو اس حوالے
 سے ورلڈ ہسٹری کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ لکھا
 کریں۔ ویسے میں "تاریخ کے جھوکے" شوق سے پڑھتی
 ہوں اور اہم باتیں نوٹ بھی کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ
 کھانا کسی یہ کیوں میں کوشش کریں کہ بار بار ایک جیسے شعر
 نہ شائع کیا کریں تو کچھ نیا اور منفرد مزادے گا۔ باقی سلسلے بھی
 اچھے ہیں۔ اب بات ہو جائے "دیوار شب" کی تو عالیہ
 بخاری بہت اچھے انداز میں لکھ رہی ہیں۔ "پیارے نبی کی
 پیاری باتیں" بڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ کتنا یہ تھا کہ
 عابد و نمود و قوم کے بارے میں قرآن کی روشنی میں ضرور کچھ

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رجحان ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے
 حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی لی وی جیسٹل پر ڈراما ڈرامائی، تحلیل
 اور سلسلے وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

دلکش

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدادہ نانی تے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیرہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو تلے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے۔ اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لیا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اٹھنے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا دیہ جہاں کن ہے۔ شہر اگر کسی کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالوشوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آدھی چوڑیل دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور ہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھر دیا ٹوٹ جاتے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق مفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار میڈیکلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل آبا کا پروردہ فانی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کمپلے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے ملے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر غاک ڈال ہے۔ چچا نے سلمان کی ملگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زویہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔



شام گہری ہو رہی تھی۔

اور اب یہ چھوٹا سا گھر تقریباً خالی تھا سوائے تھوڑے بہت سامان کے۔

خیام نے آج ساری الماریاں و درازیں وغیرہ بھی چیک کر لی تھیں تاکہ کوئی کام کی چیز نہ رہ جائے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی الماریاں اور کچھ اور سامان بھی اسکول کی نئی عمارت کی طرف روانہ کروا دیا تھا۔

الماریوں سے نکالی کچھ ردی میز پر رکھ کر وہ کرسی پر بیٹھا اب اس چھوٹے سے ڈھیر کو چیک کر رہا تھا۔ کہیں کوئی کام کا کاغذ ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ معاذ کی چیزوں کے بارے میں وہ ضرورت سے زیادہ حساس اور ذمہ دار تھا۔

زندگی میں پہلی بار بڑا اطمینان اور شہراؤ تھا۔ اور کتنی سے ملنے سے پہلے وہ واقعی خوش بھی تھا۔

برآمدے کو پار کر کے آتے ہواؤں کے جھونکے رات کی رانی اور نیلے کی خوشبوؤں سے بو جھل تھے۔

ایک کے بعد ایک قریب رکھا ڈسٹ بن بھرتا جا رہا تھا۔

تب ہی دروازے کی بیل ہوئی تھی۔

لڑکوں کا آنا جانا معمول کی بات تھی وہ یوں ہی پین ہاتھ میں لیے لیے دروازے تک آیا تھا۔

”جی! اس نے سامنے کھڑے شخص کو ابھمن بھرے انداز میں دیکھا۔

”مجھے کمال صاحب نے بھیجا ہے۔“ اس کے چہرے پر آئی ہلکی سی مسکراہٹ اس کی خوش اخلاقی کا پتہ دے رہی تھی۔

خیام یوں ہی بے تاثر سے انداز میں اس کی طرف دیکھے گیا۔

”انہوں نے یہ لفافہ دیا ہے معاذ صاحب کو دینا ہے بہت ضروری ہے۔“

خیام نے وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔

”بہت ضروری ہے۔ یاد سے انہیں پہنچا دیجیے گا۔“ اس شخص نے ایک بار پھر کہا۔

”فکر مت کریں معاذ بھائی تک پہنچ جائے گا۔ آپ بیٹھیں چائے پیئیں۔“ خیام ہلکے سے مسکرایا۔ اپنے اندر کی ساری تکلیف چھپا کر نارمل رہنے کا گرمی حد تک تو اس نے سیکھ ہی لیا تھا۔

”نہیں! میں چلتا ہوں۔ کچھ اور بھی کام ہیں۔ بہت شکریہ!“ وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔ خیام اس وقت تک وہیں دروازے میں کھڑا رہا جب تک وہ گاڑی لے کر رخصت نہ ہو گیا۔

یہ ایک شان دار گاڑی تھی جس سے وہ کمال صاحب کی حیثیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

وہاں ثانی ستارہ کے محلے میں آنے والوں میں ایسی گاڑیوں کی کمی نہیں تھی اور ان گاڑیوں میں آنے والوں سے اسے ہمیشہ سخت نفرت رہی تھی۔

”اونہ!“ اس نے ہلکے سے سر کو جھٹک کر دروازہ بند کیا۔ اندر میز پر ابھی بھی ردی کاغذوں کا ڈھیر جمع تھا۔ لفافہ ادھر ادھر ہو جانے کے ڈر سے اس نے سب سے پہلے اسے اپنے بیگ میں بند کیا اور پھر واپس اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ بڑی سی گاڑی ذہن میں چبھ سی رہی تھی۔

”پتا نہیں! اتنا پیسہ آتا کہاں سے ہے۔ جو سارے عیش و عشرت واجب کر دیتا ہے۔ اور یہ کہاں بھی کون سا۔۔۔“

یوسف کمال کے لیے ایک بدترین اندازہ لگاتے لگاتے اس نے ادھر اور اچھوڑا۔

تحریر کی بات یہ تھی کہ ہر ایک کو ہی معاذ سے کام پڑتا تھا۔ خیام کے چہرے پر پر زوری مسکراہٹ ابھری۔ لفافے کی وصولی کا میسج معاذ کو بھیج کر اس نے چند منٹ اس کی طرف سے کسی اور ہدایت کا انتظار کیا۔

وہ عام طور پر چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی جواب دیتا تھا۔ لیکن آج اس طرف خاموشی چھائی تھی۔

”شاید زیادہ ہی مصروف ہوں۔“ خیام کو تو ایسا ہی لگا تھا۔

معاذ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔

فون کتنی بار بج کر خاموش ہوا۔

میسج کالز۔ مگر سب ہی کچھ بے اثر۔

وہ سر جھکائے گہرے ہوتے سبزے کو دیکھے گیا۔

مدت ہوئی اسے سبزے درختوں، بادلوں میں من پسند شبیہ دیکھے ہوئے۔ اب نہ ہوا سرگوشی کرتی تھی اور نہ ہی دھوپ کا سنہرا پن قدموں سے لپکتا تھا۔ فطرت اس سے باتیں کرنا چھوڑ چکی تھی یا وہ خود؟ ”اندر بڑے ہال میں شائستہ امی فردا“ فردا“ قریبی عزیزوں سے اس ”خوش خبری“ کی تصدیق کرتے کرتے مزید پرسکون ہو چکی تھیں۔

”شکر ہے جو یہ بلا ٹلی۔ ورنہ میرے دل کو ہمیشہ اس کی طرف سے کھٹکائی لگا رہتا تھا کہ کہیں باہر کے باہر معاذ کونہ لے اڑے۔ آخر کو بے توشا کرہ اور اظہار کی بیٹی ہی نا۔“

سامنے خاموش بیٹھی ربیعہ سے کہتے ہوئے وہ طمانیت سے مسکرائیں اب یہاں صرف وہ دونوں تھیں۔ دادی بہت دیر ہوئی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ چکی تھیں۔

آج انہوں نے رات کے کھانے کو بھی منع کر دیا تھا۔

”کوئی کچھ کہے، لیکن اظہار بھائی اور شاکرہ دونوں کے سامنے اپنا کیا ہی آیا ہے۔ اولاد مال عزت سب ہی کچھ تو داؤ پر لگا۔ ہمارے غور کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتا تھا۔ اب دیکھ رہی ہے ساری دنیا۔“

”خدا کے لیے امی!“ ربیعہ نے بے ساختہ ہی ان کی بات کاٹی تھی۔

”اللہ سے پناہ مانگیے بس۔ گناہ گار کون نہیں ہے یہاں۔ اور پھر بے چاری جو یا کا کیا قصور ہے۔ یہی ناکہ معاذ اسے پسند کرتا ہے دل و جان سے۔؟“ اتنی سی بات بھی گلے میں پھنستے ہوئے آنسوؤں نے اسے پوری نہیں کرنے دی۔

شائستہ امی کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ یک دم ہی غائب ہوئی۔

”معاذ اسے نہیں پسند کرتا۔ پہلے کبھی اگر کچھ خیال تھا بھی اسے تو اب کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنے ماں باپ اپنے گھرانے کی ذلت کرنے والوں کے ساتھ رشتہ نہیں جوڑ سکتا اور جو یا کے لیے تو وہ مجھ سے وعدہ کر چکا ہے بہت پہلے کہ وہ اس کا نام اب کبھی نہیں لے گا۔“

”جب وہ وعدہ کر رہا تھا تو کاش! آپ نے غور سے اس کا چہرہ بھی دیکھ لیا ہوتا۔ اور اگر جب نہیں دیکھا تھا تو اب دیکھ لیں۔ بیٹھا ہوا ہے وہ سیڑھیوں پر کب سے۔“ ربیعہ کا لہجہ سخت تر تھا۔

دیکھ لیں۔ بیٹھا ہوا ہے وہ سیڑھیوں پر کب سے۔“ ربیعہ کا لہجہ سخت تر تھا۔

سامنے برآمدے پر کھلتی کھڑکیوں سے اگلے احاطے کی سیڑھیاں نظر آتی تھیں اور ربیعہ کی بات کی تصدیق بھی ہوتی تھی۔ انہوں نے ایک اچھٹی سی نگاہ ڈالی۔

”وہ جگہ ہمیشہ سے معاذ کی پسندیدہ رہی ہے۔ چھوٹا سا تھا تو تب سے وہیں بیٹھا کرتا تھا زیادہ تر۔“

”سو ثابت ہوا کہ وہ کچھ اثر لینے کو تیار نہیں۔“ ربیعہ نے مایوسی سے سوچا۔

”اور تم بھی اس معاملے میں دماغ مت کھپاؤ۔ اختر بھائی کے گھر والے آرہے ہیں۔ میں جلد سے جلد تمہارے فرض سے بھی فارغ ہونا چاہتی ہوں۔ خدا کرے! سب کام بخیر و عافیت انجام پاجائے۔ اور ہاں۔!“ وہ کمرے سے نکلے ہوئے ذرا رکیں۔

”معاذ کے ساتھ زیادہ ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہی جو یا کے بارے میں بات کرنے کی۔ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو۔ وقت ہر زخم کا علاج ہے۔“

تبیبہ کرتی ایک نگاہ ربیعہ پر ڈالتے ہوئے انہوں نے بات مکمل کی اور باہر چلی گئیں۔

ربیعہ چپ چاپ چلتی ہوئی بڑے کمرے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

امی ابابکی اسٹڈی میں داخل ہو رہی تھیں اور وہ پورے لیٹن سے کہہ سکتی تھی کہ وہ وہاں اسی موضوع پر بات کرنے گئی ہیں جس کے بارے میں انہوں نے ابھی خود اسے سختی سے کچھ کہنے سننے سے منع کیا ہے۔

وہ جہاں کھڑی تھی۔ وہاں سے اسے معاذ کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

واوی کے بتائے ہوئے سامان کی لسٹ کو شاید پہلی بار اس نے پس پشت ڈالا تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی اسے دیکھے گئی۔

امی نہ بھی منع کرتیں تب بھی وہ اس وقت معاذ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

”کاش! یہ سب کچھ اس طرح نہ ہوتا۔“

ایک چھوٹے سے پل میں اس نے معاذ اور جو یا کے مسکراتے ہوئے چہروں کو ساتھ ساتھ دیکھا۔

شفاف آنکھیں اور محبت کرنے والے دل۔

خود غرضی اور بے حسی کے ہاتھوں سنگ دلی سے برباد ہوئے تھے۔

”اور یہ معاذ! اس کی پشت پر نگاہ جمائے اس نے مایوسی سے سوچا۔

”لوگوں کے لیے اتنی درد مندی سے اتنی لگن کے ساتھ کچھ بھی کر لینے کے لیے ہمہ وقت تیار اپنی ہمت اور بساط سے کہیں آگے بڑھ کر۔“

گیراج اسکول سے زری تک بیچ میں کتنے ہی اور سلسلے تھے۔ کیا اسے کوئی ایک دعا بھی نہیں ملے گی تھی؟ ربیعہ کی آنکھ کے کونے پر پانی کا قطرہ چمک رہا تھا۔

برآمدے کے دوسرے کونے پر ابابک کے کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا۔

شائستہ امی کی اتنی جلدی واپسی غیر متوقع تھی اور وہ خود بھی دوبارہ یہ تکلیف دہ باتیں سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ سو انگلی کی پور سے آنسو کے قطرے کو جھٹکتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

آپاگل کی ٹیکسی نیچے دروازے کے پاس آکر رکی تھی۔

فرید الدین کے لائے ہوئے پھل اور مٹھائی کو بوری کنبوسی کے ساتھ منتخب گھروں میں تقسیم کرنے میں آدھے

سے زیادہ دن نکل گیا تھا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر وہ اندر سیڑھیوں والے دروازے میں داخل ہوئیں تو سلمان اوپر کی دیوار کے ساتھ لٹکا ہوا مالک مکان کے بیٹے کے ساتھ جھگڑ رہا تھا۔

”کوئی شوق نہیں ہے ہمیں تمہارے اس کھنڈر میں رہنے کا۔ پتا نہیں کیوں آگئے تھے یہاں رہنے کے لیے۔“

تین بیڈ روم کا لکڑی فلیٹ تیار ہو گیا ہے ہمارا۔ کچھ دن کی بات ہے بس۔ ہم تو اس گھر کیا، گلی میں بھی قدم نہیں رکھیں گے۔“

آپاگل کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ اتری۔ ان کے حصے کے کئی کام سلمان بخوبی کرنے لگا تھا۔

شاگرد امی کمرے میں اکیلی تھیں۔

”اٹھ گئیں آپ! میں آئی تھی مجھ کو سب تک تو آپ سو رہی تھیں۔“

”ہاں! نیند کی گولیوں کا اثر جب تک رہتا ہے سوئی ہی رہتی ہوں۔ پتا نہیں چلتا۔“

”اچھا ہے! آرام ملتا ہے سونے سے۔ اور آپ کو تو ویسے بھی سونا چاہیے زیادہ سے زیادہ۔ جانتی ہیں تو پھر

سے ذہن پر فکریں سوار کر لیتی ہیں بے کار میں۔“

”تم کہاں سے آرہی ہو؟“ آپاگل کی ہمدردی کو یکسر مسترد کر کے انہوں نے ذہن میں چبھتا ہوا سوال کیا۔

”کوئی ایک جگہ ہو تو بتاؤں۔ قریبی قریبی بھی اٹھ گھر بنتے تھے۔ جو یا کی بات طے ہونے کی مٹھائی وہاں تو جانا

ضروری تھی۔ ہمت کر کے دے ہی آئی۔ وہ تو شکر ہے کہ تین چار گھر ایک ہی گلی میں تھے۔ کرائے کی بچت ہو گئی۔

پھر بھی پندرہ سو پچھتر روپے خرچ ہو گئے پورے۔ دے دیجیے گا مجھے جو یا سے لے کر۔“ انہوں نے کارکردگی اور تقاضا ایک ساتھ کیا۔

”ہم سے کیوں؟ فرید الدین سے لیں نا۔“ متغنی تو اس کی ہوئی ہے اور سب سے زیادہ خوش بھی وہ ہی ہے۔“

سلمان اندر آچکا تھا اور آپاگل پر اعتراض اس کا حق بنتا تھا۔ آپاگل نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”فرید الدین سے زیادہ تو تم خوش ہو۔ زندگی تو تمہاری بدل رہی ہے۔ یہاں سے جان چھوٹ رہی ہے تمہاری۔

بڑے سے فلیٹ میں رہو گے مزے سے۔“

”میں اس سے کہیں زیادہ مزے دیکھ چکا ہوں۔ یہ آپ کا بھائی فرید تو زونبہ کے ڈیڈی کا پانچ برس بڑا بھی نہیں

ہے اور زونبہ بھی بے شک اب میری بیوی نہیں ہے۔ لیکن ایمان داری سے کہتا ہوں بڑے ٹھکے ہاتھ کی عورت

تھی۔ جو کھاؤ پیو، خرچ کرو، کوئی اعتراض نہیں۔ یہ فرید تو بالکل ہی الگ کیس ہے۔ مطلب کے وقت تجوری

کھولنے والا۔ ورنہ تالا ڈال کر سانپ بن کر بیٹھا رہے گا عمر بھر۔“ ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اس نے اپنے طور پر

ایک دیانت دارانہ تجزیہ کیا۔

”تم میں واقعی خاصی کمینگی ہے سلمان! منہ پر تو ”فرید بھائی“ فرید بھائی“ کہتے ہوئے زبان سوکھتی ہے تمہاری اور

پیچھے۔“ مارے کوفت کے ان سے بات بھی مکمل نہیں ہوئی۔

سلمان قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

”اتنی ٹھوکریں کھا لینے کے بعد بھی اگر عقل نہیں پکڑتا تو پھر تو بتائیں کہاں ٹھکانا بننا تھا۔ اور شکر ہے کہ جو یا کی

جگہ تم نہیں تھیں ورنہ پہلے ہی دن کسی رفاہی ادارے کا پتا بتا دیتیں مجھے۔“ آج اس پر کچھ عج سوار تھے۔

”میں جو یا کی طرح بے وقوفہ جو نہیں ہوں۔“ اس بار وہ برا ماننے کے بجائے ہنس پڑیں۔

شاگردہ بیگم نے حسرت بھری نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”ہمارے گھر سے مٹھائی دیکھ کر سب کے منہ اتر گئے۔ مجال ہے جو کوئی ایک بھی خوش ہوا ہو۔ لگے الٹے سیدھے سوال کرنے۔ کون لوگ ہیں؟ ایک دم اتنی جلدی میں کیوں ہو رہی ہے شادی کو ہی وکیل ہے جو ابرار بھائی کا گیس لڑ رہا ہے؟ قسم سے امی۔ آپ کے بہن بھائی کی ذہنیت تو سب سے گھٹیا ہے۔ ویسے برسوں ملنے نہیں آتے اور جو یا کی فکر میں سب کھلے جا رہے ہیں۔“

ان کا موڈ بحال ہو چکا تھا۔ سواب ٹرپ کی داستان کا نمبر تھا۔

”شبیر ماموں تو مٹھائی بھی نہیں لے رہے تھے۔ گیٹ پر ان کی بہو کو زبردستی پکڑائی ہے میں نے۔ وہی رٹ کہ اسلام بھائی کے لڑکے میں کیا برائی ہے۔ اب تو نوکری پر بھی لگ گیا ہے۔ دیکھا بھالا بچہ ہے۔ میں بات کر لیتا ہوں اسلام سے۔ میں تو جا کر پچھتاؤں۔“

شاکرہ بیگم نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

”جل رہے ہوں گے سب۔ اور تمہیں ضرورت ہی کیا تھی جانے کی۔ بے کار میں ہی خود کو ذلیل کروایا۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ فرید سے مل کر ویسے بھی لوگوں کو مایوسی ہونی ہے اور بھی باتیں بنیں گی۔“ سلمان کو مٹھائی بانٹنے جانے کے آئیڈے سے ویسے بھی یکسر اختلاف تھا۔

”جب وہ اتنا برا ہے تو کیا ضرورت ہے جو یا سے رشتہ کرنے کی۔ میں تو شروع سے منع کر رہی ہوں۔ آخر تم لوگ میری سنتے کیوں نہیں ہو۔“ دھیما اور بے بس لہجہ۔

آیا گل اور سلمان نے ایک دوسرے کو طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ اب ہمارا نہیں، ابو کا بھی فیصلہ ہے۔ کتنی مدت ہو گئی ہے، انہیں وہاں پڑے ہوئے۔ فرید الدین ضمانت کی رقم بھر رہا ہے۔ چند دن میں آرہے ہیں گھر وہ۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ گھر کی عزت بحال ہو رہی ہے۔“

”ضمانت کی رقم تو کسی سے ادھار بھی لے کر بھری جاسکتی ہے اس کے لیے جو یا کی زندگی کو داؤ پر لگانا۔“

آیا گل نے بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔

”کوئی داؤ پر نہیں لگ رہی ہے جو یا کی زندگی۔ سکون ہمیشہ آرام مل جائے گا اسے بھی۔ کتنی بار سمجھاؤں آپ کو۔ اور ادھار مانگ کر خاندان میں مزید ذلت نہیں کروا سکتے ہم اپنی۔ صاف بات ہے۔ خدا کے لیے اپنے پاگل پن پر قابو پائیں۔ اس سے تو اچھا ہے کہ غیند کی گولی کی ڈوزز بڑھا دیں۔ سوٹی رہا کریں بے خبر۔“

آیا گل کی آواز یکدم ہی خاصی اونچی ہوئی تھی اور ان کے ماتھے پر آیا بل اور بھی زیادہ گہرا۔

شاکرہ امی نے خوف زدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”خود تو آپ لوگ منہ چھپا کر بیٹھے ہیں۔ مگر مجھے تو زمانے کو منہ دکھانا پڑتا ہے۔ کس کس طرح کے سوالوں کے

جواب دینے پڑتے ہیں مسرال میں رشتے داروں میں۔ میری اپنی بچیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ ابو کا جیل جانا ہی کیا کم ہے۔ یہ جو یا کے بار بار ٹوٹے رشتے بھی ان کے لیے مصیبت کھڑی کرنے والے ہیں۔ عذاب بن گئے ہیں آپ لوگ میرے لیے۔“ یکدم ہی وہ زور زور سے چیخنے لگیں۔

شاکرہ امی نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

”جو یا خوش نہیں ہے۔“

”وہ کبھی خوش رہ بھی نہیں سکتی، اگر اس معاذ کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ یہ ساری نحوست اسی کی لائی ہوئی ہے۔ اعجاز سے شادی سے انکار بہانہ بنا تھا ہماری بربادی کا۔ جب تک یہاں ہے، کچھ نہیں بننے والا۔ اور میں

صاف کہہ رہی ہوں کہ۔۔۔ ”یکدم ہی انہوں نے مزید خوف زدہ کرنے والا وقفہ لیا۔
 سلمان اس ساری جھک جھک کے دوران فرید الدین کے لائے ہوئے پھلوں کے ٹوکے میں سے سیب نکال
 کر دھونے کے لیے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ بھی دروازے میں ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔
 ”اب کہہ بھی دو کیا گل۔۔۔ ٹھٹھکلاس فلم مسہنس تو مت پیدا کرو۔“ اس کے لہجے میں آکٹا ہٹ سی تھی۔
 ”تم مذاق مت سمجھو سلمان! میں تمہاری طرح ڈھیٹ بے عبرت نہیں ہوں، جو بار بار کی رسوائی برداشت کر
 سکوں۔ اس بار اگر جویا کی شادی میں کوئی رکاوٹ آئی تو میں خود کو ختم کر لوں گی۔ آگ لگا لوں گی یا زہر کھا لوں گی یا جو
 بھی سہی۔۔۔ زمانے کے سامنے ایک اور شرمندگی نہیں اٹھاؤں گی۔ اس لیے آئندہ جو کچھ بھی کیا جائے، سوچ سمجھ
 کر کیا جائے۔“
 شاگرہ امی کے چہرے پر اپنی نگاہ جما کر انہوں نے بات مکمل کی اور چادر اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔
 بیڑھیوں پر سے ان کے اترنے کی آواز اور پھر نیچے کا دروازہ زور سے بند کرنے کی آواز۔
 شاگرہ امی کے لب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے تھے۔ سلمان نے لا تعلقی سے کندھوں کو جنبش دی اور ہاتھ
 میں پکڑے اپنے سیب سنبھالتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔
 گھر میں ایک دم ہی سناٹا چھا گیا۔
 زویا اور جویا دونوں ہی اس وقت نہیں تھیں۔



دھوپ میں صبح سے ہی تیزی تھی۔
 نانی ستارہ کے بڑے سے ہال نما کمرے کی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں پر دھوپ پھیلتی ہی جا رہی تھی۔
 شاما نے آگے بڑھ کر نیلے ویلوٹ کے پردوں کو کھول کر پھیلا دیا تو ساری تپش کہیں پیچھے ہی رہ گئی۔ نیلا ہٹ مائل
 ٹھنڈک بھرا احساس سکون آمیز تھا۔ وہ تیزی سے واپس باہر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد واپس آئی تو ہاتھ میں شیشے کا پانی
 سے بھرا بڑا سا نقشین پیالہ تھا جس میں نیلے کے پھول بھرے ہوئے تھے۔ شاما نے بڑی آہستگی سے نانی ستارہ کے
 بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا۔ مگر اتنی احتیاط کے باوجود بھی ان کی آنکھ کھل ہی گئی۔
 ”آپ کی نیند خراب ہوئی۔“ وہ خفت میں جھٹلا ہوئی۔
 ”کوئی نہیں، سوئی تھوڑی تھی۔ ایسے ہی آنکھیں بند کی تھیں۔ غنودگی سی آگئی۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ بیٹھیں۔
 ”یہ نگینہ اور صندل کہاں ہیں گھر پر ہیں بھی یا نہیں؟“
 ”اسٹیٹ ایجنٹ آیا تھا۔“ نانی کی بیڈ شیٹ کو ٹھیک کرتے ہوئے اس نے تازہ ترین اطلاع دینی شروع کی۔
 ”صندل اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس سے پہلے باجی نگینہ اور صندل کا برابر جھگڑا بھی ہوا تھا۔ اب باجی اپنے
 کمرے میں ہیں۔“

نانی نے تأسف سے سر ہلایا۔ ”رور ہی ہوگی غریب۔۔۔ بلا کر لا اسے۔۔۔ مگر رک!“

شاما نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔
 ”دل ہلکا ہو گا تو خود ہی آجائے گی، کسی کسی وقت ہر انسان کو تنہائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ چھوڑ دے اسے بھی۔“
 شاما نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
 ”بے چاری باجی نگینہ۔۔۔ اللہ گیتی کو سلامت رکھے اپنے گھر۔۔۔ ورنہ تو باجی کا دامن آج بھی خالی ہے۔“

”کیا سوچ رہی ہے۔“ اس کا اترا ۲۲ تراچہ نانی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا۔
 ”کچھ نہیں نانی۔! پیر بادوں آپ کے۔“ وہ جلدی سے ان کی پائنتی آکر بیٹھی۔
 ”نہیں۔“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ ”ذرا میری وہ ڈائری نکال کر لا درازے، کالی جلد والی۔“
 شاما نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی اور ان کے دوسرے اشارے پر کمرے سے باہر نکل گئی۔
 نانی نے سائڈ پر سے اپنا چشمہ اور بال پین اٹھا کر ڈائری سامنے کھول لی تھی۔
 ڈائری برسوں پرانی تھی، کئی کاغذ پیلے پڑ چکے تھے۔
 لیکن اب بھی ان کے استعمال میں تھی۔ اودھی سے زیادہ زندگی کے روپے پیسے کا حساب یہیں درج تھا۔
 دور کسی زمانے کے گوشوارے جن میں کہیں خسارہ نہ تھا۔
 وہ صفحات پلٹتی ہوئی آخر میں آکر رکیں۔

یہاں پچھلے کافی سالوں سے گوشوارے کی ترتیب بدلتی تھی۔ نگینہ کی جان توڑ کی جانے والی محنت کے بدلے
 میں ملنے والی مختصر سی رقم، اخراجات کا برہتا ہوا گراف اور دونوں کو کھینچ تان کر برابر لانے کی تگ و دو میں تسلسل
 سے بکتے ہوئے فیروزہ کے زیورات۔

دل پر سے کتنے ہی عالم گزرتے چلے گئے۔
 صندل کی مختصر سی طوفانی کامیابی میں آمدنی میں آتے بڑے چیک اس کے اپنے پروٹوکول کی نذر تھے۔
 وہ قسم کھا کر کہہ سکتی تھیں کہ ایک پیسہ بھی انہوں نے اس کا اپنے گھر پر نہیں لگایا تھا۔ کامیابی کا سارا جشن
 انہوں نے محض اپنے پاس سے کیا تھا۔

بعد میں تو نگینہ اور صندل جا کر خریدی گئی کوٹھی میں ٹھہری تھیں یہاں گھر میں مدت سے آمدنی صفر ہوئی تھی۔
 سو وضع داری، اجلی پوشی کو برقرار رکھنے کی اب تک کی تگ و دو بھی لا حاصل ہی ٹھہری۔
 انہوں نے نیا یوسی سے سوچتے ہوئے سامنے لکھی چند اور رقموں کو کاٹا۔
 کسی بھی صورت میں جمع شدہ یہ رقم ٹھکانے لگ چکی تھی۔ وہ کچھ دیر فکر مندی سے سر جھکائے کچھ سوچے
 گئیں۔ اب تک کی زندگی عزت سے کٹی تھی۔

عروج کا زمانہ کب کا معدوم سہی، لیکن ان کے نام کا بھرم آج بھی برقرار تھا۔
 آج انہوں نے شاما کو بلانے کے بجائے خود اٹھ کر اپنی الماری کا سیف کھول کر فیروزہ کے زیورات کے خالی
 ڈبے نکال کر چیک کیے۔

ایک کے بعد ایک۔ آخری چوڑی کو بھی بکے ہوئے دو مہینے ہو رہے تھے۔ سونے کی بڑھتی ہوئی قیمت کا ہی
 سہارا تھا جواب تک کی گزر بسر ہو رہی تھی۔
 ”آگے اللہ مالک!“ دل کی گہرائی سے انہوں نے وہ سب بڑا سہارا یاد کیا اور الماری بند کر کے واپس مسہری پر آ
 بیٹھیں۔

تب ہی نگینہ اندر چلی آئی۔
 ”کیا ہوا اماں۔ ایسے کیوں بیٹھی ہیں۔“ اس کی چھٹی حس نے اسے فوراً ہی خبردار کیا تھا۔
 ”کچھ نہیں ایسے ہی۔ گیتی یاد آ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی اسے فون کر لوں۔“ خود کو سنبھالے رکھنے کی ادا ان
 کی فطرت کا حصہ بن چکی تھی، سوخنی سے بات بنا گئیں۔ نگینہ جیسی گھاگ بھی ان کی چوری نہیں پکڑ سکتی تھی۔

”وہ تو ہے۔ جب سے گئی ہے ایک بار بھی نہیں آئی۔ حالانکہ سالار بے چارے نے تھوڑی کوئی پابندی لگائی ہے، لیکن اچھا ہے وہیں رہے۔ یہاں اگر ہمارے مسئلے دیکھے گی تو واپس جا کر اس کا دل بھی نہیں لگے گا۔“

گنیمہ افسردگی سے مسکرائی۔
نانی ستارہ نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اگرچہ وہ ابھی ابھی ہلکا میک اپ کر چکی تھی، پھر بھی اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ خاصا رو دھو چکی ہے۔
”اماں! صندل نے کوٹھی کا سودا فائنل کر دیا ہے۔ اس وقت اسی کی غرض سے گئی ہے اسٹیٹ ایجنٹ کے ساتھ کوٹھی پر۔ وہیں اپنے وکیل کو بلا لیا ہے۔“

نانی ستارہ سے نگاہیں چراتے ہوئے اس نے اپنے رونے کی وجہ بھی سنا ڈالی۔
صندل کی کوٹھی میں وہ جس چاؤ سے جا کر رہی تھی۔ وہ کچھ زیادہ دور کی بات نہیں تھی۔
گنیمہ کی چال ڈھال، کھلکھلا ہٹ سب ہی کچھ کتنا اجنبی سا تھا ان دونوں۔
نانی کو بے ساختہ ہی پہلی بار صندل کی کوٹھی میں اپنا اور کیتی شاما کا جانا یاد آیا۔
گنیمہ غریب کی کیا خود ان کا سر بھی نخر سے بلند ہوا تھا۔ کیتی آرا کو انہوں نے وہاں اس مقصد سے چھوڑا تھا کہ بالی کے ہاں بڑے لوگوں کا آنا جانا ہے۔ کیتی کا نصیب بھی کھل جائے گا۔ مگر وہ تو اپنے وقت پر کھلا اور اسی چوبارے پر کھلا۔ وہ عادتاً کہیں سے کہیں پہنچیں۔

”اور ستم یہ اماں کہ بے حد سستی کی ہے اور سارے کا سارا پیسہ پتا نہیں کون سے حبابوں میں کٹ رہا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں آئے گا۔“ گنیمہ کی آگے کی روداد میں کوئی نئی بات نہیں تھی، مگر پھر بھی ہر بار سننے ہوئے دل اور بھی زیادہ دکھتا تھا۔

”بالی بد بخت نے سمجھ لیا ہے کہ اب یہ لڑکی نہیں چلنے والی۔ اس لیے جو لگایا تھا اس سے زیادہ وصول کر رہا ہے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں اماں! ساری عمر میں نے یہ سبق بار بار پڑھا، پھر بھی کچھ عقل نہ لی۔“ گنیمہ کی آواز پھر سے نمی میں ڈوبی۔

”میں بالی سے بات کروں ایک بار۔ شاید میرا لحاظ کر لے۔“ نانی نے امید کا ایک سرا تھا مانا چاہا۔
مگر گنیمہ نے بڑی تیزی سے ہتھیلی سے رگڑ کر اپنا چہرہ صاف کیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اماں۔ ایسا سوچے گا بھی مت۔ اس کیمینے بالی کے سامنے آپ۔“
سوچ کر بھی اس کا رنگ زرد پڑا جا رہا تھا۔ ”بھگت لیں گے۔ پہلے بھی تو آخر زندگی گزار رہی ہے نا۔ دم ہے ابھی اس گنیمہ جان میں، نہیں کرتی صندل کچھ بھی نہ کرے۔ میں ہوں نا۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“
جوش جذبات سے گنیمہ کا چہرہ سرخی مائل ہوا تھا اور آنکھوں پر لگانیلا آئی شیڈ پھیل کر چہرے پر آ رہا تھا۔
اسے خود ہتا نہیں تھا کہ جو دعوا وہ کر رہی ہے اب اس کے لیے بھی اب اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ نانی ستارہ کو اس پر بری طرح رحم آیا۔

”ایک بار بات کرنے میں حرج نہیں ہے گنیمہ! بالی اور کسی کی نہ سہی، میرے نام کی ضرورت رکھے گا۔ زیادہ نہ سہی کچھ تور عایت۔“ وہ اسے مشقت سے بچانا چاہتی تھیں۔ مگر گنیمہ نے تیزی سے پھر سے بات کاٹنے کی گستاخی کی۔

”میں نے کمانا نہیں۔“ آپ کو اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے اماں۔ وہ بہت گھٹیا انسان ہے۔

میں کر چکی ہوں کوشش اسے راضی کرنے کی۔ پتا ہے۔ ہاتھ تک جوڑ کر آئی ہوں اس کے آگے۔ تین گھنٹے آفس کے باہر بٹھائے رکھنے کے بعد اس نے تین منٹ بھی میری بات سنی گوارا نہیں کی۔ سال پیچھے تک نیکمہ جی۔ گنیمہ جی کر کے بات کرنا تھا۔ باہر شوٹ پر جاتا تو صندل کے ساتھ میرے لیے بھی کھٹے لایا ہے اور اب اس طرح مجھے دھتکارا جیسے کسی ڈھیٹ بھکاری کو جو جان نہ چھوڑ رہا ہو۔ اس کے آدمی نے دھکے دے کر۔“
وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ نانی ستارہ ساکت نگاہوں سے روتی ہوئی گنیمہ کو دیکھے گئیں۔

”کیا عجب تماشا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے زوال کی اس انتہائی پستی کو بھی دیکھنے کے لیے زندہ بیٹھی ہیں۔“ پانی کے چند قطرے آنکھوں پر نہیں ڈل پر گرے تھے۔
ان کا ہاتھ تسلی دینے کے لیے گنیمہ کی طرف بڑھا اور پھر ہارے ہوئے انداز میں واپس ہوا۔ انہوں نے اسے رونے دیا۔

شاما جب پانی لے کر آئی تب تک گنیمہ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ پانی کے دو گھونٹ پی کر حواس مزید بحال ہوئے تھے۔ شاما محبت سے اس کے پیچھے کھڑی کندھے دبا رہی تھی۔
”شاما! نانی کسی گہری سوچ سے باہر آئی تھیں۔“

”جی نانی!“ وہ گنیمہ کے کندھے چھوڑ کر فرماں برداری سے ان کے قریب چلی آئی۔
”گھر میں چند فالتو لائٹس جل رہی ہیں۔ سب کو بند کرو اور شام میں اس بڑے ہال میں بھی چراغاں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی ایک چھوٹا کمپا اور والا بلب جلا دیا کر اور رات میں وہ بھی بجھا دیا کریا دے بے کار کا بل بننا ہے۔“

”جی!“ وہ فرماں برداری سے کہتے ہوئے پلٹنے لگی تھی کہ انہیں کچھ اور یاد آیا۔
”اور وہ شام کا اخبار نہیں آیا کیا۔“
”شام کا اخبار!“ شاما نے گڑبڑا کر ان کی طرف دیکھا۔
”وہ تو آپ نے خود آج سے بند کروایا ہے۔“

”ارے ہاں یاد ہی نہیں رہا۔ دماغ کا بھی کیا عالم ہو گیا ہے۔ ایسا کر پھر ذرا گلناز سے لے آ۔ اس کے ہاں بھی تو آتا ہے نا۔“
”جی!“ وہ فوراً ہی باہر نکل گئی۔

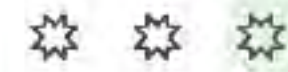
”اب کیا آتا ہے اخبار میں۔ صندل کی کوٹھی کا تو سودا بھی ہو گیا۔“
”خیام کی گمشدگی کا اشتہار۔ پتا نہیں یوسف کمال نے کون سے اخبار میں دیا ہے۔ یا پھر سب میں ہی دے دیا ہو۔ اسے کون سی کمی پڑ رہی ہے۔ بیٹے کے لیے تو پیسہ پانی کی طرح بہانے کے لیے تیار ہے۔“

ان نامساعد حالات میں بھی خیام کا ذکر لمبے ہی میں انوکھی سی مسرت اتار رہا تھا۔
گنیمہ نے تھکی تھکی سی سانس لی۔ فیوزہ اور اس کے خاندان کی خوش نصیبی آج بھی مسلم تھی۔
شاما اخبار لے آئی تھی اور اس میں آج بھی خیام کا اشتہار نہیں چھپا تھا۔ نانی ستارہ نے جلدی جلدی سارا ہی دیکھ ڈالا تھا۔ گنیمہ نے البتہ ایک نگاہ بھی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور فرصت کے اس چھوٹے سے وقفے میں فوری آمدنی کے چند ذرائع پر غور کیا۔ مگر اب سب کچھ اتنا آسان نہیں رہا تھا۔

صندل کی فلمی پرواز اور خود اس کے یہاں سے چلے جانے کے بعد نانی ستارہ کے چوبارے پر سکوت کا ایک لمبا وقفہ چھایا رہا تھا۔ بانی کو یہاں ہونے والی محفل پر اعتراض تھا اور صندل کو سوا اعتراض۔ تب ان دونوں کی ویلو تھکتی تھی اور اب اس چوبارے کی۔ لوگ یہاں کا راستہ بھول چکے تھے اور صندل آج بھی ذرا ساتعاون کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

گھینے نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔
”گزارے جتنا پیسہ تو گیتی بھی بھجوا سکتی ہے۔“ آخری آپشن جس پر وہ غور نہیں کرنا چاہتی تھی۔
نانی خیام کی تصویر سے مایوس ہو کر رقیہ اخبار دیکھنے لگی تھیں۔ شاما کھانے کا پوچھنے کے لیے پھرے کمرے میں آئی تھی۔
”ماش کی دال میں نے بنالی ہے۔ فرج میں گوشت ختم ہو گیا ہے۔ پیسے دیں تو میں نیچے جا کر لے آتی ہوں۔ ورنہ صندل منہ بنائے گی کھانے پر۔“
”بس کافی ہے۔ صندل بھی یہی کھالے گی اور منہ بتاتی ہے تو اپنے پاس سے کچھ منگالے۔ ساری عمر ناز و خرم اٹھانے کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے ہم نے اس کے۔“
گھینے بے زاری سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
”محلے میں سے ہو کر آتی ہوں اماں۔ دیکھوں تو سہی کیا چل رہا ہے۔ ہم لوگ تو جیسے ساری دنیا سے کٹ گئے ہیں۔“

”ہوں۔“ اپنے اندر کی بے چینی کو چھپاتے ہوئے انہوں نے محض سر ہلایا۔
گھینے بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔
نانی ستارہ نے اضطراب سے پہلو بدلا۔
”سو کیا اب گھرانے کا چلن بھی بدلنے کو ہے؟“
ایک بڑا سا سوالیہ نشان درو بھرے انداز میں جواب طلب تھا۔
سیف میں پڑے فیروزہ کے زیورات کے خالی ڈبے صندل کی پیچی گئی کوٹھی۔ محلہ ماش کی وال سب ہی کچھ تیزی سے آپس میں گڈھ ہوا تھا۔



سالار نے فکر مندی سے گیتی کی طرف دیکھا۔
”ہوا کیا ہے تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو گیتی! کچھ تو ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو اتنا۔“
اس کی نگاہ گیتی کے پانی سے بھیگے چہرے پر تھی۔
کتنی ہی دیر سے وہ دال میں تھی۔ ہاتھ منہ، حتیٰ کہ لباس بھی بے تحاشا پانی بہا لینے سے خاصا گھلا ہو چکا تھا۔ محض دو تین دن میں یہ ایک بڑی تبدیلی اس کی شخصیت میں آئی تھی۔
ایک آدھ بار تو اسے انتہائی ہمت دیکھ کر وہ یوں ہی نظر انداز کر گیا، مگر یہ سلسلہ ورازی ہو تا جا رہا تھا۔ اوپر سے اس کی گم صم کیفیت۔
”بتاؤ شاباش مجھ سے نہیں کہو گی تو کس سے کہو گی ہاں۔“ اسے خوف زدہ نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے سالار کو درحقیقت دکھ ہوا تھا۔
بے تحاشا مصروفیت اس کے منہ پٹاتے ہوئے شاید وہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

گیتی نے اپنے کندھوں پر اس کے دباؤ کو محسوس کرتے ہوئے ایک سکون بھری سانس لی۔
”کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ یقین کریں اور میں کیوں چھپاؤں گی آپ سے کچھ۔“
نگاہ چرا کر وہ جو یقین دلانا چاہ رہی تھی۔ سالار کے لیے ایک فیصد بھی قابل قبول نہیں تھا۔
”تمہیں پتا ہے تم جھوٹ نہیں بول سکتیں گیتی! نہ چھوٹا نہ بڑا تمہارا چہرہ تمہاری آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دیتیں۔ اس لیے ایسی کوشش بھی مت کیا کرو۔“ وہ ہلکے سے مسکرایا۔
”میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں سالار! شاید میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کسی خوش خبری کی تمہید تو نہیں ہے۔“
”نہیں بھئی۔“ وہ بری طرح چھینی تھی۔ ”آپ ایک بات کا پیچھا کیوں پکڑ لیتے ہیں۔ کہہ تو رہی ہوں کچھ نہیں ہے۔ یوں ہی وہم ہو رہا ہے آپ کو۔“ وہ خود کو سالار کی گرفت سے چھڑا کر مڑ کر چہرہ اور ہاتھ خشک کرنے لگی۔
لیکن وہ بالکل بھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔
”ٹھیک ہے مت جتاؤ میں خود ہی پتا کر لوں گا۔ لیکن مہربانی کر کے خود کو تکلیف مت دو۔ یہ میرے لیے بہت ناقابل برداشت ہے گیتی کہ میرے ہوتے ہوئے تم کسی بات کے لیے فکر مند ہو۔ ہاں میرے بعد جتنا دل چاہے۔“
”خدا کے لیے سالار۔“ وہ تیزی سے اس کی طرف مڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں آتے آنسو سالار کو بات ادا ہو رہی چھوڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔
”اچھا یا! کچھ نہیں کہہ رہا میں۔“ خود سے اسے لگاتے ہوئے وہ محبت سے تسلی دے گیا۔
گیتی نے بمشکل ہی خود کو کمپوز کیا۔

”میں اب چلتا ہوں۔ آفس میں بھی ایک ضروری میٹنگ رکھی ہے۔ معاذ سے بھی ملنا ہے اور وکیل صاحب کے ساتھ بھی اپائنٹمنٹ ہے۔ روزی کے کیس کے سلسلے میں۔“
”روزی کا کیس۔“ گیتی کا سارا حوصلہ پھر سے ختم ہونے لگا۔ سالار اس کی طرف سے پشت کیے سائیڈ ٹیبل پر پڑے کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔
”سالار!“
”ہوں۔“

گیتی نے ایک بار پھر اپنا سارا حوصلہ جمع کیا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ بے کار کے مقدمے ختم ہی کر دیں۔ راجو بھائی کی شادی بھی ہو چکی ہے اب تو وہ خوش ہیں زری کے ساتھ۔ تو پھر کیا ضروری ہے۔“
”بے کار کے مقدمے۔“ وہ بری طرح چونکا تھا۔ ”زری کا خون ناحق کیا اس طرح بے رحمی سے نظر انداز کرنے کے قابل ہے گیتی! راجو کی زندگی کو تو آگے بڑھنا ہی تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ روزی کے ساتھ کی جانے والی زندگی قابل معافی ہو گئی اب؟ ہرگز بھی نہیں، یہ معاملہ اب انجام پر پہنچنے ہی والا ہے۔ ختم ہوئے سب ہتھکنڈے زرنج اور نیبل کے۔ اس کے کبھی میں الفاظ میں ذرا بھی رعایت نہیں دیتی۔“
وہ صرف بے بسی سے اسے دیکھ گئی۔

”میں چلتا ہوں اور تم آرام کرو بس، چاہو تو زری کو بلا لیتا، لیکن خود کمرے سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنے سارے کام نہ ہوتے تو میں تمہیں کبھی بھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔ مگر مجبوری ہے۔“
اس کے گال محبت سے تھپتھپا کر وہ اپنی ضروری چیزیں اٹھا رہا تھا۔ گیتی کی بالکل بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کس طرح احساس دلانے کے لیے اس کیس کا ختم کیا جانا خود اس کی زندگی کے اس سب سے بڑے خوف کا خاتمہ

شہرے گا۔ جس سے محض چند دن میں اس کے اعصاب بری طرح ٹوٹ چکے ہیں۔
 ”دروازہ بند کر لو اندر سے اور کچھ کھا ضرور لیتا۔ میں نیچے کہتا ہوا جاؤں گا۔ اوپر ہی آجائے گا تمہارے لیے۔“
 دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر پھر اس کی طرف دیکھا۔
 ”ایک منٹ!“ سر پر دوپٹا ڈھک کر وہ زیر لب آہٹا لکری پڑھتے ہوئے اس کے قریب آئی۔
 سالار محبت سے اسے دیکھے گیا۔

”اللہ کی امان میں!“ حصار کر کے گیتی نے دھیرے سے کہا۔
 ”اور تمہیں بھی اسی اللہ کی امان میں چھوڑ کر جاتا ہوں۔ ورنہ زرتاج اور نیبل جیسے لوگوں کی گھر میں موجودگی مجھے تمہاری طرف سے ایک منٹ کے لیے بھی بے فکر نہیں ہونے دیتی ہے۔“ گیتی نے اس کے چہرے کو دیکھا۔
 وہ بہت سنجیدہ تھا اور فکر مند بھی۔ ”بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر ان میں سے کوئی بھی یہاں نظر نہیں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ تب یہ گھر مکمل طور پر تمہارا ہی ہوگا۔“
 ہلکے سے مسکرا کر اس نے بات مکمل کی۔

”اللہ حافظ!“ گیتی سے رخصت ہو کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ اوپر شیشے کی بڑی سی دیوار کے اس پار نیچے لان، پورچ اور مرکزی گیٹ نظر آتا تھا۔ جب تک وہ اپنی گاڑی لے کر گیٹ سے باہر نہیں نکلا، گیتی اسے وہیں کھڑی دیکھے گئی۔

نیچے سیڑھیوں پر آہٹ سی ہو رہی تھی۔
 اس نے چونک کر فوری طور پر کمر بند کیا۔
 قدموں کی نزدیک آتی چاپ تھیک اس کے کمرے پر ہی آکر رکی تھی۔
 گیتی کا دل بری طرح دھڑکنے شروع ہوا تھا۔

پچھلے چند دنوں میں ایک لمحے کے بھی سامنے میں وہ اسے متنبہ کرنا نہیں بھولا تھا۔ ایک خاموش نگاہ کی دہشت، بہت سارے دھمکی آمیز الفاظ سے کہیں زیادہ تھی۔ گزشتہ کل سے وہ مکمل طور پر اپنے کمرے میں بند تھی۔ چوہے بلی کے اس کھیل میں بڑا گہرا سسم طاری تھا۔
 دروازے پر ہلکے ہلکے دستک ہو رہی تھی۔

خوف زدہ نگاہوں سے دروازے کو دیکھتی ہوئی وہ بیڈ پر جا بیٹھی تھی۔ گود میں رکھے تکیے میں منہ چھپائے وہ اپنے دل کی دھڑکن کو سن رہی تھی۔

”کیا اسے فون کر کے سالار کو واپس بلا لیتا چاہیے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔“ اس کا ہاتھ بے ساختہ فون کی طرف بڑھا۔ ”مگر نہیں۔ کیا کہے گی وہ اس سے؟“

نیبل کے کہے غلاظت بھرے الفاظ نگاہیں اور اس مکر وہ ہاتھ کا لمس۔
 پورا وجود جیسے گندگی سے چھینٹوں چھینٹ اس نے ہاتھ سے رگڑ کر ان دو یکھی غلاظت کو خود پر سے اتارنا چاہا، مگر ناکام۔

دروازے پر ہونے والی دستک اس بار بلند تھی۔
 ”باجی! کمرے کی صفائی کرنی ہے۔“ باہر سے ملازمہ کی آواز اندر آئی۔
 گیتی نے ایک گہری سانس لی۔ ”آج صفائی نہیں کروانی مجھے تم جاؤ۔“
 قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی۔

شاہی محلے کی بار بار بکنے والی چیز، نگینہ جان جیسی تھوڑا کلاس ڈانس کی بیٹی۔

وہ پھر واش روم میں آئی تھی۔ خود پرست سارا پانی ڈالنے لیے۔

اسلام صاحب نے فکر مندی سے معاذ کے کمرے کی طرف دیکھا۔

”کیا وہ آج بھی آفس نہیں جا رہا ہے؟“

”ہاں کہہ رہا تھا کہ چند دن کی چھٹی لی ہوئی ہے۔ کچھ ضروری کام ہیں۔“

”اور وہ کام کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہو رہا ہے۔ کہیں نکل کر جاتا تو وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ میرے پاس

بھی وہ کھڑے کھڑے ایک آدھ بار ہی آیا ہے۔“

انہیں شائستہ کے کچے کا اطمینان برا لگا تھا۔

”کچھ تو عقل سے کام لو شائستہ! ماں ہو تم اس کی۔ بغیر کے جانا چاہیے تمہیں اس کو۔ جا کر بیٹھو اس کے پاس

بات کرو اس سے۔ آخر وہ خود کو کیوں تنہائی کی نذر کیے دے رہا ہے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا۔ مجھے معاذ سے محبت نہیں؟ جان بوجھ کر لاپرواہی برت رہی ہوں اس سے؟“

”پھر وہی لاجاصل بحث۔“ بے زاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کوریڈور سے مڑنے لگے تھے۔ جب ہی وہ ان کے

پچھے آئیں۔

”آخر آپ کیا جتنا چاہتے ہیں مجھے؟ معاذ کی حالت کی ذمہ دار میں ہوں، کیونکہ میں نے اس کی شادی جو یا سے

نہیں ہونے دی۔ مجبور کر دیا معاذ کو کہ وہ اس کا نام نہ لے؟“

کوریڈور سے گزرتے ہوئے وہ دونوں ٹھیک دواہی کے کمرے کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔

”ہاں یہی ہے۔“ اسلام صاحب نے پورے یقین کے ساتھ ان کی بات کی تصدیق کی۔

شائستہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ ”لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ رشتے سے انکار میری طرف سے

نہیں۔ ان کی طرف سے ہوا تھا اور وہ بھی انتہائی ذلت کے ساتھ۔ کیا آپ گوریجہ کا ٹھکرایا جانا بھی یاد نہیں رہا اور

وہ سب باتیں جو شاہد اور اظہار نے سارے خاندان میں بیٹھ کر ہمارے گھرانے اور خاص طور پر معاذ کے لیے کی

تھیں۔ ہماری سفید پوشی کو بار بار ذلیل کیا۔ ایک وقت تھا کہ شاہد میرا نام لینا گوارا نہیں کرتی تھی۔ درزن کے نام

سے یاد کرتی تھی۔“ ان کی آواز قدرے اونچی ہو گئی۔

سامنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی دواہی اور رجبہ دونوں ہی نے دکھ بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”اور یہ معاذ جس پر آپ اور اماں نے ہمیشہ بہت تحریک۔ ان لوگوں کے نزدیک اول درجے کا بد کردار اور ناکارہ لڑکا

تھا۔ جو ان کی بیٹی پر اس لیے ڈورے ڈال رہا تھا تاکہ ان کے گھر سے بہت سارا جینز حاصل کر سکے۔ وہ ہم جیسے

فقیروں کے گھر سے نہ لڑکی لیں گے نہ لڑکی دیں گے۔ یہ بات کئی بار دہرائی گئی۔“

وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھیں۔ رجبہ جلدی سے پانی لینے چلی گئی۔

اور کہیں تو وہ پوری طرح حق بجانب بھی تھیں۔ اسلام صاحب نے نرمی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”جانے دو پرانی باتوں کا کیا ذکر جتنا ان باتوں کو یاد کرو گی؟ اتنی ہی تکلیف ہوتی رہے گی۔ معاف کر دیا پھر بھول تو

جاؤ کم از کم۔“

”میں نہیں کر سکتی اور نہ ہی کرنا چاہوں گی۔“

رجبہ کے لائے ہوئے پانی کے گلاس نے انہیں پر سکون کیا تھا۔

”اور میں نے اپنے بیٹے کو محض ساری عمر کی ذلت سے بچایا ہے۔ اگر جو یا کو لے آئی تو ساری زندگی کا عذاب

معاذ کے سر پر مسلط ہو جاتا۔“

ان کے کچے میں وہی ٹھونک بجالاتی کیفیت تھی جو جو یا کے بارے میں آخری فیصلے کی آخری دلیل بنتی تھی۔

اسلام صاحب نے افسردگی سے ان کی طرف دیکھا۔

”میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں شائستہ! مگر کاش تم اپنا دل تھوڑا سا بڑا کر لیتیں تو شاید بہت ساری بہتری ممکن

ہوتی۔“

”امی! پچھتے آئی معاذ کی آواز پر ان دونوں نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا، وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔

پتا نہیں اس نے یہاں کھڑے ہو کر کئی جانے والی ساری۔ دل دکھانے والی باتیں سنی بھی یا نہیں۔

”میں ذرا جا رہا ہوں۔ واپسی دیر میں ہوگی۔ آپ کو تو کوئی کام نہیں ہے اب!۔“

وہ ان کی طرف مڑا۔

اس کی براؤن مہیاں آنکھوں میں بڑی گہری اداسی تھی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں!“ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

”کچھ نہیں بیٹا!“ وہ بمشکل ہی خود پر قابو پاسکے۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

”سالار سے ملنا ہے۔ ان کے کل دو فون بھی آئے مگر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“

”کوئی خاص کام!“

”سب ہی کام خاص ہیں اب!۔“ وہ ایک بار پھر مسکرایا، شاید ان سب کو مطمئن کرنے کے لیے۔ ”کل سالار کے

کیس کے دلائل ختم ہو رہے ہیں پرسوں اسکول کا افتتاح اور اس کے دو دن بعد۔“ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے

ساتھ اس نے رجبہ کی طرف دیکھا۔ ”رجبہ کے سرال والوں کی آمد۔“

وہ اس کے لیے اتنی پریشان تھی کہ سرال کے ذکر پر بھی شرمناک ہو گئی۔

”خدا کرے کہ سب کچھ خیریت سے ہو جائے۔“

”ان شاء اللہ ہو جائے گا دعا کرتے رہیں۔“ ایک دھیمی سی مسکراہٹ اب مستقل ہی اس کے چہرے پر تھی۔

”میں ذرا دواہی سے مل لوں۔“ وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا دواہی کے کمرے میں چلا گیا۔

وہ تینوں وہیں ایک بوجھل سی خاموشی میں گھرے کھڑے رہے۔

”رجبہ! بھائی کے لیے ناشتہ بنا لاؤ جا کر جلدی سے۔“ شائستہ امی ہی تھیں جو ماحول کو نارمل رکھنے کی کوشش

بہر حال کرتی رہتی تھیں۔

”پہلے اس سے پوچھ تو لو کہ وہ کچھ کھائے گا بھی یا نہیں۔“ اسلام صاحب کہتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں پر جا

کھڑے ہوئے۔ دل پر پڑا بوجھ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ایک بند گلی جس میں آگے کو راہ نہیں اور مڑنے کی چاہ نہیں!

ان کے خیال کے عین مطابق معاذ ناشتے کی معذرت کر کے باہر آچکا تھا۔

”آج اگر فرصت ہو تو شام میں آپ بھی چکر لگا لیجیے گا۔ نئے اسکول کا۔ خیام بے چارے نے بڑی محنت کی ہے

لڑکوں کے ساتھ مل کر۔ بہت ہی ٹینڈ ہے ماشاء اللہ۔“

”وہ حیرت انگیز ہے۔ مگر پر اسرار بھی۔ کچھ ہے جو اسے ایک فاصلہ بنائے رکھنے پر مجبور رکھتا ہے۔ میں فکر مند

ہوں اس کے لیے بھی۔“

ان کا ”بھی“ معنی خیز تھا۔

معاذ نگاہ چڑا کر سیڑھیاں اتر اٹھا۔

”شام تک میں بھی ان شاء اللہ فارغ ہو جاؤں گا تو آپ کو خود لے چلوں گا۔“

اس کے موبائل کی بیل بج رہی تھی۔

اسکرین پر آیا نام فوراً ہی ایک ضروری کام یاد دلایا رہا تھا جیسے وہ یکسر بھلائے ہوئے تھا۔
”سو ثابت ہوا کہ اس بار غم کی شدت کچھ اور سوا تھی!“ وہ یوسف کمالی سے زیادہ خود اپنے آپ سے شرمندہ ہوا۔

”بہت معذرت چاہتا ہوں کمال صاحب آپ کے ایک چھوٹے سے کام کو کرنے میں بھی میری طرف سے تاخیر ہوئی“ آج میں ان شاء اللہ کرتا ہوں“ ویری سوری آگین۔
”کوئی بات نہیں بیٹا! اور یہ کام تو ایک مدت سے ملا ہوا ہے۔ صرف میری اپنی کوتاہی کی وجہ سے۔ تم نے تو صرف دو تین دن ہی کی تاخیر کی۔ کیا پتا اللہ کی اس میں بھی مصلحت ہو۔“ وہ سری طرف سے وہ بہت صبر سے کہہ رہے تھے۔

معاذ نے فون آف کیا۔

ایا اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
مختصراً یہ چھوٹا سا کام گوش گزار کر کے اس نے بانیٹک اشارت کی اور خدا حافظ کہتا ہوا گیٹ سے نکلتا چلا گیا۔
سالار کے پاس جانے سے پہلے اس کا رخ پرانے اسکول کی طرف تھا۔ خیام سے یوسف کمال کا بھیجا ہوا لفافہ لینا تھا پھر اخبار کے آفس اور پھر سالار کے پاس۔
بانیٹک کی رفتار تیز کرتے ہوئے اس نے پروگرام کی ترتیب کو بدلا۔
خیام اپنے پرانے اسکول کے گیٹ کو تالا لگا رہا تھا جب اس نے معاذ کو آتے دیکھا۔
”معاذ بھائی! اس وقت؟“

یہ بڑا بے وقت ٹرپ تھا ”عموماً“ وہ سہ پہر شام تک ہی یہاں آتا تھا۔
تالا واپس نکال کر وہ وہیں کھڑا رہا۔

”خیریت معاذ بھائی! طبیعت کیسی ہے اب؟“

پچھلے تین دنوں میں اس کی مکمل بے عملی کی خبر اسے بھی تھی۔
”ٹھیک ہوں میں خیام! وہ کمال صاحب کا لفافہ ہے نا تمہارے پاس!“ وہ جلدی میں تھا۔
”میں نے بیگ میں رکھ دیا تھا۔ شریے دیتا ہوں میں آپ کو!“ وہ معاذ کے ساتھ ہی اندر آیا۔
سامان سے خالی کمرے پر آمدے اب سونے پن کا احساس دلارہے تھے جتنی دیر میں خیام نے اپنا بیگ کھول کر وہ لفافہ نکالا، معاذ نے سالار کو تھوڑی دیر تک آنے کا بیسیج کیا تھا۔
”میں تو بھول ہی گیا تھا ورنہ آپ کو وہیں گھر پر پچھا دیتا۔“ وہ اسے لفافہ تھماتے ہوئے شرمندہ سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ معاذ ملے سے مسکرایا۔

”آپ کی طبیعت پوچھنے بھی نہیں آسکا۔ ابا کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔ یاد کر رہے تھے ہمیں۔“ معاذ نے لفافے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”اسکول کی اوپننگ ہو جائے پھر اطمینان سے کسی دن ان کے پاس آؤں گا۔ مجھے ان سے کچھ ضروری بات بھی کرنی ہے۔“

”کوئی خاص بات۔“ معاذ لفافہ کھولتے کھولتے زرار کا۔

”شاید۔ یا پتا نہیں۔“ وہ تھوڑا سا کنفیوژ تھا۔ ”چائے پیئیں گے؟“ اس نے دانستہ بات بدلی۔

”چائے کا سامان ہے یہاں ابھی؟“

”بس آج جانے والا ہے“ آج رات میں بھی وہیں چلا جاؤں گا۔ بہت اچھی سیشننگ ہوئی ہے ساری۔ آپ

دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔“

وہ کچن میں چائے کا پانی رکھتے ہوئے بڑی خوشی سے بتا رہا تھا۔
معاذ کے چہرے پر پھر سے مسکراہٹ آئی۔

”میں تو بغیر دیکھے ہی بتا سکتا ہوں کہ تم نے زبردست کام۔“
الفاظ بیچ میں ہی دفعتاً ”گم ہوئے تھے۔ یوں ہی سرسری سے انداز میں کھولے گئے لفافے میں سے جھانکتی خیام کی تصویر!

اس نے بے اختیار ہی آنکھیں جھپکائیں۔
”شاید وہ غلطی سے کوئی غلط لفافہ دے گیا ہے۔“ معاذ خیام کو آواز دینے ہی لگا تھا کہ تصویر کے ساتھ لگائی گئی تفصیلات پر نگاہ جمی۔

خیام ولد یوسف کمال

رنگ گورا

بالوں کا رنگ۔ سنہری مائل براؤن

آنکھوں کا رنگ۔۔۔

مدت سے لاپتہ ہے۔

جن صاحب کو اس کے بارے میں پتا ہو مہربانی فرما کر۔“

ایک بڑے انعام کا لالچ بھی ساتھ بندھا تھا۔

وہ شاید زندگی میں کبھی بھی اتنا حیران نہیں ہوا تھا۔

خیام سامنے کچن میں نظر آ رہا تھا۔

معاذ کی نگاہ بار بار ہاتھ میں تھامی تصویر اور کچن میں کھڑے خیام پر جمی۔

شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

”یہ وہی تھا!“ جس کی اولین شرط یہ تھی کہ کوئی اس کے بھید کو جاننے کی کوشش نہ کرے۔

یوسف کمال کا بیٹا!

”کیسی ناقابل یقین بات!“ اسے بے ساختہ وہ شام یاد آئی جب ساجد پہلی بار اسے لے کر یہاں آیا تھا۔

ایک ایسا لڑکا جس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا مگر اپنی ساری خستہ حالی کے باوجود اس کا بے نیازی بھرا

انداز، جھٹکنے پر مجبور کرتا تھا۔

مگر یہ تصویر کسی اچھے دنوں کی تھی چند سال پرانی ضرور تھی مگر خیام کا لباس اور انداز دونوں ہی سے اس کی

خوشحالی کا اظہار ہو رہا تھا۔

سو اگر وہ کمال صاحب کے پاس نہیں تھا تو پھر؟

معاذ کا ذہن اس معنی کو سمجھانے میں ناکام ہوا جا رہا تھا۔ یوسف کمال کو وہ بہت زیادہ نہیں جانتا تھا اور جانتا تو وہ

خیام کو بھی نہیں ہے! یہ بھی سچ ہے۔

”اسکول کا کیا ونڈ بڑا ہے، بہت آرام سے افتتاحی تقریب ہو جائے گی۔“ بھاپ اڑاتے چائے کے کپ ہاتھ

میں لیے وہ کچن نکلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے وہ تصویر والا لفافہ اپنی جیب میں منتقل کیا۔ وہ اب ایک

منٹ بھی یہاں نہیں رکنا چاہ رہا تھا۔ مگر خیام کی بنائی ہوئی چائے کو رد کرنا بھی اچھا نہیں لگا۔

”بہت گرم ہے معاذ بھائی!“
وہ اسے جلدی جلدی گھونٹ بھرتے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں مجھے ذرا جلدی ہے خیام!“
”آج کل آپ نے گاڑی چلانا بالکل ہی چھوڑ دی ہے۔ ہر وقت بائیک پر ہی ہوتے ہیں!“
”گاڑی!“ اس نے چونک کر خیام کی طرف دیکھا وہ پہلے بھی چند بار سخت کرنی میں اسے بائیک پر آتا دیکھ کر یہ سوال پوچھ چکا تھا۔

”بس ایسے ہی!“ وہ افسردگی سے مسکرایا۔
ان دھوپ بھری لمبی لمبی گلیوں کی تمازت، جنہیں جو یا کب سے سہ رہی تھی خود اسے بھی بہت سی آسانیوں سے الگ رہنے پر مجبور کرتی تھی۔
”چلتا ہوں!“ معاذ اٹھ کر کھڑا ہوا۔
”وہ لفافہ!“ خیام نے نگاہ دوڑائی۔
”میں نے رکھ لیا ہے۔“

”تھا کیا اس میں معاذ بھائی! بہت تاکید کی تھی ان کے ڈرائیور نے۔“ معاذ کے ساتھ گیٹ کی طرف آتے ہوئے اس نے پہلی بار اس لفافے میں تھوڑی سی دلچسپی ظاہر کی۔
معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”کچھ نہیں ایسے ہی چند کاغذات تھے پر اپنی وغیرہ کے تھوڑا سا کام ہے کمال صاحب کا۔ تمہیں بھی میری وجہ سے دیر ہوئی بے کار میں۔“

وہ اس موضوع پر ایک لفظ بھی خیام کے سامنے نہیں کھینچتا تھا۔ مگر خیام۔
”بہت پیسے والے آوی ہیں۔ گاڑی سے ہی لگ رہا تھا کیا کرتے ہوں گے یہ لوگ اتنا سارا پیسہ جمع کر کے معاذ بھائی۔ ظاہر ہے کوئی مسئلہ کوئی پریشانی تو رہتی نہیں ہوگی جس کا حل تلاش کرنا ہو۔“
بائیک اشارت کرتے ہوئے معاذ نے بہت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پیسہ ہمیشہ ہی آسانیوں کی دلیل نہیں بنتا ہے خیام اور نہ ہی ہر پیسہ والا شخص خوش قسمت ہی ہوتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“
”جی!“ اس نے ہلکے سے سر ہلایا ”اور نہ ہی گھر میں آیا ہر پیسہ ہی قابل رشک ہوتا ہے!“
”گڈ!“ معاذ نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس ویک اینڈ تک یہ ساری مصروفیات نمٹا کر آرام سے ابا کے ساتھ بیٹھیں گے۔ بہت دن ہو گئے ہیں کوئی بھی گپ شپ کیے ہوئے۔“
خیام بے ساختہ ہی مسکرایا۔
”اسکول کے افتتاح کے بعد بھی کوئی بڑی مصروفیت ہے کیا خیام بھائی!“
وہ بائیک اشارت کر چکا تھا۔

”ربیعہ کے سسرال والے آرہے ہیں۔ شاید ڈیٹ بھی فکس ہو جائے شادی کی۔ اگلا مہینہ ہی ہو گا زیادہ سے زیادہ۔“
وہ اطلاع دے کر رخصت ہوا تھا مگر اسے یقین کرنے میں دقت کا سامنا تھا۔
”ربیعہ!“

اس کے سامنے وہ مسکراتا ہوا سا چہرہ دن میں چند بار تو آتا ہی تھا۔ کتنی کے بعد زندگی میں آنے والی دوسری

لڑکی۔ ربیعہ!
محسنوں کی بیٹی جس کے بارے میں وہ سوچتے ہوئے بھی خود سے شرماتا تھا۔ مگر پھر بھی۔
وہ چند لمحے یوں ہی گم صم سا کھڑا رہا۔

تھائی کا دم گھونٹا احساس اور بھی گہرا ہوا۔

ایک چھوٹی سی خوش گمانی جو کبھی کبھی بڑی نرمی سے دل کو چھو جاتی تھی خاموشی سے اپنے انجام تک پہنچی۔
ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے خود کو کمیوز کیا۔

”توٹنے جڑنے کے اس عمل میں اب اسے کم دقت کا سامنا شاید اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اپنی اوقات بھولنے کی غلطی نہیں کرتا۔“ نچلے لب کو سختی سے دانتوں تلے دباتے ہوئے خیام نے خود کو موبل سپورٹ دینا چاہی۔
”اور دیکھا جائے تو اس میں تھا بھی کیا۔ محض ایک ایک طرف احساس جو کسی کہانی کا آغاز بھی نہ بن سکا تھا۔“
وہ اندر سے نالا چابی لینے کے لیے واپس مڑ گیا۔

دو ایک پر ہجوم سڑک پر معاذ کی بائیک نے راستہ بدلا تھا۔
یوسف کمال نے حیرت سے سامنے بیٹھے معاذ کی طرف دیکھا۔
”کیا کہا؟ اشتہار نہیں دے رہے ہو؟“

انہوں نے مایوسی سے میز پر رکھے لفافے کو دیکھا جو وہ واپس کر چکا تھا۔ ”مگر یہ بہت ضروری ہے معاذ! میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ نسب سے بڑا مسئلہ خیام کی تلاش میں ہے۔ اگر وہ نہیں ملا تو یقین کر دو۔“
”وہ میرے پاس ہے کمال صاحب! خیام میرے ساتھ ہی رہتا ہے اس کے لیے کسی اشتہار کی ضرورت نہیں ہے۔“

ان کے چہرے پر نگاہ جمائے معاذ نے دھیمی آواز میں کہا۔ یوسف کمال کے لب ہلکے سے کھلے وہ بالکل دم بخود ہوئے معاذ کی طرف دیکھ رہے تھے۔
معاذ ان کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔
”میں آپ کو یہی بتانے آیا تھا کہ۔“

”تم۔ تم مجھے ابھی اس کے پاس لے چلو معاذ! میں تمہارا احسان مند رہوں گا ہمیشہ میرے بیٹھے۔ میں ترس رہا ہوں اس کے لیے برسوں سے گمراہ مجھے جانتا تک نہیں ہے۔“
معاذ نے ان کی آنکھوں میں آتے آنسو دیکھ کر تکلیف محسوس کی تھی۔
”آتی جلدی مت کریں! ورنہ وہ پھر کھو جائے گا۔ سمجھنے کی کوشش کریں میری بات۔“

یوسف کمال کے چہرے پر خوف کا تاثر ابھرا تھا۔
”شکر ہے جو اس نے یہ لفافہ کھول کر نہیں دیکھا۔ ورنہ وہ ایک منٹ نہ لگا تا وہاں سے چلے جانے میں۔ میں اور آپ شاید پھر کبھی نہیں جان سکتے اس کے بارے میں۔“
یوسف کمال نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔
”مگر آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں تو پلیز۔ مجھے خیام کے بارے میں بتائیے۔ یہ بہت ضروری ہے کمال صاحب!“

وہ بہت نرمی سے ان سے مخاطب تھا۔

آج صبح سے ہی بارش وقفے وقفے سے کئی بار برس چکی تھی۔ اور اب بھی آسمان پر سے گہرا سرمئی غبار جھلکا پڑ رہا تھا۔

زری گیتی کے پاس آئی بیٹھی تھی۔
کل معاذ کے اسکول کے افتتاح کے موقع پر وہ بھی مدعو تھی سولہاں کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا۔
”صل میں وہاں ہمارے پرانے محلے کے بہت سے لوگ ملیں گے۔ کافی بچے آتے تھے وہاں سے معاذ کے ہاں پڑھنے کے لیے۔ اب وہ سب شادی کے بعد مجھے دیکھیں گے تو اچھا سا تیار ہو کر تو جانا چاہیے نا۔“
”بالکل۔“ گیتی محض اس کا دل رکھنے کے لیے مسکرائی۔ ورنہ تو سامنے اس زرق برق ڈھیر میں اسے فی الوقت ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔

”یہ پنک یہ گرین اور یہ میون۔“ مجھے تو تینوں ہی پسند ہیں۔ فیصلہ نہیں ہو رہا ہے۔“ زری ایک کے بعد ایک جوڑے کو ہاتھ میں اٹھا کر بہت اشتیاق سے کہہ رہی تھی۔
”ایسا کرو جو راجو بھائی کو پسند ہو وہ پن لو۔“ گیتی کی سمجھ میں یہی حل آیا۔
”پوچھا تھا مگر انہیں تو میں ہر رنگ میں اچھی لگتی ہوں۔ کہنے لگے جو دل چاہے پن لو۔ یا پھر گیتی بھابی سے پوچھ لو۔ اس لیے تو آپ کا مشورہ چاہیے۔“ زری کی گاڑی وہیں اٹکی۔ گیتی مسکرا دی۔
”ٹھیک ہے پھر یہ پنک پن لو یعنی دتھن ہو تمہارے محلے والوں کو بھی اچھا لگے گا۔“
”میرا بھی یہی پہننے کو دل چاہ رہا تھا!“ زری کپڑے سمیٹتے ہوئے ہنس پڑی۔
گیتی کو اسے اس طرح مسکراتے ہوئے دیکھنا برا اچھا لگتا تھا۔

راجو کے ساتھ اس کی خوشیوں بھری ازدواجی زندگی کا ثبوت یہی مسکراہٹ تھی۔
”گلے جمعہ کی سٹینس بک کروائی ہیں پنجاب جانے کے لیے۔ وہاں راجو کے گھر والے بہت بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔“ زری کے چہرے پر لہجے میں فخر اور اعتماد آتا جا رہا تھا۔
”کچھ اور شاپنگ وغیرہ کرنی ہو وہاں جانے سے پہلے تو کر لیتا“ راجو بھائی کے ساتھ جاکر۔“

”ارے تو بہ کریں۔“ وہ پھر ہنس پڑی۔ ”اتنے کپڑے ہیں میرے پاس کہ ابھی سال دو سال ضرورت نہیں ہے۔ اور راجو کے خاندان کے لیے معاذ اور سالار بھائی دونوں ہی نے سارے کپڑے بنا دیے ہیں اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں ان کے لیے۔“ وہ تفصیل بتانے لگی۔

گیتی نے اپنے اندر کے اضطراب پر قابو رکھتے ہوئے پوری دلچسپی لینی چاہی۔ مگر ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔
”آج راجو بھائی گئے ہیں سالار کو لے کر۔“ اس نے پہلو بدلتے ہوئے اپنی بے چینی کو سہارا دینا چاہا۔
زری کے چہرے پر آئی مسکراہٹ بھی دھیمی پڑی تھی۔

”جی وہ ہیں گئے ہیں۔ آج روزی کے کپڑے کی شاید آخری سماعت ہے۔ اگلی بار فیصلہ سنا دیا جائے گا شاید۔“
”ہاں یہی بات ہے۔ کافی دیر ہو چکی ہے اب یہ آتے ہوں گے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے بھی چلنا چاہیے۔ میں نیل سے سامنا نہیں چاہتی۔“ زری اپنے کپڑے سمیٹ کر فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”یہ نہیں کہ میں اس جیسے آدمی سے ڈرتی ہوں بلکہ اس لیے کہ میں ابھی اپنی خوشیوں پر اس کی چھاپ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی ہوں۔“

گیتی آرا کو اس پر ایک دم ہی بہت رشک آیا۔
کاش وہ بھی سالار کے لیے ایسا ہی دنگ انداز رکھ سکتی تو اس طرح سارا دن چھپ کر قیدیوں کی طرح زندگی نہ گزار رہی ہوتی۔

”آپ بھی باہر نکل کر بیٹھیں۔ آج تو موسم بھی بہت اچھا ہے اور گھر بھی خالی پڑا ہے۔“ زری کے اصرار پر اسے باہر آنا ہی پڑا۔

موسم واقعی بہت اچھا ہو رہا تھا۔ لاؤنج کی کھلی کھڑکیوں بہت سے پانی کے قطرے چمک رہے تھے اور گیلی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آزادی سے اندر آرہے تھے۔
”جب میں آ رہی تھی تو زرتاج بیگم کی گاڑی بھی گھر سے باہر جا رہی تھی۔ اور یہ تو آپ کا گھر ہے آپ کیوں کمرے میں ہی بند رہتی ہیں۔ ان لوگوں کو سر پر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ راجو کہہ رہے تھے کہ سالار بھائی چاہیں تو ایک منٹ میں انہیں نکال کر باہر کر سکتے ہیں۔“

دل پر رکھا بوجھ اس یقین دہانی سے بھی کم نہیں ہونے والا تھا۔
”میں چلتی ہوں سارے کپڑے باہر نکلے پڑے ہیں یہ آگئے تو اور غصہ کریں گے۔“
وہ بڑے فطری سے انداز میں فکر کرتی ہوئی لاؤنج سے انیکسی کی طرف چلی گئی۔
گیتی بڑی کھڑکی کے پاس پڑے ہوئے کاؤچ پر بیٹھ کر یوں ہی ہرے ہوتے سبزے کو دیکھے گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے نمی سے بھرے جھونکے اس کے چہرے کو چھو رہے تھے اور کھڑکی پر باہر سے چڑھی نیلے پھولوں کی نیل میں سے بہت سارے پھول گر کر کھڑکی کی چوکھٹ پر پڑے تھے۔
کھڑکی کے دوسری طرف سے اندر کاؤچ پر بیٹھی گیتی بالکل ایسی ہی لگ رہی تھی جیسے کسی خوبصورت فریم میں بند کوئی حسین پورٹریٹ۔

لان کے ساتھ بڑا سا پورچ آج خالی پڑا تھا۔ گیتی نے کھڑکی کی چوکھٹ کے ساتھ سر کو ٹکاتے ہوئے خود کو آج قدرے آزاد محسوس کیا۔
”اللہ کرے جو آج ہی جج صاحب، نیل جیسے خطرناک آدمی کو جیل میں ڈال دیں تو کتنا اچھا ہو۔“ اس نے بہت دل سے دعا کی تھی۔

کچھ دن سے نانی، جمنی، امی، مندل، شامسا، بی بہت زیادہ یاد آرہی تھیں۔ نیل کی بخشی ہوئی سمٹھن سے بچ کر یہی راہ فرار سمجھ میں آتی تھی مگر وہاں کوئی بھی اسے بلانے میں انٹرنسٹ نہیں تھا۔
”گری بہت زیادہ ہے۔ موسم بہتر ہو گا تو ہم خود آنے کا کہیں گے۔“

صاف صاف ٹالا جا رہا تھا جیسے لاہور کی گرمی اس کے لیے کوئی انوکھی اور نئی شے تھی وہ ان سب سے کچھ کچھ خفا رہنے لگی تھی۔ سو آج کل فون کالز میں تھوڑی سی کمی تھی۔
دور بند گیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ سالار کو اسی راستے سے آنا تھا اور یہاں بیٹھ کر وہ بڑے شوق سے اس کا انتظار کر سکتی تھی۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے گیٹ پر نگاہ جمائی، ٹھنڈک کا سکون بھرا احساس۔ ہوا کے جھونکے اور بے حد تھکا ہوا ذہن اور شل ہوتے اعصاب۔

غیر محسوس انداز میں گیتی کی آنکھیں بند ہوئی تھیں۔ وقت کا کچھ دورانیہ خاموشی سے گزرا۔
گری نیند میں اس نے اپنے ماتھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا تھا۔
گیتی کی آنکھیں ہلکے سے کھلی تھیں۔
اس کے ماتھے پر سے بالوں کی لٹ پیچھے کرتا ہوا نیل بے حد قریب کھڑا تھا۔
گیتی کی آنکھیں خوف زدہ انداز میں پھیلیں۔



خوب صورت سے لہنگے میں دلہن بنی نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

”واؤ! تم تو بہت پیاری لگ رہی ہو آنسہ!“ عکس نے تصویر دیکھ کر سراہا تھا۔

”ہاں واقعی! شادی کی دلہن لگ رہی ہو مکمل۔“ ثمرین اور آفرین نے بھی تعریف کی تھی۔

”اچھا آگے تو دیکھو اور تصویریں میں اپنے ان کی بھی دکھاتی ہوں۔“ آنسہ نے اگلی تصویر پلٹی جو اس کے منگیتری تھی۔

”یہ دیکھو یہ ہے طارق۔“ تھوڑی سی شرم کی لالی اس کے گالوں پہ اتر آئی تھی۔ وہ تینوں استیاق بھری نظروں سے تصویر دیکھنے لگیں۔

”ماشاء اللہ دونوں کی جوڑی واقعی شان دار ہے۔“ آفرین نے تعریف کی۔

”سچ؟“ آنسہ نے خوشی سے بھری آواز میں پوچھا۔

”ہاں واقعی جوڑی پیاری ہے تم دونوں کی۔“ ثمرین نے بھی تائید کی تھی۔

”تھینکس!“ آنسہ اپنی تعریف سن کر اور جوش سے اگلی تصویریں دکھانے لگی۔ ثمرین اور آفرین آپس میں کزنز تھیں مگر آنسہ اور عکس سے ان کی دوستی ابھی تین مہینے پہلے ہوئی تھی۔ اسی بنا پر وہ ایک دوسرے کے متعلق زیادہ نہیں جانتی تھیں اور اسی وجہ سے وہ آنسہ کی منگنی پر نہ جا پائی تھیں۔ تمام تصویریں دیکھنے کے بعد ثمرین نے ابم بند کیا اور آنسہ کی طرف

کیمسٹری کی کلاس لینے کے بعد کلاس سے باہر آکر اس نے سکون بھری لمبی سانس خارج کی اور کلاس کے سامنے موجود کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے گراؤنڈ پر طائرانہ نظر ڈالی۔ اس وقت گراؤنڈ میں ریش زیادہ تھا۔ اگلا پیرڈ فری تھا۔ سو وہ بھی وہیں چلی آئی۔ بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کرتے وقت اس کی نظر اپنی دوستوں پر پڑی جو گراؤنڈ کے ایک کونے میں پیٹیل کے درخت کے سائے میں براجمان تھیں۔ وہ خوش گوار حیرت کے ساتھ ان کی طرف چلی آئی۔

”اس! تم لوگ آج آئی ہوئی ہو تو کلاس میں کیوں نہیں آئیں۔ پہلے تینوں پیرڈ کیوں چھوڑے تم لوگوں نے؟“ اپنی کتابیں اور بیگ ان کے قریب رکھتے ہوئے وہ خود بھی وہیں ان کے پاس نیچے بیٹھ گئی اور ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ہم دونوں آج لیٹ ہو گئی تھیں۔ مسز شمیمہ خالد کو جاننی ہو ملیٹ آنے پر کس قدر بے عزت کرتی ہیں۔ ادھر آئے تو یہ آنسہ نظر آگئی۔ دونوں کی چھٹی پر گئی تھی اور آج پورے ہفتے بعد آئی ہے اپنی منگنی کروا کر۔“ آفرین نے آنسہ کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے اپنی کلاس نہ لینے کی وجہ پوری تفصیل سے بتائی۔ وہ تینوں اس کی بات کے اختتام پر ہنس پڑیں۔

”اچھا اب باتیں بند کرو اور یہ تصویریں دیکھو اور خوب تعریفیں کرو۔“ آنسہ نے کہا اور اپنا بیگ اٹھا کر اس میں سے خوب صورت سا سرخ فٹیل کا ابم نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ پہلی ہی تصویر آنسہ کی تھی۔ گہرے سرخ رنگ کے

”ہاں عکس! تم بتاؤ تمہاری کب نے تمہارے گھر والوں کا کیا ارادہ ہے؟“ آنسہ نے لمبی عکس کے معاملے میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”یار! مجھے نہیں پتا۔ تم کیا فضول سوال لے کر بیٹھ گئی ہو۔“ عکس نے ایک دم چڑبڑے انداز میں انہیں ٹالا۔

”ہائے! تمہیں یہ سب باتیں فضول لگتی ہیں؟“ آفرین کو اس کی بات سن کر صدمہ پہنچا۔

”بڑھا دیا۔“
”ہمارے گروپ میں ہم تین تو کنارے لگیں اب عکس رہ گئی ہے۔ اس کی قسمت دیکھو کب کھلتی ہے۔“
”شرین شادی شدہ تھی۔ اس کی شادی آفرین کے بھائی کے ساتھ ہوئی تھی جبکہ آفرین کا نکاح ثمرین کے بھائی کے ساتھ ہوا تھا اور رخصتی پر بھائی کے بعد طے پائی تھی اور اب آنسہ کی بھی منگنی ہو گئی تھی۔ رہ گئی تھی تو بس عکس۔“



”ہاں۔۔۔“ عکس نے مختصر جواب دیا۔
 ”تمہاری ابھی ہوئی نہیں ہے نا؟ اس لیے تمہیں
 فضول لگتا ہے ورنہ ایسا نہیں ہے۔“ آنسہ نے فوراً
 تردید کی تھی۔

”کوئی ہونے دے گا جب ہی تو ہوگی نا۔“ عکس
 بے دھیانی میں کہہ گئی۔ مگر احساس ہونے پر فوراً
 زبان و انتوں تلے دبائی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ آنسہ نا سمجھی سے اس کی
 طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں عکس! کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ ہمیں۔“ شمرین
 نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ کا یقین
 دلاتے ہوئے پوچھا۔

عکس نظریں جھکائے زمین میں اگی چھوٹی چھوٹی
 گھاس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہی تھی۔

”بتاؤ نا عکس۔!“ آفرین نے بھی اصرار کیا۔
 تینوں اس کے بولنے کی منتظر تھیں۔

”کیا بتاؤں یا نہ۔ اصل میں تم جانتی تو ہو، ہم تین
 بہنیں دو بھائی ہیں۔ بڑی بہن کا کہیں رشتہ نہیں

ہو رہا۔ کافی جگہ بات بنی مگر انکار ہو جاتا ہے۔ امی بہت
 پریشان ہیں حور کے لیے۔ ان کے چکر میں ہم ان کے

برابر کی ہو گئی ہیں۔ مجھ سے بڑی آمنہ کا رشتہ آیا تھا۔
 اچھا تھا۔ امی مطمئن تھیں کہ شادی تینوں کی ساتھ

کروں گے۔ امی نے آمنہ کی منگنی کر دی۔ حور کے
 رشتے کی تلاش جاری تھی کہ درمیان میں آمنہ کے

سرال والوں نے شادی کرنے کا اصرار کر دیا۔ امی اور
 بھائیوں کی ضد ہے کہ جب تک حور کا نہیں ہوتا، ہم

دونوں کی نہیں کریں گے۔ اسی وجہ سے امی نے آمنہ
 کے سرال والوں کو شادی سے انکار کیا اور انتظار

کرنے کو کہا تو وہ لوگ منگنی توڑ کر چلے گئے۔ اگر یہی
 حالات رہے تو نہ حور کی شادی ہوگی اور ان کے چکر میں

نہ ہم دونوں کی ہوگی۔“ عکس نے تفصیل سے بتایا۔
 ”لوہ۔ ویری بیڈ، مگر عکس! برامت ماننا۔ یہاں

غلطی تمہاری امی اور بھائیوں کی ہے۔ لازمی نہیں ہے
 کہ حور کے انتظار میں وہ تم لوگوں کی بھی نہ کریں۔ حور

کے نصیب کا جو ہوگا وہ اسے ملے گا ضرور۔“ اس نے
 سہمی اور ہوسکتا ہے اس ویری میں بھی خدا کی کوئی
 مصلحت ہو۔ تمہاری امی کو چاہیے وہ تم دونوں بہنوں

کی شادیاں وقت پر کروں۔ ہو سکتا ہے تم دونوں کی
 شادی کے دوران ہی حور کا نصیب بھی کھل جائے۔

شمرین اس کو سمجھا رہی تھی۔
 ”یہ ہی بات ہم نے سمجھائی امی کو حور نے خود بھی

کہا ہے۔ امی میرے انتظار میں ان کی عمریں مت
 بڑھائیں۔ ان کی شادیاں تو کروں مگر امی نہیں مانتی۔

امی نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے۔“ عکس کا انداز
 بہت تلخ تھا۔

”حور کی عمر ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی
 جا رہی ہے جو بھی اس کے لیے رشتہ آتا ہے وہ ہم دو

میں سے کسی ایک کا سوالی بن جاتا ہے اور امی اپنی
 عادت کے مطابق انکار کر دیتی ہیں۔ لگتا ہے ہم بھی

بوڑھی ہو جائیں گی حور کی طرح۔ تب امی کو عقل
 آئے گی۔“

”اللہ نہ کرے عکس! ایسی بدفالیں منہ سے نہیں
 نکالتے ہیں۔ اللہ سے اچھے کی امید رکھو۔ تم اتنی

پریشان مت ہو۔ تم اپنے لیے اتنی پریشان ہو۔ ایک
 دفعہ خود کو اپنی بہن حور کی جگہ پر۔ رکھ کر سوچو اس

کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی جب وہ رجحیکٹ ہوتی
 ہوگی۔ وہ کتنی اذیت محسوس کرتی ہوگی جب اس کے

لیے آئے لوگ تمہیں پسند کرتے ہوں گے وہ کتنے دکھ
 میں ہوگی۔ وہ خود کو بوجھ سمجھتی ہوگی کہ اس کی وجہ سے

تم دونوں کی شادی نہیں ہوتی۔ عکس! تمہاری ابھی اتنی
 زیادہ عمر نہیں ہے۔ ابھی تم لی ایس سی میں ہی تو ہو،

تمہارا تو پھر ہو جائے گا۔ بجائے اس کے کہ تم اپنی
 بہن کا دل جلاؤ، تمہیں اس کا درد سمجھنا چاہیے۔ اس کا

حوصلہ بڑھانا چاہیے۔ اس کا ساتھ دینا چاہیے۔“
 شمرین اسے سمجھا رہی تھی۔ جبکہ آنسہ اور آفرین

خاموشی سے اسے سن رہی تھیں۔
 ”چھوڑو یا ر! ان کا کیا۔۔۔ عمر تو ان کی بڑھتی ہی

جا رہی ہے اور۔۔۔“ اس سے پہلے وہ اپنی بات مکمل کرتی

اگلے پیرڈ کی نیل ہو گئی۔ اپنی کتابیں اور نوٹس بیگ
 سمیٹ کر کلاسیک کلاس لینے چل پڑیں۔

وہ کالج سے لوٹی تو لاؤنچ سے آتی ٹی وی کی آواز سن
 کر وہیں چلی آئی۔ جہاں آمنہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی

کوئی شوق دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹیبل پر کتابیں اور بیگ رکھ
 کر اس کے پاس چلی آئی۔

”امی کہاں ہیں؟ اپنے کمرے میں؟ ٹی وی دیکھتے
 ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”خیر ہے نا، امی اس وقت کمرے میں کیوں ہیں؟“
 عکس کو فکر ہوئی۔

”امی کالی بی بہت لوتھا۔ شدید چکر آرہے تھے۔
 تب ہی دوائی کھا کر اپنے کمرے میں آرام کر رہی

ہیں۔“
 وہ ٹی وی کی آواز کم کرتی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

تب ہی لاؤنچ میں آتی حور پر نظر پڑی تو اوپچی آواز میں
 کہنے لگی۔

”اور ویسے بھی ہمارے گھر میں اتنی بڑی ٹینشن کے
 ہوتے ہوئے سب خیر کیسے ہو سکتی ہے۔“ اندر آتی حور

اس کی بات سن کر وہیں کھڑی رہ گئی۔
 ”ہو نہ۔ یہ تو واقعی سچ کہا ہے تم نے۔ حور کی

شادی تو مسئلہ کشمیر بن گئی ہے جب تک اس کی شادی
 نہیں ہوگی، ہمارے مسائل بھی حل نہیں ہو سکیں

گے۔“ عکس نے تائید کی۔ اس سے زیادہ سننے کی تاب
 حور میں نہ تھی۔ وہ اگلے قدموں لاؤنچ سے واپس نکل

کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور ڈریسنگ ٹیبل
 کے سامنے کھڑے ہو کر نظریں شیشے میں اپنے عکس پر

جمادیں۔
 ”کچھ خاص نہیں ہے مجھ میں اگر خاص ہو تا تو آج

تک رجحیکٹ نہ کی جا رہی ہوتی اور یہ میری بہنیں۔۔۔
 یہ کیا جانیں رجحیکٹ ہونے کی اذیت کیا ہے۔ میرے

کے لیے رشتہ جب میرے بجائے ان کے لیے ڈال دیا
 جاتا ہے تو میں کیا محسوس کرتی ہوں اور اب تو کوئی

اذیت، کوئی سوچ نہیں رہی، سوائے اس کے کہ میں
 اپنی بہنوں کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ ہوں یا اللہ!

میں ایسا کیا کروں جو ان کی خوشیاں بچالوں۔ یہ جو مجھ
 سے متفر ہو گئی ہیں، مجھے بوجھ سمجھتی ہیں، میں ان سے

نظریں ملا کر بات نہیں کر سکتی۔ قصور وار نہ ہوتے
 ہوئے بھی قصور وار مجھے سمجھا جا رہا ہے۔ میری بہنیں

مجھ سے ناراض ہیں۔ ایک طرح سے ان کا ناراض ہونا
 بھی درست ہے۔ میری وجہ سے آمنہ کا رشتہ ٹوٹ

گیا۔ کتنی خوش تھی آمنہ اس رشتے سے اس فضلے
 سے میں خود اپنی نظروں میں گر گئی ہوں۔ یا اللہ میں کیا

کروں؟“ دردناک سوچوں نے اسے اپنے گھیراؤ میں لیا
 ہوا تھا۔

”میں اب تھک گئی ہوں میرے مولا! سب کے
 لیے ایک ناپسندیدہ بوجھ بن گئی ہوں۔ میں کیا

کروں۔“ وہ سر پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ ناپسندیدہ
 ہستی ہونے کا خیال ہی کتنا سہانہ روح ہوتا ہے، کوئی

اس سے پوچھتا۔
 ان ہی دردناک سوچوں کے درمیان اس نے ایک

فیصلہ کیا، حتمی فیصلہ اور آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھ
 کر دروازہ اندھے بند کیا اور خود کو کمرے میں محصور

کر لیا۔

آج ان لوگوں کا آخری پیر تھا۔ وہ سب پیر دے کر
 سکون سے گراؤنڈ میں بیٹھی بائیں کر رہی تھیں۔ جب

آنسہ چکی تھی۔
 تم لوگوں کا آگے کا کیا ارادہ ہے۔ شمرین کا تو بتا ہے۔

یہ اماں جانی کے عہدے پر فائز ہونے والی ہے۔ اس
 کیے اس نے آگے نہیں پڑھنا۔ باقی تم دونوں کا کیا ارادہ

ہے؟“ اس نے آفرین اور عکس سے پوچھا۔ آفرین
 نظریں جھکائے مسکرا رہی تھی۔

”اب پیر پڑ ہو گئے ہیں اور ہمارا ایکا ارادہ ہے اس کی
 رخصتی کا۔ دونوں طرف تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔“

شمرین مخاطب آنسہ سے تھی اور وہ کچھ عکس کو رہی تھی

جو آفرین کی شادی کا سن خاموش سی ہو گئی تھی۔
”تم دوسروں سے پوچھ رہی ہو اپنا پلان بھی تو
بتاؤ۔“
”میرا پلان تو کوئی نہیں ہے، البتہ گھر والے پیپرز
ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اب شادی کریں
گے۔“

”ہاں۔ اب عکس سے بھی پتا کرنا اس کا کیا ارادہ
ہے۔“ آنسو نے عکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
عکس خاموش رہی، تب ہی ثمرین نے فوراً کہا۔
”آفرین! تم اور آنسو ذرا جا کر گیٹ پر تو دیکھو، کیا پتا
تمہارے بھائی آئے کھڑے ہوں، ہمیں لینے کے
لیے۔“

”اوہ باتوں میں یہ تو میں بھول ہی گئی آنسو! آؤ ذرا
ہم دیکھ کر آتے ہیں۔“ آفرین نے کہا اور آنسو کے
ساتھ وہاں سے چلی گئی۔
ان کے جانے کے بعد ثمرین عکس سے مخاطب
ہوئی۔
”عکس! میں جانتی ہوں تم کیوں خاموش ہو۔ میں
تم سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں۔ صبر کرنا سیکھو، صبر
کرنا سیکھ جاؤ گی تو بہت کچھ پالو گی۔ وقت سے پہلے اور
تقدیر سے زیادہ کچھ نہیں ملتا اور ایک بات کہنے لیے
بعد میں سوچو، پہلے دوسروں کے لیے سوچو، پھر دیکھنا
خوشیاں خود بخود تمہاری جھولی میں آ کریں گی۔
خود غرض بن جاؤ گی تو بہت بچھتاؤ گی۔ بد گمانیوں کی
دلدل سے باہر نکل کر دیکھو، پھر تم بھی وہ محسوس کر پاؤ گی
جو میں نے محسوس کیا ہے۔“

عکس دور کہیں نظریں جمائے خاموشی سے اسے
سن رہی تھی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ
پوری طرح بد گمانیوں میں پھنس چکی تھی۔
آنسو اور آفرین آپکی تھیں۔

”بھائی آئے ہوئے ہیں فوراً“ چلو ورنہ غصہ کریں
گے۔“ آفرین نے نیچے بیٹھ کر جلدی جلدی نوٹس
سمیٹتے ہوئے ثمرین سے کہا۔
پھر وہ سب اٹھ کھڑی ہوئیں۔ الوداعی کلمات کے

ساتھ ایک دوسرے سے رابطے میں رہنے کا وعدہ کر کے
رخصت ہو گئیں۔ شروع میں تو سب رابطے میں رہیں،
پھر آہستہ آہستہ سب اپنی زندگیوں میں گم ایک
دوسرے کو بھلاتی چلی گئیں۔
وقت کا کام تھا گزرنا، سو وہ گزرنا چلا گیا۔

”حنا بیٹا! دیکھو تیار ذرا ٹھیک طرح ہونا اور تم
چاروں کو میں وارن کر رہی ہوں۔ آج تم میں سے کوئی
بھی ان لوگوں کے سامنے نہیں آئے گا۔ ہر بار تم میں
سے کوئی نہ کوئی سامنے آ کر کام خراب کر دیتا ہے۔ اسی
لیے بار بار کہہ رہی ہوں، آج تم میں سے کوئی بھول کر
بھی مہمانوں کے سامنے نہیں آئے پائے۔“ وہ چاروں
کو وارن کرتی حنا کو ٹھیک طرح سے تیار ہونے کا حکم
دیتی واپس چلی گئی۔

کچھ ہی دیر میں جن کی آمد کا انتظار تھا، وہ تشریف لا
چکے تھے۔ وہ جیسے ہی ان کے استقبال کو آگے بڑھی
دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی جگہ جم سی گئیں۔
”ثمرین تم!“ عکس اپنی بچھری دوست کو سامنے پا کر
حیرت زدہ سی اس کی طرف بڑھی۔ ثمرین بھی حیران سی
اس کی طرف بڑھی۔ دونوں ارد گرد کو بھلائے ایک
دوسرے کو گلے لگائے خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔
”مجھے تو یقین نہیں آ رہا تم میرے گھر آئی ہو۔“
عکس اب بھی بے یقین سی تھی۔ تب کوثر (رشتے
کرانے والی خالہ) ان کے درمیان بولیں۔

”اب یقین کر لو اور باقی کا یقین سکون سے بیٹھ کر
کر لیتا۔“ ان کی بات سن کر وہ دونوں ہنس دیں۔
”او ثمرین بیٹھو۔“ عکس اسے لیے صوفے پر بیٹھ
گئی۔

”تم نے رابطہ کیوں ختم کر دیا تھا ثمرین!“ عکس پوچھ
رہی تھی۔
”ختم نہیں کیا۔ بس زندگی کے جھیلوں میں
فرست نہیں ملی سب کچھ چھوٹا چلا گیا۔“
”اور آفرین کا کیا حال ہے، وہ کیسی ہے؟“ عکس

نے پھر سوال کیا۔
”وہ بھی ٹھیک ہے، خوش ہے، تین بچے ہیں اس
کے دو بیٹے، ایک بیٹی۔“

”خالہ! آپ ایسا کریں، ذرا حنا کو دیکھیں، وہ تیار
ہوئی کہ نہیں۔“ عکس نے کوثر خالہ کو وہاں سے ہٹانا
چاہا۔ وہ خاموشی سے اٹھ گئیں۔

”عکس! تم بتاؤ کیسی ہو۔ کیا کرتی ہو، شادی کب
ہوئی تمہاری۔ کتنے بچے ہیں؟ اور تمہاری بہنوں کا کیا
حال ہے؟“ ثمرین نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔
عکس ذرا سا مسکرائی پھر بولی۔

”میں ٹھیک ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔ کرتی
کچھ نہیں۔ گھر پر ہوتی ہوں۔ ایک مکمل ہاؤس وائف۔
شادی لی ایس سی کے چند مہینوں بعد ہی ہو گئی تھی۔
پانچ بیٹیاں ہیں میری۔ اور اب بڑی بیٹی ہی کے رشتے
کے لیے خالہ کو کہا تھا، جب ہی تم آج یہاں ہو۔“ آخر
میں وہ نظریں جھکا گئی۔

”تمہاری اور آنسو کی شادی کب ہوئی عکس!“ وہ
شاید کچھ جاننا چاہ رہی تھی اور تمہاری بڑی بہن
حور۔“

عکس نے لمبی سانس بھری اور اس کو بتانے لگی۔
”آنسو اور میری شادی لی ایس سی کے تقریباً چھ
مہینے بعد ہوئی اور حور اسے اس کے صبر کا انعام ایک
اچھے جیون ساتھی کی شکل میں ملا۔ حور کی شادی ہماری
شادی کے ایک سال بعد ہوئی۔“

”تمہاری امی کیسے مامیں حور سے پہلے تم دونوں کی
شادی کے لیے۔“ عکس کے چپ ہونے پر اس نے
جلدی سے اگلا سوال کیا۔

”حور ہی نے امی کو منایا۔ اس نے خود کو اپنے
کمرے میں بند کر لیا۔ ساتھ ہی بھوک ہڑتال کر دی۔
تین دن تک وہ اسی طرح ضد پر اڑی رہی تو امی کو اپنی
ضد چھوڑ کر اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ پھر
امی نے اور انتظار نہ کیا۔ لی ایس سی کے زلٹ کے
تین مہینوں بعد میری اور آنسو کی شادی کر دی مگر تب
ہم نے اپنی بڑی بہن کو کھو دیا۔ ہماری شادی کے ایک

سال بعد حور کی شادی ہوئی اور شادی کے بعد اس نے
ہم سے قطع تعلق کر لیا۔ شاید ہمیں دیکھ کر اس کی وہ
ازیت بھری یادیں ہری ہو جاتی تھیں، جو ہم نے اسے
دی۔

تم ٹھیک کہتی تھیں ثمرین! تمہارا کہا ایک ایک لفظ
آج حقیقت کا روپ دھارے میرے سامنے کھڑا
ہے۔ میں ہمیشہ امی سے بدگمان رہتی تھی کہ انہیں بس
اپنی بڑی بیٹی کا خیال ہے مگر آج جب میں خود پانچ بیٹوں
کی ماں بنی ہوں تو مجھے سمجھ میں آیا، امی کیوں بڑی بیٹی
کی شادی سے پہلے چھوٹیوں کی شادی نہیں کرنا چاہتی
تھیں۔ امی کی ضد کی وجہ آج سمجھ میں آئی۔ کتنی
جلدی میری سب بیٹیاں ایک برابر قد تک پہنچ گئی ہیں
اور آج جب خود میری بڑی بیٹی کا رشتہ ہزار کوششوں
کے باوجود نہیں ہو پا رہا تو مجھے سمجھ میں آیا حور کو ہم نے
کتنی ازیت دی تھی۔ کتنا کچھ سنایا تھا، مگر اس نے ہمیں
کبھی پلٹ کر کچھ نہیں کہا۔

حور کا دکھ، اس کا صبر آج مجھے بتاتا ہے اور میں چاہ
کر بھی اس کی ازیت کا ازالہ نہیں کر سکتی۔ میں بہت
خود غرض تھی۔ جب بھی میری کسی دوست یا جاننے
والی کی منگنی یا شادی ہوتی مجھے شدید جلن ہوتی تھی کہ
میری منگنی میری شادی بھی ہو سکتی ہے مگر ان کے
درمیان رکاوٹ حور ہے۔ اپنی اسی جلن میں اپنی خود
غرضی میں میں نے اپنی بہن کو گنوا دیا۔“

عکس اپنے کیے پر پچھتا رہی تھی۔ آنسو بہا رہی
تھی۔
اور ثمرین بہت بنی خاموش نظروں سے اسے دوتے
دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ اسی
صورتحال سے بچنے کے لیے تو اس نے آخری ملاقات
میں اسے کچھ سمجھانا چاہا تھا مگر سب بے سود رہا۔
”کیا ہم ٹھوکر لگنے سے پہلے درست اقدام نہیں
کر سکتے؟“ ثمرین بس سوچ کر رہی رہ گئی۔



وہ کتنی



انگ، میری گاڑی کا چالان ہو گیا اور اب یہ باس کی اینٹھی ہوئی شکل۔

”یار! میں تو تنگ آ گیا ہوں اس بے عزتی سے۔ حیران ہوں آخر یہ ہو کیا رہا ہے میرے ساتھ میری شکل پہ بارہ بجے دیکھ کر سامنے نے ہمدردانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”گردش حالات کسی جاسکتی ہے۔ مصیبتیں کبھی آزمائش ہوتی ہیں، کبھی مکافات عمل!“

اسفر کے کہنے یہ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ یہاں سب خواجواہ محترم کو مولانا صاحب نہیں کہتے تھے۔ وعظ و نصیحت دل پسند کام تھا مگر میرے تو گویا زخموں پر نمک چھڑکا تھا جب ہی دانت کچکا کر رہ گیا۔

”لب اٹھ بھی جاؤ، کیا باپ کی طرح — کاہلی“ سستی اور کام چوری میں نام پیدا کرنے کا سوچ رکھا ہے۔ حد ہے بھی۔ اتنا نکما انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ جانے کون سا منحوس وقت تھا جب میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ کاش اس فیصلے سے قبل کسی ایک کو موت آگئی ہوتی۔ اس نے میری زندگی برباد کر دی۔“

یہ صور اسرافیل جیسی آواز میری بیوی بینش کی ہے جو بچوں کی پٹائی کرتے ہوئے خود لیٹے لیٹے ہی انہیں جگا رہی ہے۔ اب تو میری آنکھ ہر روز اسی کے شور سے کھلتی ہے تو جی چاہتا ہے مڑ جاؤں۔ میں اٹھا ہوں اور دبے پاؤں کچن کی جانب آ گیا ہوں۔ کچن کی حالت ابتر

میں باس کے کہیں سے نکلا تو میرا چراغ غم دغے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

”اف اتنی توہین ایسی ذلت!“ میرے کانوں سے ابھی تک بھاپ نکل رہی تھی۔

”ہمو، ٹھکنا، گنج! جانے خود کو سمجھتا کیا ہے؟ ارے ہم اس کے زر خرید ہیں جو دو ٹکے کی نوکری پہ جب چاہے ہمیں بے عزت کر ڈالے، منحوس!“

میں واپس اپنی سیٹ پہ آکر بیٹھنے تک بھی کھلتا رہا تھا۔ توہین کے احساس سے داغ کی رگیں کھینچ رہی تھیں۔ جی تو چاہ رہا تھا نوکری پہ لات مار کر چلا جاؤں مگر بینش کے غضب ناک چہرے نے تصور میں آکر مجھے اپنے ارادے پہ قائم نہیں رہنے دیا۔ وہ تو ڈاکٹرن بن کر خون پی جاتی میرا۔

”ریلیکس یار! کیا ہو گیا ہے۔ اتنا ٹینس کیوں ہو رہے ہو؟“

میرے کولیگ نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر گویا تسلی دی تو میں نے سر دھڑا بھری۔ اب اسے کیا بتاتا کہ میرے ستارے کیسے گردش میں آئے ہوئے ہیں آج کل ہر طرف سے ذلت جیسے بارش بن کر برس پڑی تھی میں تو بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے میری گاڑی سے ایک معمولی ایکسیڈنٹ ہو گیا کسی انسان کا نہیں کتے کا۔ کتا کسی برگرفیمیلی کا تھا۔ باہر سے منگوایا ہوا انسانوں سے بڑھ کے قدر بھی محترم کی۔ جب ہی تو اس کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہونے پہ حوالات کی سیر کرادی تھی اس کے مالک نے مجھے اس معاملے کو نمٹانے کے بینش کی جو صلواتیں اور فصیحیتیں سننی پڑیں وہ

اور نیلی کانچ سی آنکھوں کی وجہ سے وہ مجھے بالکل اس گڑیا کی طرح لگی تھی جو ماما کے بیڈروم کے ایک شلٹ میں سچی ہر دم مسکرایا کرتی تھی۔ وہ بھی بالکل ویسی ہی تھی اٹریکٹو اور چار منگ! مگر میرے لیے وہ اس گڑیا کی طرح نہ تو پسندیدہ ثابت ہوئی نہ بے ضرر نہ ہی اس گڑیا کی طرح گھر کے کسی ایک کونے تک محدود رہ سکی۔

میں سوچوں تو شاید اس سے چڑکا آغاز بھی وہیں سے ہوا تھا جب ماما کی توجہ بننے لگی۔ وہ توجہ جو اس سے پہلے صرف میرے لیے تھی وہ اس میں حصے دار بننے لگی تھی۔ ناشتے کے دوران کھانے کی ٹیبل پہ اسٹڈی کرتے ہوئے ماما اچانک مجھ سے غافل ہو کر مکمل طور پر اس کی سمت متوجہ ہو جاتیں۔

”عائزہ بیٹا! آپ نے پلاؤ لیا اور یہ کیک تو تمہیں پسند ہے۔ اپنی پلیٹ میں کیوں نہیں نکالا اور آپ کو پتا ہے یہ کباب تو اسپیشل میں نے اپنی ہنی کے لیے فرائی کیے ہیں۔“

”عازی! آپ صبح صبح چائے نہیں فریش جو س لیا کرو۔ صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔“ میں پہلے صرف حساس تھا۔ ماما کی بیٹی ہونی توجہ کی

ہے۔ میری بیوی پھوڑ ہرگز نہیں ہے اس لیے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتی سوائے لڑنے طعنے دینے اور نقص نکلانے کے۔ کام تو ملازمہ کرتی ہے یا پھر میں۔ ملازمہ چونکہ صبح کو نہیں ہوتی جب ہی ناشتہ مجھے بنانا پڑتا ہے۔ بچوں کے یونیفارم استری کرنا اور انہیں تیار کر کے اسکول بھیجنے کی ذمہ داری بھی میری ہے۔ ارے کہیں آپ میری داستان سے مجھ پہ رحم تو نہیں کھانے لگے؟ اگر ایسا ہے تو اپنے احساسات سنبھال رکھیں کسی مستحق کے لیے کیونکہ میں ہرگز بھی اس قابل نہیں ہوں کہ مجھ سے ہمدردی بھی کی جائے۔ کل جب اسفر نے وہ بات کہی تو مجھے غصہ آیا تھا مگر رات جب ہنیش نے بھی الفاظ کے کچھ ہیر پھیر کے ساتھ وہی بات کی تو میری آنکھوں پہ گرے وہ غفلت کے پردے سرک گئے۔ اپنا وہ گھناؤنا عمل پوری جزئیات سمیت ذہن کے پردے پہ روشن ہو کر رہ گیا جس نے صحیح معنوں میں انسانیت کی سطح سے مجھے بہت نیچے گرا دیا تھا۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس سے نفرت زیادہ تھی یا چڑ؟ مجھے یہ بھی نہیں پتا میں اس سے پہلی مرتبہ بے زار کب ہوا۔ کیونکہ میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو اپنی سرخ و سفید رنگت، سنہرے بالوں

وجہ سے منقسم مزاج ہونے لگا۔ وہ مجھے زہر سے بھی پرہیز کر رہی تھیں۔ اسی کی وجہ سے تو ماما بھولتی جا رہی تھیں۔ ان کے بیٹے کی پسند ناپسند کیا ہے۔ ماما میرے بجائے اس کی پسند کے کھانے پکانے لگی تھیں۔ کیا پھر بھی مجھے آگ نہ لگتی؟ مجھے لڑنا نہیں آتا تھا۔ میں کبھی چیخ کر نہیں بولا تھا تب ہی یہ آگ میرے اندر جمع ہوئی رہی اور بالآخر لاوا کی شکل اختیار کر گئی۔ ایسا لاوا جو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔ میں نے بھی اسی لاوا میں عازی کو جلا کر خاک بنادیا۔



پھر وقت بہت تیزی سے بیت گیا۔ وہ جو ماما کی بھتیجی تھی جسے ماما نے اپنے بھائی اور بھانج کی وفات کے بعد اپنے دامن شفقت میں پناہ دی تھی۔ بڑی ہو کر بہت سلیجھی ہوئی نیک پروین قسم کی لڑکی کا روپ دھار گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ماما نے اس کی بہت اعلیٰ پائے کی تربیت کی تھی۔ وہ خوبصورت بھی بہت تھی کہ سب لوگ اسے نہ صرف پسند کرتے بلکہ سراہتے بھی بہت تھے۔ ماما کی سب سہیلیوں میں وہ بہت فرماں بردار مشہور ہو چکی تھی۔ اسے یہ شہرت دینے والی بھی ماما تھیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی اس کے کئی پروپوزلز آچکے تھے مگر ماما جانے کیا سوچے بیٹھی تھیں جو انکار کیے جاتیں اور میں جو اس بلا کے نکل جانے کے خیال سے ہر بار پر جوش ہو جاتا تھا جھجکا سا جاتا۔

”آپ کو اس عازی کی بچی کی شادی بھی کرنی ہے یا نہیں؟“ جب آفاق ترمذی جیسے پروپوزل کو بھی ماما نے ٹھکرایا تو میں مزید چپ نہیں رہ سکا۔

”کتنی کیوں نہیں مگر ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ پڑھ رہی ہے۔“

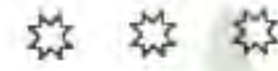
”تو رشتہ تو طے کر دیں۔“

میں دراصل اندر سے خوف زدہ ہو چکا تھا اور اس خطرے کو ٹالنے کی خواہش رکھتا تھا کیونکہ ماما کے ارادے مجھے مخلوک لگنے لگے تھے وہ شاید اسے مجھ

سے منسوب کرنے کا ارادہ کے ہوئے تھیں جبکہ مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں تھا وہ بھی بیشش سے مل لینے کے بعد بیشش جو بہت خوبصورت تھی اور بے حد امیر کبیر بھی میرا اس پر دل کیسے آیا۔ شاید وہ خوبصورت زیادہ تھی یا شاید اس کی ادا میں اتنی قابل تھیں کہ میں گھائل ہونے سے خود کو نہیں بچا سکا اب تو میرا زیادہ وقت اسی کے ساتھ بیتتا تھا۔

”عازی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے، تم پریشان مت ہو۔“

ماما نے بات ختم کر دی تو مجھے بھی خاموش ہونا پڑا مگر وہ جو دھڑکا تھا وہ چین نہیں لینے دیتا تھا۔



اس روز بیشش کی برتھ ڈے تھی۔ تمام فرینڈز میں سے اس نے صرف مجھے انوائٹ کیا تھا اور یہ بات میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی اتنے لینڈ لارڈ باپ کی بیٹی مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔ یہ پارٹی ہوٹل میں سیلیبریٹ کی گئی تھی۔ میں بہت خوبصورت وقت بیشش کے ساتھ گزار کے اور اپنی جیب خوب اچھی طرح سے ہلکی کر کے بھی گویا ہواؤں میں اڑتا رہا تھا۔ رات گئے جب میں سرشار سالوٹا تو سب سے پہلے میرا سامنا عازہ سے ہی ہوا تھا۔

”کہاں رہ گئے تھے آپ؟ سیل بھی آپ کا مسلسل آف جا رہا تھا۔ آپ کو کچھ احساس بھی ہے کہ۔“

”لوئے ہیلو! تم یہ سوال مجھ سے کرنے والی ہوتی کون ہو۔ ہاں؟ بیوی ہو میری یا پھر میری ماں؟ میں نے اپنی زندگی میں یہ حق تمہیں کبھی بھی نہیں دیا۔ تمہیں۔ میں دیر سے گھر لوٹوں یا رات بھر باہر رہوں، تمہیں جواب دہ نہیں ہوں میں۔“

اس کی بات درمیان میں سے ہی کاٹ کر میں گویا اس پر برس پڑا تھا۔ اس کا گلہاں چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ یہ سچ تھا کہ بچپن سے جنم لینے والی اس۔ نفرت نے مجھے کبھی بھی اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرنے

دی تھی۔ سمر میں ماما سے ڈرتا تھا اس لیے کبھی منہ نہ منہ اس کو سنائی بھی نہ تھیں مگر میری خشکیاں نظریں میرا لیا دیا انداز ہی اسے محتاط کر گیا تھا۔ ہمارے بیچ بہت گریز تھا وہ مجھ سے بہت کم مخاطب ہوا کرتی وہ بھی کسی بہت ضرورت کے موقع پر۔ وہ بہت باوقار لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی جس کی خود بخود عزت کرنے کو دل چاہے مگر میرا نہیں۔ میں تو اس سے بس نفرت ہی کرتا تھا۔ جب ہی اس وقت بھی اس کا دھواں ہوتا چہرہ مجھے نادم کرنے کے بجائے مزید متفر کر گیا۔

”اب جاؤ بھی یہ رونی صورت لے کر یہاں سے۔“

”ایز۔ کیا بد تمیزی ہے یہ؟“

”ایا یقیناً“ میری بلند آواز سے ہی گھبرا کر کمرے سے باہر آئی تھیں ان کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے پونے بوجھل تھے۔

”اسے سمجھا دیں ماما یہ میرے معاملات میں ٹانگ نہ اڑایا کرے۔“ میرا غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

”تمہارا سیل آف تھا۔ تم صبح سے گھر سے باہر تھے۔ شہر کے حالات کا تمہیں پتا ہے۔ بیٹا! اس پریشانی نے میرا پی پی شوٹ کر دیا تھا۔ بہت ٹینشن میں تھی وہ بھی میرے ساتھ اسی پریشانی میں۔ تمہیں تمہاری بے حسی کا احساس دلانا چاہا تھا۔ یہ غلطی تھی اس کی۔“

ماما کی آواز ایک دم جیسے آنسوؤں سے بھاری ہو گئی۔ میں نے ہونٹ بچھینچ لیے۔ اپنی غلطی کے احساس سے نہیں ایک بار پھر ماما کی اس کی حمایت پر۔ تب مجھے احساس ہی نہ ہوتا تھا درحقیقت میں ہی غلط ہوں۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

میں نے خود کو کمپوز کیا اور ان کے قریب آکر کانڈھوں سے تھام کر انہیں سہارا دیتے ہوئے ان کے کمرے کی جانب لے جانے لگا۔ مجھے اب جا کے اس اعتراف میں بھی عار نہیں کہ میں کسی حد تک دوغلا

بھی تھا۔ اس وقت مجھے ناگواری محسوس ہوئی تھی مگر میں نے ناگواری ظاہر نہیں کی بلکہ ماما سے ہمدردی ظاہر کی تھی جسے ظاہر ہے وہ سمجھ نہیں پائیں اور میری اس حرکت کو اپنی غلطی کا احساس ہو جانا سمجھ کر خوش ہو گئیں۔

”بیٹا! اتنی رات تک گھر سے باہر نہ رہا کرو۔ اور عازہ سے اس طرح بات مت کرنا آئندہ۔“ تیمم بچی ہے۔ میں اکثر بیمار رہتی ہوں بلکہ تم وعدہ کرو اگر مجھ کچھ ہو گیا تو تم ہمیشہ اس کا خیال رکھو گے۔“

”آپ ایسی باتیں مت کریں ماما! مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“

”موت تو برحق ہے بیٹا! سب کو آتی ہے۔ تم بس مجھ سے وعدہ کرو۔“

ماما کی ضد اور اصرار یہ میں جزبہ ہونے لگا۔ اب بات کھولنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

”اس کی شادی کر دیں ماما! اس کا شوہر اس کا خود خیال رکھ لے گا۔“

”میں تو چاہتی ہوں عازہ کی شادی تم سے کروں۔“ مجھے بہت عزیز ہے وہ اور میں اسے ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

وہ اس قدر بلیجی ہو کر بولیں کہ میں جو دماغ کو بھک سے اڑتا محسوس کر رہا تھا محض جزبہ ہو کر رہ گیا۔ عجیب تھیں ماما بھی۔ کبھی مرنے کی بات کرتی تھیں، کبھی اسے عمر بھر آنکھوں کے سامنے دیکھنے کی۔ بھلا ایک مرے ہوئے انسان کو زندہ انسانوں کے دکھ سکھ سے کیا غرض؟

آپ مجھے لامنتی نظروں سے دیکھ رہے ہیں نا؟ میں تب ایسا ہی تھا۔ مجھے شاید تب کسی سے محبت نہ تھی سوائے اپنے ذات کے۔ میں بے حس بھی تھا شاید اور یہی بے حسی مجھ سے وہ گھناؤنا فعل سرزد کر آئی۔



ماما عازہ کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی تھیں جو مجھے ہرگز گوارا نہ تھا۔ میں بیشش کے علاوہ کسی اور کے

متعلق اگر سوچتا بھی تو وہ ہرگز ہرگز عازنہ نہ ہوتی۔ مجھے اس سے اتنی نفرت تھی کہ حد نہیں۔ حیرت ہے میری نفرت کی آج ماما تک کیسے نہیں پہنچی۔ شاید ماما کی غرض پوشیدہ تھی۔ انہیں اپنی بھتیجی کے آگے میری خوشی نظر ہی نہ آتی تھی۔ سیکھ شاعر، کم گو خدمت گزار بھتیجی جسے ہونا کدو عمر بھر کا سکھ جانے کی متمنی تھیں۔ نئی آنے والی جانے کیسی ہو یہی خوف انہیں اس فیصلے پر اکسار رہا تھا۔ یعنی ایثار کا ایثار۔ نیکی کی نیکی اور فائدے کا فائدہ۔ وہ کیا مثل مشہور ہے کہ ہنگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ بالکل یہی بات تھی اور میں ماما کی اس سازش کو کامیابی سے ہمکنار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا تب ہی غور و خوض کرنا شروع کر دیا کوئی ایسا طریقہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کہ میں جتنا بھی بے حس مفاد پرست سہی بہر حال کھل کر ماما کی مخالفت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ ماما پی کے ساتھ ہارٹ ہیشنٹ تھیں اور ڈاکٹر نے انہیں کسی بھی صدمے یا دکھ سے بچانے کی سختی سے تاکید کر رکھی تھی۔ جبکہ میں عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ماما کی طبیعت ان دنوں خراب رہنے لگی تھی اور وہ پتا نہیں کیوں میری شادی کرانے کے ورپے ہو گئی تھیں۔ مجھ کچھ اور نہ سوچتا تو میں نے عازنی سے بات کرنے کی ٹھانی۔ میں بندوق کے لیے اس کا کاندھا استعمال کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی قسمت نے مجھے ایک اور سہرا موقع فراہم کر دیا۔

منظر پاپا کا دربار کا رشتہ دار تھا۔ گاؤں میں پاپا کی وسیع زمین تھی جس میں پاپا کی وفات کے بعد سے منظر کے ابا یعنی میرے رشتہ کے تایا ہی سنبھال رہے تھے زمینوں سے ہونے والی آمدنی کا حساب کتاب اور کچھ خالص قسم کی سوغاتیں مثلاً ”پنجیری ویسی گھی وغیرہ“ باقاعدگی سے تایا جی خود پہنچایا کرتے تھے کہ ماما اپنی بیماری کی وجہ سے طویل سفر کرنے سے قاصر تھیں جبکہ مجھے ان کاموں میں ہرے سے دلچسپی ہی نہیں تھی لیکن اس مرتبہ چونکہ تایا جی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی

جب ہی انہوں نے خود آنے کے بجائے منظر کو بھیج دیا۔ سیدھا سادا احق سادہ سادہ منظر شکل سے ہی بے وقوف لگتا تھا۔ اس کی شکل یہ برسنے والی اس حماقت نے ہی مجھے وہ شیطانی منصوبہ گھڑنے میں مدد دی تھی اور جب ماما اسے رات رک جانے پہ اصرار کر رہی تھیں۔ میں نے بھی سرسری سے انداز میں ان کی حمایت کر دی۔ وہ بے چارہ تذبذب کا شکار آخر رک گیا کہ ان کے ہاں بزرگوں کی بات کو بہر حال بہت اہمیت دی جاتی ہے اس کی آمادگی دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا مگر کسی پہ بھی ظاہر کیے بغیر میں نے سب سے پہلے فون پر اپنے خاص دوست سے ساز باز کی اور اسے اس کا کام سمجھا کر آمادہ کیا۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا بلکہ اس کی تو سنتے ہی باپچیں کھل گئیں اس کی بے پایاں خوشی کو محسوس کیے بنا میں نے فون بند کر دیا تب مجھے اندازہ تک نہ تھا۔ میں انسانیت کی سطح سے کس حد تک گر رہا ہوں۔ دوسرا کام مجھے اس وقت کرنا تھا جب عازنہ کچن میں کھانا پکانے میں مصروف ہوتی۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ منظر دیہاتی تھا اور سرشام کھانا کھانے کا عادی جب ہی عازنہ کو اس روز معمول سے کہیں پہلے کچن میں جانا پڑا اس کے جاتے ہی میں اس کے کمرے میں آگیا۔ درتے سے پردے ہٹا کر میں نے کھڑکی کا پرٹ وا کیا اور جھلکے کی دو سلاخیں کچھ اس حد تک ہٹا دیں کہ اسے (میرا دوست جسے اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا) آسانی دہاں سے کمرے میں داخل ہو سکے۔ یہ خاصا مشقت طلب کام تھا مگر صد شکر کہ یہ کھڑکی گھر کے پچھواڑے حصے میں لگھاتی تھی اور اس طرف کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ عازنہ کے بالکل ساتھ میرا کمرہ تھا اگر اس کے کمرے میں شور ہوتا اور میرے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوتی تو وہاں سے یہ ساری آوازیں با آسانی اندر پہنچ سکتی تھیں۔ میں نے درتے کو بند کیا مگر چینی نہیں چڑھائی پردے برابر کیے اور دے پاؤں باہر نکل گیا۔ بانی کھیل رات کا تھا۔ کھانے کے بعد جب ماما اور عازنہ اپنے

کمروں میں چلی گئیں تو میرے لیے منظر کو مووی دیکھنے کے لیے قائل کرنا ہرگز مشکل ثابت نہ ہوا۔ اسے اپنے کمرے میں لا کر میں نے ذرا گرم گرم قسم کی مووی لگائی اور خود واش روم جانے کے بہانے سے اٹھ گیا۔ ہاتھ روم میں قدم رکھنے سے قبل میں نے ایک نظر کھلی کھڑکی پہ ڈالی اور مطمئن ہو گیا۔ واش روم میں بند ہو کر میں نے شاور کھول دیا اور فون نکال کر اسد کو کال کر کے ایکشن لینے کا کہا اور خود گنگناتے ہوئے شاور لینے لگا اس کام سے فراغت کے بعد میں نے کموڈ پہ چرر رکھ کر روشن دان سے کمرے میں جھانکا۔ منظر مطمئن اور مگن انداز میں مووی میں گم تھا۔

”یہ اسد خبیث کہاں رہ گیا؟“

ہر طرف سے اطمینان نے مجھے ابھی تشویش میں مبتلا کیا ہی تھا کہ ایک دم کھلی کھڑکی سے نسوانی چیخوں کی آواز کمرے میں در آئی۔ منظر نے بہت چونک کر سر گھمایا اور آواز کا تعین کرنے کے بعد وہ بہت سرعت سے اٹھا تھا اور درتے تک گیا اور گویا صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اگلے لمحے وہ ہوائیاں اڑتے چہرے کے ساتھ تیرکی مانند واش روم کے دروازے تک آیا اور دونوں ہاتھوں سے ایک افرا تفری کے عالم میں دروازہ پیٹ ڈالا۔

”ایزد بھائی! ایزد بھائی! جلدی باہر آئیں۔ مجھے لگتا ہے عازنہ باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں یا پھر کوئی اور گڑبڑ ہے۔ وہ زور زور سے چیخ رہی ہیں مدد کو پکار رہی ہیں۔“ وہ گھبرائے ہوئے کچے میں تیز تیز بولا تھا مگر میرے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا وہ ایک دم پلٹا اور بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اب تک سب کچھ میری سوچ اور منصوبے کے مطابق تھا تو آگے بھی میرے پھیلائے جال سے نہیں نکل سکتے تھے۔ میں خباثت سے مسکرایا اور کموڈ سے اتر کر دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ نی وی ہنوز چل رہا تھا مگر کھلے درتے سے بے ہنگم شور کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ میں کچھ حیرانی کچھ پریشانی کا تاثر لیے کمرے سے نکلا۔ گھر کے ملازم ماما سمیت عازنہ

کے کمرے کی جانب دوڑے جارہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ ملازم باہر رک گئے مگر میں ماما کے ساتھ عازنہ کے کمرے میں جا گھسا۔

عازنہ کی حالت غیر تھی اور بدحواس سا منظر ہاتھ میں اس کی چادر پکڑے کھڑا تھا۔ میں تمللا کر آگے بڑھا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ منظر کو لاٹوں اور ٹھوکروں کی زد پہ رکھ لیا۔ ساتھ ساتھ میری زبان سے مغلظات بھی جاری تھے۔ میں ہر ممکن طریقے سے منظر کو مجرم ثابت کرنا چاہتا تھا۔ منظر تو بھونچکا ہوا ہی تھا۔ عازنہ بھی بدحواس ہو گئی۔

”ذلیل! گھٹیا! کیسے! مجھے کیا پتہ تھا۔ تو اتنا خبیث ہے ورنہ...“

میرے ہاتھ اور سرعت سے چلنے لگے ساتھ زبان بھی۔ منظر تو گنگ ہوئے لگا تھا۔ یہی میں بھی چاہتا تھا۔ کہ اسے صفائی کا موقع ہی نہ ملے۔ مگر وہ بھی ایک ڈھیٹ چیز تھا۔ اتنی مار کھا کر بھی چپ نہیں رہا۔

”ایزد بھائی! ایزد بھائی! میری بات سنیں۔ یہ میں نہیں تھا۔ میں تو شور سن کر آیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ میرے آنے پہ بھاگا ہے۔ میں تو...“

”بکو اس مت کر۔ جھوٹے کیسے! تو آیا ہی خراب نیت سے تھا۔ تیرے دماغ میں فتور تھا۔“

میں نے ایک زور کا گھونسا اس کے منہ پہ دے مارا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ وہ پہلی بار خوف زدہ نظر آیا اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پہلے ہونٹ سے ٹھوڑی تک بہہ جانے والے خون کو چھو کر دیکھا پھر گھٹکھٹا کر بولا تھا۔

”ایزد بھائی! آپ عازنہ باجی سے پوچھیں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ عازنہ باجی! آپ بتائیں وہ کون تھا میں یا کوئی اور۔ چاچی! میری بات کا یقین کریں۔“

وہ پہلے عازنہ پھر ماما کے آگے گڑ گرایا۔ ”اس سے پوچھیں جو خود تیرے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اسی نے دروازہ کھلا چھوڑا تھا؟“ میں کسی طور بھی جیتی ہوئی بازی ہارنے پہ آمادہ

نہیں تھا جب ہی عائزہ کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ عائزہ جو تب سے یوں ساکن کھڑی تھی جیسے پتھر لگی ہو اس آخری بات پر وہ یک لخت زرد پڑ گئی۔

”ایزہ! خاموش ہو جاؤ۔“

ماما جو تب سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک صدمے کی کیفیت میں یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھیں اس بات پر حواسوں میں لوٹ کر زور سے چلائیں۔

”عائزہ کو کچھ مت کہو۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ میری بچی ایسی نہیں ہے۔“

ماما نے تڑپ کر کہا اور بے قراری سے عائزہ کی طرف لپکیں جو بھر بھری دیوار کی طرح کھڑے سے بیٹھتی چلی گئی تھی۔

شاید میرے الفاظ کی سنگینی اور سفاکی نے اسے یکلخت بے جان کر دیا تھا۔ مگر مجھے احساس یہ کہاں تھا۔

”اونہ اب ڈرامے شروع ہوں گے اور کون کتنا پارسا ہے اب ہی تو آپ جانیں گی۔ یہ محترمہ پہلے مجھ پر دُورے ڈالتی رہیں ناکامی کی صورت میں جو جیسا بھی ملا اسی پر اکتفا کر کے نفس کی پیاس بجھانے کا انتظام کر لیا۔“

میرے لہجے میں نفرت کی ایسی آگ تھی کہ جس کی لپٹوں نے عائزہ تو عائزہ ماما کو بھی جھلسا کے بھسم کر دیا۔ میں نے بتایا نہ کہ تب مجھے صرف جیت جانے کا جنون تھا جان چھڑانے کی چاہ۔ میں بھول گیا میں کتنی پستی میں اتر گیا ہوں کیسی ذلت کو آواز دے لی ہے۔

عائزہ کا زرد چہرہ اس الزام پر لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ اس نے ایک دم سختی سے آنکھیں بھیج لیں اتنی سختی سے کہ پھر وہ آنکھیں کبھی کھل ہی نہ سکیں۔

وہ بہت انا پرست تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک ماما کی اتنی محبت لاڈ پیار کے باوجود اس نے کبھی ماما سے خود سے کسی چیز کا تقاضا کیا نہ کبھی کوئی فرمائش وہ ہمارے گھر کا ایک خاموش کردار تھی۔ ماما کی شدید خواہش تھی کبھی وہ اپنے منہ سے ان سے کوئی فرمائش

کرے مگر ان کی یہ خواہش خواہش ہی رہی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ اس روز میں یونیورسٹی سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہ تھی تب وہ میرے کمرے میں تھی شاید ڈسٹنگ کر رہی تھی۔ جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو اس کے ہاتھ میں میری وہ تصویر تھی جو ہر دم میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دھری رہتی تھی۔ میں بہت خوبصورت نہیں تھا مگر پرکشش ضرور تھا مگر اس وقت میری تصویر کو اپنے آپکل سے صاف کرتے اس کی نگاہوں میں جو جذبے تھے۔ وہ صاف گواہی دیتے تھے کہ وہ مجھے اپنی زندگی میں کوئی خاص مقام دے چکی ہے۔

یہ بات مجھے آگ لگا دینے کو کافی تھی اگر کہا جائے کہ اس حد تک جا کر اسے ذلیل کرنے کا منصوبہ بھی میں نے اسی باعث بنایا تھا کہ میں اسے جتلاتا چاہتا تھا کہ میرے نزدیک اس کی اہمیت کیا ہے گوکہ اس ایک واقعہ کے بعد اس کی کسی حرکت سے بھی مجھے ایسی کوئی بھٹک نہیں پڑی تھی۔

میں نے بتایا نہ وہ بہت انا پرست باوقار اور خوددار قسم کی لڑکی تھی اور ایسے لوگ محبت اور عزت میں سے ہمیشہ انا اور عزت نفس کا ہی انتخاب کیا کرتے ہیں۔ میری اس الزام تراشی کے بعد یقیناً وہ خود سے بھی نظریں ملانے کے لائق نہیں رہی تھی جب ہی تو اس کے دل نے مزید دھڑکنے سے انکار کر دیا تھا۔

”وہ بہت تھوڑی عمر لکھوا کر لائی تھی تب ہی جلدی چلی گئی۔“ میں یہی کہہ سکتا تھا۔

ماما کو تو گویا سکتہ ہو گیا تھا انہیں شاید اس کی موت کا یقین نہیں آتا تھا یقین تو مجھے بھی نہیں آتا تھا۔ کتنی آسانی سے وہ میرے سارے راستے صاف اور آسان کر گئی تھی۔

منظر اس کا جنازہ اٹھنے پر بہت کر لایا تھا۔ بہت شدتوں سے رویا تھا مگر ماما کا سکتہ تب بھی نہ ٹوٹا۔ برسہ دینے کو آئے لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دن بہت آہستگی سے رنگ رنگ کر بیٹھ رہا۔ مگر ماما کی چپ تھی کہ ٹوٹی نہ تھی اور میں انتظار

میں تھا کہ ماما اس صدمے سے نکلیں تو میں ان سے بینش کے لیے بات کروں۔ اس نے الگ میری جان کھائی ہوئی تھی کہ میں اپنی ماما کو اس کے گھر پر پوزل دے کر بھیجوں مگر ایسی چویش میں میں ماما سے بات کرتے ہچکچاہٹ کا شکار تھا مگر اس وقت میں ششدر رہ گیا تھا جب ماما نے خود مجھ سے اس موضوع پر بات کی۔

”جس لڑکی سے تم شادی کرنا چاہتے ہو ایزہ! مجھے کل اس کے گھر لے چلا۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا ماما کہ میں کسی لڑکی میں انٹرنسٹڈ ہوں؟“

میں نے ایک احمقانہ سوال کر دیا تھا۔ ماما نے سوچے ہوئے پوئے اٹھا کر مجھے گہری یاسیت سے دیکھا تھا پھر آہ بھر کے بولیں۔

”اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہیں عائزہ کے ساتھ اس طرح کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔“

ماما کی بات نے گویا مجھے زمین میں گاڑ دیا۔ مجھے لگا

کمرے کی چھت کا طبع میرے اوپر آگرا ہے اور میرا دم گھٹ رہا ہے۔ شاید جب جرم عیاں ہوتا ہے تو ایسی ہی کیفیات ہوتی ہیں۔ میں فتن چرائیے مگر مگر ماما کو تکتا رہ گیا جبکہ وہ مزید گویا ہو میں تو ان کا لہجہ بھی آنکھوں کے ساتھ ساتھ بھر آیا تھا۔

”تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک بار کہہ دیتے۔ اسے یوں اس کی نگاہوں میں تو معتبہ نہ کرتے کہ وہ جینے سے ہی انکاری ہو جاتی۔“

اور ماما جو اس کی میت کے سامنے بھی نہیں روئی تھیں اس وقت رو پڑیں جانے کتنا گرا صدمہ تھا ان کے اندر کہ ان کے آنسوؤں کے آگے بند باندھتے میں ہارنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا میری معافی بھی ان کے زخم نہیں بھر سکتی پھر بھی میں نے ان سے معافی مانگی تھی۔ وہ اور شدتوں سے رونے لگی تھیں۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا ایزہ! وہ واپس نہیں آسکتی۔ روز محشر میں اپنے بھائی اور بھانج کے سامنے شرمندہ

ہونے سے نہیں بچ سکتی۔ تم نے مجھے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔ کاش میں نے اپنے دل کی خواہش تم پر ظاہر نہ کی ہوتی۔ کاش تم یہ گناہ نہ کرتے شاید عائزہ زندہ رہ جاتی۔“

ان کی زندگی میں کتنے طال در آئے تھے میری وجہ سے۔

پھر میری شادی ہو گئی بینش سے ہی اور شروع شروع میں خوش بھی رہا۔ سال بعد ماما بھی عائزہ کے عم کو گلے لگائے اسی کے پاس چلی گئیں اور تب گویا میرے برے دن شروع ہو گئے۔

بینش — میری جائیداد اور پیسے کو وہ بے دریغ لٹاتی تھی۔ صحیح معنوں میں شاہی خرچ تھے اس کے بلکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کبھی کبھار مجھے لگتا وہ ان ساری خواہشوں اور حسرتوں کو پورا کر رہی ہے جو کبھی پوری ہوئی ہی نہ تھیں۔ یہ اس کے دونوں ہاتھوں سے لٹانے کی ہی وجہ تھی کہ میرے پُرکھوں کی زمین چند سالوں میں بک گئی۔ کہتے ہیں نا بیٹھ کر کھانے سے تو خزانے خالی ہو جایا کرتے ہیں میرے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ مجھ سے دور ہونے لگا۔ پہلے سکون پھر دولت بھی۔

تایا جی کے سمجھانے کا مجھ پر کیا اثر ہونا تھا۔ ساری جائیداد ختم ہو گئی حالات ایسے ہوئے کہ مجھے نوکری کرنا پڑی۔ بیوی کے ساتھ ساتھ مجھے باس کی بھی جھڑکیاں کھاتے کبھی خیال نہ آیا۔ یہ ذلت میری اپنی خریدی ہوئی ہے یہ واقعی مکافات عمل ہے کہ وہ بے حد نازک بے حد مصفا لڑکی چاہے جتنی بھی صابرو شاکر رہی ہو مگر اس کا خدا تو مختص ہے ایسا مختص جو سارے حساب رکھتا ہے۔



دلِ شکر کا گلیا

”اس بار تو آپ نے ہیرا ڈھونڈ نکالا تھا۔ کوہ نور۔۔۔ یہ اپنی ملکہ کے تاج سے زیادہ آب و تاب رکھنے والا۔ خیرہ کر دیا آنکھوں کو۔۔۔ مگر۔“

”یہ دو ماہ پاکستان میں رہ کر جناب کی اردو بہت اچھی نہیں ہو گئی۔“

”یہ اس حسنِ سادہ“ او اس آنکھوں اور مسکراتے لبوں کا کرشمہ ہے، بندہ خود بخود شاعر ہو جائے۔۔۔ غزل کے۔۔۔ نظم سنائے۔۔۔ اور کچھ نہ کہے تو قیس کی طرح جنگلوں میں نکل جائے۔“

”وہ اتنی کنوں والی تحریک غزل اور موجد نظم۔۔۔ پھر ساتھ کیوں نہ آئیں۔۔۔ تم تو خود ہی برتن دھوئے پائے گئے ہو۔“ وہ بول کر دوا، اٹھا کر حمار اطراف دیکھنے لگا

”یار! عورت صرف پاکستانی ہوتی ہے۔ اب کی بار صرف پاکستانی۔ لاسٹ چوائس۔“

ندیم نے قطعیت سے کہا، حال ہی میں وہ دو ماہ پاکستان رہ کر آیا تھا۔ اس نے یہاں شادی کی تھی۔ دو بچے بھی تھے لیکن بیوی کو وہ زمانے پہلے فارغ کر چکا تھا۔ بلکہ فارغ کیا وہ خود ہی ایک روز غائب ہو گئی تھی۔ اب ہر جگہ جائز ناجائز منہ مارنے کے بعد وہ یہی فتویٰ دیتا تھا۔

”تو پھر پاکستان سے ہی کوئی لے آتے۔ یا ملی نہیں کوئی۔“ وہ پھلی کا قلعہ اٹھاتے ہوئے ہنسا۔

”نہیں یار۔۔۔!“ وہ کشن پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے ناامید ہوا۔

مکمل تافل



جیسے وہ کسی نیل دیواریا چکھے ریٹھی نظر آئے گی۔
 ”یہی تو ہو نہیں سکا۔ لیکن میں آپ سے کہہ آیا
 ہوں۔ مجھے وہی چاہیے۔“
 ”اور آپ نے کہا ہو گا کیوں نہیں میرے چاند۔
 ابھی لو۔“

”یار ابھی لو والی بات۔ ہو ہی نہیں سکتی۔“ ندیم
 کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ”تھو میں تمہیں پکچرز
 دکھاتا ہوں نمودی بھی ہے۔ پھر کہنا میں ایسے ہی شاعر
 نہیں ہوا۔“

وہ بیڈ روم کی جانب بڑھا تو اس نے پرسکون ہو کر زیر
 پھیلا لیے۔ وہ اس کا نو سال پرانا دوست تھا۔ یہ کراچی
 سے آیا تھا اور وہ حیدر آباد سے تعلق رکھتا تھا۔ دو بیٹے
 تھے بالترتیب پندرہ چودہ برس کے۔ اس کی زندگی میں
 اس وقت قانونی طور پر ہر حال کوئی عورت نہیں تھی۔
 بیشتر ایشیائی باشندوں کی طرح ہر جگہ سے خواری
 اٹھانے کے بعد اب واحد چوائس اماں کی پسند رہ گئی
 تھی۔ وہ کہہ کر گیا تھا۔ آپ نے اس کے لیے لڑکی پسند کر
 لی ہے۔ چونتیس پینتیس برس کی کنواری خوب
 صورت بڑھی لکھی خاندانی۔ ندیم کے خاندان میں
 اس بار شادیوں کے حوالے سے بہت بڑا میلہ لگا تھا۔
 ندیم نے وہیں اسے اس کی بے خبری میں دیکھا۔ وہ لٹو
 ہو گیا تھا۔ لیکن ہوا کیا۔

ندیم کے ہاتھ میں البمز تھے اور لیپ ٹاپ۔ وہ
 ٹھوٹے ہاتھ پوچھتا سیدھا ہوا اسے ایکسٹرنل ہونے
 لگی تھی۔

ماپوں مہندی بارات اور ولیمہ کی تقریبات کی
 پروفیشنل فوٹو گرافر کی عکس بندی تھی۔ وہ ہر تصویر کو
 بہت خوشی سے بغور دیکھ رہا تھا۔ رنگ برنگتا ہوا
 شامیانہ اور خوب صورت شوخ مشرقی رنگ۔ وہ کسی
 بھی چہرے کو نہیں کھوج رہا تھا۔ بس رنگوں کو دل میں
 اتار رہا تھا۔ اسکاٹ لینڈ جیسے نجوس شہر میں رہتے اس کا
 دل بھی سکڑ گیا تھا۔

ندیم اس کی کیفیت سے بے پروا تیزی سے

تصویریں بڑھا رہا تھا۔
 ”یہ۔ یہ۔ دیکھو۔“ اس کی نظروں نے بہت
 اشتیاق سے انگلی کے نیچے دیکھا تھا اور زمین اپنی
 گردش سے رک گئی تھی۔
 گرتے جھرنے اچانک جیسے برف کی طرح جہاں کے
 تہاں جم گئے۔

گھڑی کی سوئیاں تھم گئیں۔ مگروقت نہیں رکھتا۔
 وہ تیرہ سال آگے بڑھ چکا تھا۔
 اسے لگا اس کا دل دھڑکننا بھول گیا ہے لیکن نہیں
 ۔۔۔ وہ ایک پل کو رک کر اب اس کے حلق میں اٹک
 گیا تھا۔

اس کا دل ندیم کی انگلی کے نیچے تھا اور انگلی کا یہ بوجھ
 سینے پر دھری سل کی طرح تھا۔ وہ قطعاً ”فراموش کر چکا
 تھا۔ آج انگلی کا بوجھ ناقابل برداشت تھا۔ کل اس نے
 خود ہی تو اس دل پر پیر رکھ دیا تھا۔ آگے بڑھ گیا تھا۔
 ندیم بہت اشتیاق اور خیرہ انداز میں اپنی مدح
 سرائی کی تصدیق چاہتا تھا۔

یہ پل دیکھنے سے پہلے کیا ہی اچھا ہوتا وہ مینائی کھورتا
 ۔۔۔ یا چلو۔ گویائی چھن جائے۔
 ”بہت اچھی۔ بہت اچھی ہے۔“ اس کے منہ
 سے نکلا۔

”مل۔ ملی کیوں نہیں۔ کیا میرا ہے؟“ جو سوال
 دل و دماغ پر ضربیں مار رہے تھے۔ اس نے ان کا لٹ
 ہی پوچھا۔

”ہاں۔ ناں۔ پندرہ سال ہو گئے یار۔ لگتی
 نہیں ہے ناں۔؟“

وہ نشانے پر کھڑا تھا اور اس پر تیرہ برسائے جا رہے
 تھے۔ سر آٹکھیں کمال ناک جگہ جگہ تیر گڑے تھے۔
 ”ساڑھی شادی کے بعد۔“

”چھا چلو بس ایک بار پس کرو کھا دو پلیز!“
 ”ساڑھی پہنتے نہیں ہیں باندھتے ہیں۔“ وہ
 کھکھلائی تھی۔

”جملے نہیں پکڑو۔ جو کہتا ہوں وہ شرافت سے

مان لو۔“
 ”تھوڑا صبر کریں ناں۔۔۔ شادی کے بعد پہنوں گی
 ہر روز۔۔۔ آپ تنگ ہو جائیں گے۔“
 ”نہیں ہوں گا شادی کے بعد پہلی بارش میں بھگتے
 ہوئے جب میں تمہاری کمر میں ہاتھ ڈال کر گاؤں گا۔
 بادل یوں گر رہا ہے ڈر کچھ ایسا لگتا ہے۔ دھڑام۔
 اور تم ڈر کر میرے سینے میں منہ چھپالو گی۔ تب
 تم سرخ ساڑھی میں ہو گی۔“
 ”آپ کی ہر بات گانے پر کیوں ٹوٹی ہے؟“
 ”دراصل جب بھی کوئی فلم دیکھتا ہوں رومانٹک
 سونگ تو ہیرو کی جگہ خود کو اور ہیروئن تم میں بدل جاتی
 ہے۔“

”فلم میں ٹھیک سونگز بھی ہوتے ہیں۔“
 ”میں اپنی زندگی کی فلم میں کوئی ٹریجڈی نہیں آنے
 دوں گا۔“

ہلکی سرخی ساڑھی پر فلیپرک پینٹنگ کے گلابی
 پرل والے چمکیلے پھول بہت فاصلے سے موجود تھے۔ پلو
 البتہ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ گلابی بند کالر کا بلاؤز پہنے
 گھڑی کا اسٹریپ بند کر رہی تھی۔

تو گویا وہ شادی کر چکی۔ وہ کسی کی دہی تھی۔ اس
 نے کچھ دھیان آنے پر تصویریں پلٹیں مگر اس کے ہاتھ
 ابھی بھی چوڑیوں سے خالی تھے بے حد سونے۔

”چوڑیاں کیسے پہنتی وہ تو آپ ولائیں گے۔“
 تو کیا اس کا شوہر چوڑیاں نہیں لے کر دیتا یا پھر وہ
 اب بھی۔۔۔ نہیں نہیں۔

”جب میرا ہے تو تم نے تصویریں کیوں رکھیں؟“
 اس کا لہجہ ٹھنڈا برف تھا۔

”ارے کہہ کر آیا ہوں آپاے۔ عقل دیں اسے
 ۔۔۔ جان چھڑائے ایسے نام نہاد شوہر سے۔“ ندیم نے
 حقارت سے کہا تھا۔

”پاگل تو نہیں ہو گئے وہ اپنا شوہر کیوں چھوڑے؟“
 وہ بھونچکا رہ گیا۔

”ارے نکاح ہوا ہے۔ رخصتی نہیں ہوئی۔ میں

بائیس برس کی عمر میں نکاح ہوا تھا بیچ میں خاندانی
 چپقلش آگئی تو اگلا غصے میں طلاق دے کر غائب ہو گیا۔
 تیرہ چودہ برس سے غائب ہے۔ یہ بیٹھی ہے اس کے نام
 پر۔۔۔“
 ”تو جب مطلقہ ہے تو تمہارے لیے کیا رکاوٹ ہے؟“
 وہ الجھ گیا۔

”ارے یار طلاق باضابطہ طور پر نہیں دی ناں۔۔۔
 ایک بار ہی علیحدگی کے الفاظ استعمال کیے۔ ابھی تک
 اس کی بیوی ہے۔ نکاح پر نکاح کرے گی کیا؟
 میں نے کہا ہے آپاے۔ تمہارے لیے چیلنج ہے
 اسے قائل کرو کہ زندگی برباد نہ کرے۔ عدالت سے
 رجوع کرے تو دونوں میں فیصلہ مل جائے گا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
 بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم

ننگے پاؤں

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی

”تو آیا قابل کیوں کریں۔ وہ اتنے سال سے کیوں بیٹھی ہے؟“ اس کا دل غمگین رہا تھا۔

”یار! ندیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”یہ تو ہے مشرقی عورت جو دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ جوانی کے خوب صورت سال برباد کر دیے۔ مگر ابھی اس کا بگڑا ہی کیا ہے۔ مذہب کی اجازت بھی ہے مگر مشرقی عورت کا دل اللہ نے نجانے کس چیز سے ڈھالا ہے اپنی وفا کے معاملے میں بہت ہٹ دھرم ہوتی ہے۔ ایک مروت کا منہ دیکھا اب قبر کا منہ۔ بس۔“ وہ ستائشی انداز میں کہہ رہا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے۔ یہ آج بھی اسی شخص کی پیروی ہے۔ اس کا انتظار کر رہی ہے۔“ اس کی آواز زور سے گونجنے لگی۔

”تو اور کیا۔ ورنہ مجھے آج تک کسی نے انکار کیا ہے۔“ ندیم کا لہجہ زعم سے بھرپور تھا۔

”لیکن عید کارڈز ابھی سے کیوں؟ ابھی تو رمضان ہی شروع نہیں ہوئے۔“ تمکنت بیگ نے خوب صورت گلابی لفافے کو حیرت سے اٹتے پلٹتے سوالیہ نگاہوں سے مہدی کو اور پھر پوری کلاس کو دیکھا۔

”بیچر! اس بار ہم رمضان میں کب مل سکیں گے پورا جون اسکول آئیں گے اور جولائی اگست میں چھٹیاں تو عید گریٹنگ کارڈ کیا عید گزرنے کے بعد دیتے؟“

وہ گلابی لفافے کو بصد احتیاط کھول رہی تھی۔

سرخ گتے پر گلابی پھولوں کے گچھے سے تھے خوشبو شاید پر فوم کی تھی۔

عید کا دن اور آپ کی یاد جیسے بنا گوشت کے دھوکا کباب تمکنت نے ہنس ضبط کی۔

”خدا آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔“

تمکنت کے دل پر گھونسا سا راد ایسی ہزاروں عیدیں۔۔۔؟“ بے رنگ، خالی کلائیوں اور سونے ہاتھوں والی۔ آنسوؤں سے دھلے چہرے۔۔۔ کے ساتھ ہر دستک پر امید بھری نگاہوں سے کواڑ دیکھنا اور ناکام پلٹتی نظروں کا دکھ۔

تیرہ سال میں چھبیس عیدیں۔۔۔ اور چھبیس چاند راتیں؟؟؟

عذاب راتیں اور ایسی ہزاروں عیدیں۔۔۔؟؟؟

اس کا دل کسی شے میں تھا دھیرے دھیرے ٹکڑے ہو کر گرنا پھلتا۔

”آپ نے یہ کیوں لکھا عمران؟ خدا آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ کیا پتا میں ایسی عید نہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اس کا خود پر ضبط کمال تھا مگر آواز کی معمولی سی لڑکھاہٹ بچوں کو حق دق کر گئی۔

عمران بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ وہ کیا جواب دے۔

”ایسے نہیں لکھتے بیٹا!“ اس کا لہجہ تھکان زدہ تھا۔

یوں لکھتے ہیں۔ خدا آپ کو خوشیوں بھری مسرتوں سے لبریز ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ خالی ایسی عیدیں لکھنا تو بد دعا کی طرح بھی ہو سکتا ہے۔“ اس کی آواز اندھم ہو گئی۔

”سوری بیچر۔۔۔“ عمران کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

”میں آئندہ ایسے ہی لکھوں گا۔“

ہو سکتا ہے یہ عید۔ ایسی عید کسی کے لیے بے حد عذاب ناک ہو، تکلیف دہ اور وہ سوچتا ہو کہ سب کچھ ہو مگر عید کا دن کبھی طلوع نہ ہو کبھی۔

”س۔۔۔ سوری بیچر ہٹ ہم سب کے کارڈ پر یہ ورڈ تو لازمی لکھا ہوا ہے۔ آپ کارڈ واپس دے دیں۔ ہم نئے کارڈز لائیں گے۔“ مانیٹر شا پوری کلاس کی ترجمان تھی گویا۔

اس اوکے بیٹا۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آپ سب کی محبت پر یقین ہے۔ اتنے پیارے اتنے سارے بچے مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ یہ کارڈ تو ثبوت ہیں ناں اب مزید کوئی لفظ نہیں

آپ بکس کھولیں۔“

وہ دوبارہ گھوم گئی۔

”ٹھیک ہے بیچر۔“ شا کی آواز ابھری۔ آپ کارڈز مت واپس کریں۔ ہٹ ہم سب لوگ پورے رمضان میں روزہ رکھ کر ہر نماز کے بعد دعا کریں گے کہ اللہ آپ کو۔۔۔ چلو سب بولو۔“ اس نے کلاس کو ڈنکا۔

”اللہ آپ کو خوشیوں بھری۔۔۔ اور مسرتوں سے لبریز ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ آمین۔“

تمکنت گرنٹ کھائے انداز میں پلٹی۔ بچوں کے چہرے پر شرمندگی ہر اس اور۔ اور دعا کی کامیابی کا یقین تھا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکا گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ پھر یکدم شرم گیا۔ پرسکون ہو گیا۔

ایک دم پرسکون۔

وہ گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھی تھی۔

وہ تیرہ سال سے سینہ تان کر ایک محاذ پر اکیلی کھڑی تھی۔ اس کی ہٹ دھرمی پر اسے کونے والے ناکامی کی پیش گوئی کرنے والے بہت تھے۔

کبھی کسی نے کامیابی کے لیے دعا نہیں دی تھی اور اب اچانک اتنی معصوم پاکیزہ فرشتوں جیسی دعا کیا وہ جیت جائے گی؟؟؟

رنگ برنگی جھلک کرتی ڈھیروں چوڑوں کو دیکھ کر حرا، حنا کا دل لپکا رہا تھا۔

”جی خالہ! سب ایک سے بڑھ کر ایک ڈیزائن ہیں اور سیٹ بھی آفت۔ بہت اچھے منگے والے کڑے ہیں۔ لگتا ہے تمام بچوں نے باقاعدہ پلاننگ سے شاپنگ کی ہے سب ڈیزائن ایک دوسرے سے منفرد۔ کلر بھی ڈفرنٹ اور یہ کڑے تو بہت پیارے ہیں۔“

وہ خاموش بیٹھی تھی۔ وہ پندرہ سولہ برس کی نو عمر لڑکیاں تھیں اور اتنے دیکھنے کے کھلے رنگوں کو دیکھ کر جوش میں آکر بولتی جا رہی تھیں۔

”خالہ! ویسے یہ حیران کن ہے۔ حنا نے اسے چھو کر متوجہ کیا۔“ پہلے تو اسکول والے پریشن ہی نہیں دیتے تھے کہ بیچر بچوں سے کچھ بھی لیں۔ گفت یا کچھ اور اب کیا اصول بدل گیا۔۔۔؟“

”نہیں اصول تو وہی ہیں۔“ تمکنت نارمل گفتگو کر کے خود کو حال میں رکھنا چاہ رہی تھی خاموشی اسے ماضی میں دھکیل دیتی تھی۔ جہاں فقط منہ کے بل گر جانے کے بعد کی ٹیپسی اور جوش تھیں۔

”بچے بھی جانتے ہیں بیچر کچھ نہیں لے سکتیں۔ اس لیے آج لاسٹ ڈے پر جتھابنا کر گھر تک آگئیں اور ضد کر کے بلکہ خفا ہو کر یہاں چھوڑ گئیں۔ عید گفت کے طور پر۔ اب واپس کیسے ہو۔“ وہ بدقت مسکرائی۔

”اور ہیں ناں آپ سب کی موسٹ فیورٹ بیچر۔“ حنا کا انداز تقاخر سے بھرپور تھا حرا نے ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ بیچھی مسکراہٹ سے انہیں دیکھتی رہی۔

”ایسا کرو۔۔۔ یہ سب تم لوگ یہاں سے لے جاؤ۔ برابر بانٹ لو۔ اپنی امی کو بھی دو اور اپنی کزنز اور فرینڈز کے لیے بھی اس بار انہی میں سے گفت و نہا۔“

دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ساری ہم لے لیں۔ تو آپ کیا رکھیں گی؟ ہم نے تعریف اس لیے تو نہیں کی تھی کہ۔“

اس کے چہرے پر شرمندگی آگئی۔

”ارے نہیں!“ تمکنت اٹھ بیٹھی میں بہت محبت اور خوشی سے دے رہی ہوں بیٹا۔ اور میں کب پہنتی ہوں یہ چوڑیاں کڑے۔“ اس نے اپنی دونوں کلائیوں ان کے سامنے کر دیں۔

”کبھی دیکھا ہے مجھے۔ اتنے سالوں میں۔؟“

”خبر نہیں ہے انہوں نے جوگ لے رکھا ہے نہ چوڑیاں کھنکھنا میں گی نہ سنگھار کریں گی۔ ہونہ۔“

آپ کا دل جلا جملہ ان کے اندر کی آگ کا مظہر تھا اور اسے آگ لگا رہا تھا۔

”نہ سہاگن نہ ابھراگن۔ کنواری بھی نہیں ہیں۔“

شادی شدہ بھی نہیں۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ اور
بہن تیرہ کی بھی خوب رہی۔ چلو یہ سال گزرے تو
چودہ پورے۔

وہ جائے نماز تہہ کرتی آ رہی تھیں۔ بولتے بولتے
صوفے میں دھنس گئیں۔

عموماً اس موضوع پر سرعام گفتگو نہیں ہوا کرتی
تھی اور انہیں بچیوں کی موجودگی کا خیال رہا کرتا تھا۔ مگر
رنگین چوڑیوں کا ڈھیر بچیوں کا اصرار اور تمکنت کا
انکار۔

”آپا پلینز۔۔۔“ تمکنت کا دل پھل کر آنسوؤں کی
شکل میں بننے لگا۔

”تمکنت بیوگی کاٹ رہی ہوتی ناں تو دو سرائی نکاح
پڑھا دیتی جبراً ہی سی۔“ آپا کا لہجہ تھکن زدہ تھا۔
”آپا۔۔۔!“ تمکنت ششدر رہ گئی۔ آری کے
وانے لکڑی کو کیسے کاٹتے ہیں اس نے اس احساس کو
ابھی ابھی اپنے دل پر جھیلایا تھا۔

”بد دعا تو مت دیں۔“

”تمہیں دعا اور بد دعا کے فرق کا کیا پتا تمکنت!
لوگ مصلے بچھا اور وضو کر کے دعا کے لیے ہاتھ
اٹھاتے ہیں مجھے لگتا ہے میں کسی دن ایسا اہتمام کسی
بد دعا کے لیے کرنے نہ بیٹھ جاؤں۔“ ان کے لہجے کا مظنہ
ٹوٹ گیا۔ تمکنت کا سر جھک گیا۔

”آٹھ سال تک عتاب شوہر کے پیچھے نکاح کی
اجازت مل جاتی ہے تمکنت!“

”پر یہاں اجازت کون مانگ رہا ہے؟“

وہ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے ڈھیلی ہو گئی۔
اس کے انداز میں آنے والی طمانیت آپا کو ہارنے پر
مجبور کر دیتی تھی۔

”اور وہ عتاب بھی نہیں۔ سب جانتے ہیں وہ
کہاں ہیں۔“

”تو گریبان سے پکڑ کر پوچھتی کیوں نہیں کب تک
سزا کاٹنی ہے ناکرہ جرم کی۔“

”تیرہ سال پہلے نہ بتلایا تو اب کون سی قسم دے کر
پوچھوں اور جرم بھی معلوم ہے آپا۔“ اس جیسی

کہا گیا۔ وہ پوری دیکھ چکھنے کو پاگل بن کر رہے
تھے۔ مثال تو درست تھی۔ شریک کار نہیں تھی پھر
بھی قصور وار کسی گئی۔ وہ انسانوں کا سبایا میدان حشر
تھا۔ کچھ کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں۔ کچھ کا بائیں
بھگدڑ کا عالم تھا میرا کہیں گر گیا۔ فیصلہ کرنے
والے نے نسب کی بنیاد پر مجھ سے پہلے والے کو جو کچھ
کہا وہی سب میرے لیے بھی۔ ”الفت فیروز بیگ
اور تمکنت جلال بیگ۔ دفعہ اتنی۔ سزا اتنی کہانی ختم
۔۔۔“

وہ جملہ مکمل کر کے خود پر ہنسی تھی۔

”وہ تو عیش کر رہا ہو گا۔ گھر بار بیا کر زندگی آگے
بڑھالی ہوگی۔ تمہارا بن باس کب ختم ہو گا؟ تیرہ سال
بہت ہوتے ہیں چیلنج قبول کرنے کے لیے۔ جا کر بتا
دے ایک بار کہ تو اس جیسی نہیں تھی۔ نہیں ہے۔

اب کیا بچا ہے آج 35 کی ہے اور اٹھائیس کی
دھکتی ہے کل 40 کی ہوگی اور پچاس کی لگے گی۔
تب سینہ نان کر سر خرونی بتانے جائے گی تو تمغہ لگانے
کے لیے شانے سیدھے نہ ہوں گے۔ زندگی سے ضد
باندھ لی تمکنت جلال! نام دیکھو تمکنت جلال۔۔۔ اور
کیا خوب مٹی پلید ہوئی۔ حق با۔۔۔“

آپا سچ کو منہ نہیں بند کر کے اے سی سے زیادہ
ٹھنڈی سائیس بھر رہی تھیں۔

”غلط کہہ رہی ہیں آپا۔۔۔“ اس کے لبوں پر زخمی
مسکراہٹ آرکی۔

”ابھی شانے بھی سیدھے ہیں اور آئینے کا جھن کر
مزا آتا ہے۔ میں اس کا سامنا تب کروں گی جب وہ ہوا
کرنا بھی چاہے تو کوئی راہ نہ ہو۔ ابھی تو واپسی کے
سارے راستے روشن ہیں۔ اس نے مجھے جانے پر کھے
بنامیری ذات کا ہر پہلو کسی دوسرے سے منسوب کر دیا
تھا۔

اس کی ساری باتیں غلط تھیں۔ میں یہ ثابت
کرنے کے لیے زندہ رہوں گی۔ مگر اس کی ایک بات سچ
ہے۔ میری اور ”ان“ کی ضد خون ہی کے ذریعے ایک
جیسی ہے۔ مجھے تو اپنے نام کی بھی لاج رکھنی ہے۔

ٹوٹ جاؤں گی پر جھکوں گی نہیں۔“
”ٹوٹی لکڑی کس کام کی تمکنت۔۔۔؟“
”تو جھکی ہوئی بھی تو تھو کروں کی زد میں ہوتی ہے۔“

اس نے کہا۔
”زندگی ضائع کرنے کے لیے نہیں دی گئی۔“ آپا کا
متاسف جملہ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ لے
آیا۔

”ضائع نہیں کر رہی آپا۔ ثابت کر رہی ہوں۔ پتا
ہے اب درمیان میں کچھ نہیں رہا۔ اتنے سال گزر گئے
نہ ظلم یاد ہے نہ مظلومیت نہ منصف کی صورت آشنا
نہ مجرم سے کوئی قربت۔ اب تو بس ایک جملہ ہے۔
”یہ کون سی دودھ سے دھلی ہوگی ایسی ہی نکلے گی۔
دیکھتا ہوں تم کتنی اچھی ہو۔ اور کتنی الگ۔“

”آج بے تحاشا تھک گئیں۔ کام بھی تو بہت
زیادہ تھا۔ مگر ذائقہ لا جواب۔ انگلیاں چاٹ لینے کو
دل کر رہا تھا۔“ افضل سعید نے اس کے عکس کو دل
میں اتارتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

”تو چاٹ لیتے۔ کسی نے روکا تھا؟“ وہ ناک چڑھا کر
بولی۔

وہ ہری لال مرچ لگ رہی تھی۔ پنڈلیوں پر کسا ہوا
سرخ چوڑی دار پاجامہ، پیر میں انگوٹھے والی چپل۔ سبز
قمیص، سرخ دوپٹا جو گونے لپے سے سجا تھا۔ وہ سنگھار
میز کے سامنے اسٹول پر بیٹھی خود کا ہر پہلو سے ناقدانہ
جائزہ لے رہی تھی۔ تبھی سونے کے جڑاؤ گلو بند کو
گھمائی۔ شہادت کی انگلی سے جھمکے کی کٹوری کو ہلکا
چھوئی اور آئینے میں بھل مل کار قص دیکھتی۔

”میں پکانے والی کی انگلیوں کی بات کر رہا ہوں۔ آؤ
ذرا ادھر۔“

الفت نے آئینے سے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھائی۔
سفید ملائم لان کے۔۔۔ کرناشلوار میں پشت پر
تنگیوں کا ڈھیر لگائے افضل سعید لمبی سی ٹانگوں کی چٹنی
بنائے بہت آرام دہ حالت میں اسے مسلسل دیکھتے

ہوئے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔
”یاد رکھیے۔۔۔ میں بے تحاشا تھکی ہوئی ہوں۔
چائے ختم کریں اور کلمہ پڑھ کر سو جائیں۔“

”یار۔ چار چار مددگار تھے تمہارے ساتھ بی بی
نسیم اور چھوٹو اور آج تو ان کی چھوٹی بچیاں بھی تو تھیں
ناں۔ تم تو خالی سپروژن کرتی رہیں۔“

وہ گھر میں ہوتے تھے۔ تو ساری توجہ الفت کے
اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے پر غیر ارادی طور پر رہتی تھی اور
یہ سب لاشعوری ہوتا۔

الفت چڑ جاتی۔ ”ایسے کھا جانے والی نظروں سے
گھورتے ہیں سیدھے پڑتے پیر بھی اٹھتے ہو جائیں۔
ہاتھوں سے چیزیں پھسل جاتی ہیں۔ میں گھر میں برقعہ
پہن کر کام کیا کروں گی۔“

”ظالم! تمہیں گھورنے اور فدا ہونے کا فرق بھی
نہیں معلوم۔ اتنی ناقد رہی نہ کیا کرو محبت کا جواب
محبت سے دینا تو تمہیں نہیں آتا۔ محبت کو محبت ہی
سمجھ لیا کرو۔“ وہ فوراً ”ٹوٹے لہجے میں شکوہ کناں
ہوتے جواب“ اس کا وہی ناک چڑھا کر ہونہ۔

”اچھا تو آج اسی لیے برآمدے میں کرسی ڈال کر
بیٹھے تھے۔ میرے کاموں پر نظر رکھنے کے لیے۔

سپروژن کرنی اتنی ہی آسان ہے تو جناب ہر روز کیوں
تھکے آتے ہیں۔ ٹھنڈے پٹکے کے نیچے بیٹھ کر منہ ہی
توہلانا ہوتا ہے ایسے نہیں ویسے۔ یہاں نہیں وہاں
۔۔۔ ہم شکایت کریں تو چار چار مددگار تھے ناں۔“

اس نے چبا چبا کر نقل اتاری۔

”اچھا۔۔۔ اچھا خفامت ہونا۔ اتنی قیامت لگ رہی
ہو۔ میں نے تو پہلے کہا۔ آج تم نے خوب کام کیا۔
تھک چکی ہو، مگر تھوڑی ہمت ہمارے لیے بچا کر
رکھتیں ناں۔“

”تو وہ کون سے میرے ابا کے ولیمہ میں آئے
تھے۔ آپ ہی کے ہوتے سوتے تھے۔ یہ بڑے بڑے
آوی۔ یہ لمبی عورتیں۔ بندے کی گردن دکھ جائے
نظر قدموں سے سفر کرتی اوپر تک پہنچنے میں ساڑھے
سات منٹ لگ جائیں۔“

وہ ہر بار ان کے تمام اہل خاندان کی دراز قاضی کے لیے انوکھے ارشادات فرماتی تھی۔

افضل سعید کو اس کی کوئی بات بری نہیں لگتی تھی۔ کوئی بھی بات۔۔۔

وہ بوٹے سے قد کی سنہری گڑیا جیسی تھی۔ وہ جب اسے بیاہ کر لائے تو خاندان میں خوب چرچا ہوا۔

”افضل سعید نے بابرہ شریف سے شادی کر لی ہے۔“

الفت نے سنا تو برا مان گئی۔ ”نہ تو میں بابرہ ہوں۔ کہہ دیں سب سے اور نہ ہی شریف۔“

”تو کیا تم بد معاش ہو؟“ وہ نئی نویلی دلہن تھی تب افضل سعید کو ٹیکا جھومر اور گھونگھٹ کے بیچ سے پھونتی دنگ آواز مزے دے گئی۔

”کوئی ایسی ویسی۔“ اس نے عملی مظاہرہ کے لیے گھونگھٹ پلٹ دیا تھا۔

”مجھے کوئی ہلکی نہ سمجھے، ایک منٹ میں جان ہتھیلی پر رکھ دیتی ہوں۔ یوں“ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر چٹکیاں بجائیں۔

”نہیں۔۔۔ آوہا منٹ بھی کافی ہے۔۔۔ بلکہ کچھ سینڈ بھی بہت ہیں۔“

افضل سعید نے حیران سہمی نگاہوں سے سر تسلیم خم کیا تھا۔ وہ کتنی خوب صورت تھی۔ بابرہ شریف والی مثال بس ایویں ہی تھی۔

وہ قیامت تھی۔ پانچ منٹ کی قیامت بھی اتنی ہولناک تباہی لا سکتی ہے۔ افضل سعید اپنے دل کو پہلو سے نکل کر اس کے قدموں میں لوٹنیاں لگاتا دیکھ کر شذر رہے۔

”اب پھر کہاں کھو گئے ہیں۔ چائے ختم کریں میں نے گرم کر کے لا کر نہیں دینی۔ میرا پنا سر پھٹ رہا ہے اور۔۔۔ اور یہ کام کرنے کی وجہ سے نہیں ہے وہ آپ لوگوں کی اسی بیاسی۔۔۔ کی وجہ سے۔۔۔“

افضل سعید نے چائے کا کپ ہونٹوں سے دور کیا۔ گھونٹ بھی نگلا اور ہنسی بھی روکی۔

”پھر وہی اسی بیاسی۔۔۔ اسی بیاسی نہیں ہوتا۔“

اسی قسمی ہوتا ہے۔“ اسیں۔۔۔ ہم، تمہیں۔۔۔ تم کے لیے ہوتا ہے۔ پانچ سال ہو گئے یار! اتنی مشکل بنا سمجھنے والی زبان نہیں ہے پنجابی۔“

”تو میں نے کب پنجابی کو برا کہا ہے۔ مگر جب آپ کے خاندان کے لوگ تیز تیز بولتے ہوئے اسی قسمی کرتے ہیں ناں تو تر اسی، پچاسی، چھیاسی تک فوراً پچھ جاتی ہوں ستاسی، اٹھاسی تو اسی۔۔۔“

وہ خاصے چڑے ہوئے انداز میں بالوں میں ٹھونکی ہوئی ہنسی کھول رہی تھی۔

افضل سعید نے اپنے فلک شکاف قہقہہ کو بمشکل روکا ساتھ کے کمرے میں بچے سو رہے تھے۔

”اوب۔۔۔ آو اب تو ہم اردو بولنے والوں کے ہاں ہوتا ہے آئیے، جالیے بیٹھے۔ آپ لوگوں کی تو گنتی پوری نہیں ہوتی۔ ہونہ۔“

افضل نے جی بھر اس کو دیکھا۔ وہ ایسے ہی انہیں چڑایا کرتی تھی۔

”مجھے باتوں میں الجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہے ناں۔۔۔ اب بس کرو اور لائٹ بند کر دو۔“

”اونہوں۔۔۔ میں نہیں کر رہی لائٹ بند۔۔۔“

آپ کو سونا ہے تو سو جائیے۔ سارا دن مصروف رہی اتنے دن پہلے سے تیاریاں کیں۔ کپڑے بنوائے ضد کر کے سونے کا سیٹ لیا۔ ایک ایک منٹ انتظار کیا کہ

کب ان سب چیزوں کو پہنوں گی اور ابھی تو میں نے خود کو جی بھر کے دیکھا نہیں کہ آج میں کیسی لگ رہی تھی اور آپ کہتے ہیں لائٹ بند کر دو۔“

اس نے ناراضی سے پوری کتھاسنائی اور صاف انکار کرتے ہوئے ان کے لہجے کی نقل اتاری۔

”تو یار آو ناں ادھر۔۔۔ میں بتاتا ہوں ناں تم کیسی لگ رہی تھیں۔ کیسی لگ رہی ہو۔“ وہ کپ سائیڈ پر رکھ کر اٹھ بیٹھے۔ ہاتھ بڑھایا کہ وہ ہاتھ تھام کر بیڈ تک آجائے۔

مگر کہاں آگے الفت تھی۔ جسے افضل سعید سے ذرا الفت نہیں تھی۔ زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر سنگھار میز کی دراز کھول کر سرخ خوں رنگ لپ اسٹک

2012 ستمبر

82

ماہنامہ شعاع

پکڑ لی۔
رات کے گیارہ بجے یہ میک اپ اتارنے کا نام تھا
مگر اس نے پہلے لب واکر کے لب اسٹک کی تہہ جمانی۔
بندھے بال کھول چکی تھی۔ پہلے سارے دائیں
جانب ڈالے۔ اونہوں۔ پھر بائیں۔ نہیں
سیدھے پیچھے جھوڑ دیے۔
”بتائیں کہاں زیادہ اچھے لگ رہے ہیں؟“
”چھوٹو۔ یار۔ یہاں۔ آجاؤ۔ میرے
بازوؤں پر بکھیر دو اس سے برہہ کراٹھے کہاں لگ سکتے
ہیں۔“
ان کا انداز اب منت بھرا سا تھا۔ کچھ ہارا۔ ہارا
سا۔
”ہاں بس۔ آپ کے یہی اٹے سیدھے مشورے
آرام سے لیٹ جائیں۔ مجھے جب سونا ہو گا تو لیٹ
جاؤں گی۔“ وہ ہٹ دھرمی سے کہتے ہوئے اب بالوں
میں برش پھیر رہی تھی۔ افضل سعید اس کے مزاج
کے سب رنگوں سے واقف تھے۔ بیڈ پر اوندھے گر
گئے۔ سر پہ تکیہ رکھ لیا۔ الفت کی گنگناہٹ مگر نمایاں
تھی۔

”پرسوں تو سب سے ملاقات ہوئی ہے الفت! سب لوگ آئے ہوئے تھے اب آج جانے کی کیا ضد؟“
انہیں پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ جب والٹ چابیاں
اور چرمی بیگ لیے غلٹ کے عالم میں کمرے سے باہر
نکلے تو وہ اسد اور احد کی ٹیڑھی مانگوں میں تیز تیز کنگھی
پھیر رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا بیگ بغل میں دبا تھا۔
”تو کیا مطلب اب ماں باپ سے ملنے کے لیے دن
اور گھنٹے گننے بیٹھ جاؤں۔ اماں باوا سے ملنے تو کبھی بھی
جایا جاسکتا ہے۔“
”میں نے یہ کب کہا الفت۔۔۔؟“ افضل نے لہجہ
حتی الامکان بر سکون رکھا۔
”لیکن اچھی اس وقت صبح سویرے۔ مجھے پہلے

ہی دیر ہو رہی ہے۔ ملاقات کے لیے کچھ لوگ آئے
بیٹھے ہوں گے۔ شام میں لے چلوں گا۔ بس۔“
”شام کا کیا مطلب۔۔۔ اب میں تیار ہو چکی ہوں۔
بچے بھی تیار ہیں۔ آپ نے کیا کرنا ہے ذرا سا گاڑی کو
گھمانا ہی تو ہے۔“
”دو بالکل مخالف راستے ہیں۔ آؤٹ آف وہ ہو
جائے گا۔ اگر ایسا ہی پروگرام تھا تو صبح سویرے کہتیں،
ہم جلدی نکل جاتے۔“
سب بے کار۔ الفت کی دائیں آنکھ مستقل پھڑک
رہی تھی۔ یہ اس کی ناگواری اور نفی کی علامت غیر
ارادی حرکت ہو کر رہی تھی۔
”نی دی دیکھو ریڈیو سن لو۔ اپنے رسالے نکال لو
میں چار بجے تک آجاؤں گا۔ اچھا بچو۔ شام میں
چلیں گے نانا بابا کے گھر۔ بول بھی پلاؤں گا اور آنس
کریم بھی۔“
وہ الفت کو ہدایت دیتے اور بچوں کو پچکارتے۔
فت کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے تیزی سے باہر
نکل گئے۔
دروازے پر آٹومٹک لاک تھا۔ زور سے بند کرنے
پر لاک لگ گیا۔
فت دروازے کو گھورتی رہی۔

”امی! جوتے اتار دیں۔۔۔“ اسد نے خود اتارنے
شروع کر دیے تھے احد بہت چھوٹا تھا۔ اسے مدد کی
ضرورت ہوتی تھی۔ الفت کا خون کھول رہا تھا۔
بچے کی پکار نے کھولتے خون کو بننے کا راستہ دیا۔
”خبردار جو جوتے اتارے غورا“ پہنوں۔ اور بیٹیں
بیٹھے رہو۔“ اس نے احد کا بازو نوچا اور اسد کو پھپھر کے
زور جو تا پہننے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اتنی ضد الفت۔۔۔!“ افضل آنگن میں پڑے
تخت پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔ الفت تنگ پانچھوں
کے گلابی شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ دوپٹا شانوں پر
نکا تھا۔ آنگن کے آدھے حصے پر برآمدے کے شیڈ کا

سایہ پڑتا اور آدھے میں دھوپ۔ احد کا چہرہ سائے میں
اور پیر دھوپ میں تھے۔ وہ بے سدھ سو رہا تھا
افت موڑھے پر بیٹھی تھی۔
اسد زمین پر بیٹھا کھلونا گاڑی کو چلا رہا تھا۔
”بیٹا! صبح سے ایسے ہی ہو۔۔۔؟“ نہیں جواب کے
اثبات کا یقین تھا مگر یونہی۔
”امی نے کپڑے نہیں بدلنے دیے اور شوز بھی
منع کر دیا۔“

”افت! اتنی احمقانہ حرکت۔۔۔ میں نے منع تو
نہیں کیا تھا۔ مگر تم وقت تو دیکھتیں۔ ٹریفک جام میں
بھنسنے کے بعد میں ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ پہنچا۔ پارٹی انتظار
کر کے نکلنے والی تھی۔ دوپہر کو بچ نہیں کیا اور تم صبح
سے اسی عالم میں بیٹھی ہو۔ تم نے کڑی دوپہر میں خود
کو اس دھوپ میں جھلسایا۔ بچوں سے کس بات کا بدلہ
۔۔۔ چھ گھنٹے سے بچہ جو گریز میں ہے انگلیاں کل
جائیں گی اور تم اپنی حالت دیکھو کپڑے نچرنے لگ
گئے ہیں۔“ وہ تاسف سے بولے۔

او خدا چلو اٹھو۔ اندر چلو۔ بے وقوف ناواں
عورت۔“

آگے برہہ کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ
ٹس سے مس نہ ہوئی تو وہ تخت کی جانب پلٹے۔ احد کو
بہت احتیاط سے اٹھایا۔ شانے سے لگا کر پشت
سہلاتے ہوئے نیم تاریک کمرے میں لے آئے
پٹکھا چلایا۔ بہت آہستگی سے جو گریز اتارے اور اپنی
صبح اتاری جانے والی بنیان جو وہیں پڑی تھی اس سے
نری سے پاؤں پونچھے۔ بشرٹ کے بن کھولے پھر اپنا
گیلا تولیہ اتارے جانے والے کپڑے اٹھائے اور تکیے
سیٹ کر کے رکھے۔

”اسد! تم اندر آؤ۔ بھائی کے ساتھ لیٹو۔“ نہیں
یاد آیا۔

”امی۔۔۔ بھی بیٹھی ہیں۔ امی کو بھی بلائیں۔“ وہ سر
اٹھا کر انہیں متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا افضل سعید
نے جھک کر اس کا ہاتھ چوما۔
”امی کو بھی لاتے ہیں۔“ وہ باہر آگئے۔

”چلو الفت اٹھو۔“ دیکھ لو ذرا اتم سارا دن ضد کے
مارے دھوپ میں خود بھی جھلسیں اور معصوم بچوں کو
بھی تکلیف دی۔ مجھ پر غصہ تھا تو یا۔۔۔ مجھ سے لڑتیں،
تم کو بچوں کا احساس نہیں۔ پر دیکھو اپنے بیٹے کو
وہیں سے کہہ رہا ہے میں کیسے آؤں میری ماں باہر
دھوپ میں بیٹھی ہے۔ میں اندر کیسے آؤں۔“
وہ موڑھا گھسیٹ کر عین اس کے سامنے بیٹھ گئے۔
”تم کو کیا لگ رہا ہے۔ تم نے خود کو اذیت دی ہے۔
یار تم لوگوں کی ایک درجہ تکلیف میرے لیے سو
درجے کی ہوتی ہے۔ کاش تم دل کے اندر جھانک کر
دیکھ لیتیں یا کسی ٹھہرا میٹر سے ماپ لیتیں کہ میں خود کو
کتنا جھلسا ہوا یا سا محسوس کر رہا ہوں۔ چلو اٹھو اندر
چلو۔ حالت دیکھو اپنی۔“

افت کی جانب سے کوئی جواب نہیں۔ نہ کوئی
حرکت۔ وہ چندیل تاسف سے اس کی صورت دیکھتے
رہے اس کی۔ گندی رنگت، سرخ ہو رہی تھی اور
پہینہ پورے جسم پر گیلہاٹ بن کر پھسل چکا تھا۔
کنپٹیوں کے پاس اور بالوں کی جڑوں کی نمی دور سے
چمکتی تھی۔ اسی کے دوپٹے کو تھام اس کے چہرہ اور
گردن پونچھی۔

”اندرا چلو الفت۔۔۔ ورنہ۔“

افت نے پہلی بار زمین پر نیکی نگاہ اٹھا کر ان کی
جانب دیکھا۔ ہلکا آسمانی کلف لگا سوٹ چڑھ گیا تھا اور
اب گرمی کے باعث بھگسا تھا۔ الفت کی نگاہوں میں
کوئی تاثر نہیں تھا۔ افضل جیسے خبر نامہ پڑھ رہے تھے۔
”میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔“ ان کا لہجہ حتی
تھا اور عمل در آمد پر آمادہ۔

افت نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں جھانکا۔
افضل نے پچکارنے کے انداز میں ٹھوڑی چھوئی۔
”اٹھو۔“ الفت ان کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے کیے پر
عمل کر سکتے تھے۔ وہ بارہا اس کی ضد سے ہار کر ایسا
کر چکے تھے۔

گہرا سانولا رنگ، اونچے لمبے تڑنگے جوڑے شانے
کھلے ہاتھ پیر۔ وہ دراز قامت شخص تھے مگر بوٹے

سے قد کی الفت کو وہ قطب مینار لگتے جب اسے گردن اٹھا کر بات کرنا پڑتی۔
اسے اپنے بونے قدر کوئی احساس کبھی نہیں تھا۔ وہ جست کپڑے جوڑی دیا جامہ پہنتی۔ ٹھیک دوپٹی اور انگوٹھے والی پہنتی۔ کھانے اور کبھی کبھار چٹل پہنتی۔ وہ اپنے حال میں مست المست بھی صرف اپنی پرواہ کرنے والی۔

اور افضل بے حد عام شکل و صورت والے دن بدن ترقی کے راستوں پہ بڑھتے کامیاب بزنس میں تھے۔ وہ شکل اور قدت جسے الفت نگاہ غلط انداز جتنی بھی اہمیت دینے کو تیار نہ تھی۔
افضل سعید کے لیے کبھی مسئلہ نہ تھا۔ وہ بے حد نرم خو محبت کرنے والے مہربان انسان تھے۔ انہیں ہر شخص سے محبت اور لگاؤ تھا۔ عزیزوں رشتے داروں دوستوں پر دوستیوں گھر میں کام کرنے والے ملازمین یا آفس کے ورکرز وہ سب کی پروا کرتے تھے سب سے محبت اور۔۔۔ الفت سے عشق۔

محبت کی انتہا عشق
اور عشق کی انتہا۔۔۔؟؟؟
ورگزر۔۔۔؟؟؟؟ پرواہ۔

”اٹھ جاؤ الفت۔۔۔ ورنہ جب تک تم یہاں بیٹھو گی میں بھی یہیں بیٹھا رہوں گا۔“
اور الفت کو قطعاً یہ فکر اور پروا نہیں تھی کہ وہ اس کی خاطر دھوپ میں جلس کے مگر اس طرح موڑھے پر بیٹھے گھٹوں پر کہنیاں ٹکا کر جب وہ اسے ٹانگی باندھ کر تار ہوتی نگاہوں سے دیوانہ وار تکتے۔ یہ اسے کبھی برداشت نہیں تھا۔ چھ سالوں میں اس نے کبھی افضل سعید کو یہ حق نہیں دیا تھا۔

اس نے ایک پل بے حد ناراضی، سرد مہری اور احسان جتنائی نگاہوں سے افضل سعید کا چہرہ دیکھا پھر اگلے پل پیر پختی اندر برہ گئی۔
مگر جانے والے موڑھے کو سیدھا کرتے افضل ٹھنڈی سانس لیتے اندر برہ۔

خود کو بے حد جسمانی اور افضل سعید کو ذہنی اذیت سے دوچار کر لینے کے بعد بھی اس کی ناراضی آسانی سے دور ٹھوڑی ہوتی تھی۔
افضل سعید من و عن اس کی مان لیتے۔ اس سے معافی مانگ لیتے اپنے کان پکڑتے یا اس کے پیچ اس نے نہیں ماننا تھا تاکہ وقتیکہ غصہ خود بخود ختم ہو جاتا وہ ایسی ہی تھی۔ اب یہ غصہ دو روز میں اتر آیا دس روز میں۔

اور ناراضی کا روپ انوکھا۔
اس نے سارا گھر سنبھالنا تھا۔ کام وغیرہ پہلے سے بہتر۔ مگر بس انہیں نظر انداز کرنا تھا۔ بات نہیں کرنی تھی۔ الگ کمرے میں سونا تھا اور گھر سے باہر قدم بھی نہ نکالنا تھا اور ایسے میں افضل کی تمام کوششیں بے کار جایا کرتیں مگر وہ اسے منانے سے باز نہیں آتے تھے۔
ناراضی میں وہ حکم کی غلام کی طرح ہو جاتی جیسے بڑی تابع ہو یا بہت مجبور وہ کس۔ چوں بھی نہ کر سکتی ہو۔
افضل اس کو بازار لے گئے پچھلے ہفتے اسے پانچ تولے کاسیٹ لے کر دیا تھا اور رات ہی کو وہ کہنے لگی کہ سیٹ کے ساتھ کڑے بھی ہوں تو مزا آجائے۔

وہ منہ سے باقاعدہ فرمائش نہیں کرتی تھی۔ مگر افضل کے لیے یہ جملہ کافی تھا۔ اسی وقت ارادہ باندھ لیا اور وہ چوکر کے پاس بیٹھے کڑے پسند کر رہے تھے خود اس لیے کہ وہ مارے بندھے بیٹھی تھی۔ پیشے کی دیواروں کو چھت کو آرائشی فانوسوں کو دائیں بائیں ہر شے کو دیکھ رہی تھی۔ سوائے نگہوں کے۔ جو تکہ اسی چوکر سے خریداری کی جاتی تھی سو وہ پہچان رہا تھا۔ افضل صاحب کی بیگم ناراض ناراض لگتی تھیں اور ایک پیسے والا آدمی تین چار تولے کے کڑے تو خرید کر دے ہی سکتا تھا۔

افضل نے اس کی مسلسل عدم توجہی سے سیزمین کی مشکل دور کی۔
”وہ جو ہم نے سیٹ بنوایا تھا اس کے ساتھ کے کڑے دے دو۔ کوئی مسئلہ ہو گا تو بعد میں دیکھ لیں گے۔“

اسد نے ماں کی انگلی تھام رکھی تھی اور احد کبھی بدلتا کبھی باپ کی گود میں چڑھ جاتا۔ افضل بچوں کے کپڑوں والی دکان میں گھس گئے۔
یہاں نہ چاہتے ہوئے غیر ارادی طور پر بھی الفت دلچسپی لینے پر مجبور ہو جایا کرتی تھی۔ سو ہی ہوا۔ وہ کپڑے نکلاتے نکلاتے بھول بھال گئی سب خفگی۔
شاپنگ کے بعد بہترین کھانا الفت کے پسندیدہ اسپاٹ۔

خفگی جی موم کی طرح ہوتی ہے توجہ کی گرانش اسے پکھلا دیتی ہے۔ اور توجہ بھی افضل سعید کے جیسی۔ تو پھر۔
”آپ کے خیال میں پیسے سے ہر شے خریدی جاسکتی ہے اور یہ دو کڑے اور یہ چند تھیلے۔ میری اس دن کی تکلیف کی بھرپائی کر سکتے ہیں۔“ وہ اپنی نرم گندی کلائیوں میں کڑے گھماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

چار تولے کے کڑے اور تین بہترین بوتیک کے کپڑے اور بچوں کی شاپنگ۔ (چند تھیلے) افضل نے سگریٹ کی رائی ایش ٹرے میں مسکی۔
”سب میری محنت اور خون پسینے کی کمائی ہے الفت! اگر اس پسینے سے بہت ارزاں جو تم نے اس دن ایک احتقانہ ضد میں بلا وجہ بہایا۔“

”آپ کو باتوں سے جیتنا آتا ہے۔“
”کیا تمہیں جیت لیا۔؟“ وہ بہت امید سے ترنت بولے تھے۔

”میری جیت یا ہا۔۔۔ میرے پاس فیصلے کا اختیار کب تھا۔“
”اور اگر ہوتا تو۔۔۔؟“

”تو کم از کم آپ کا نام نہ لیتی۔“ (اس نے ہمیشہ یہی کہا تھا)

”وہ تو خیر مجھے معلوم ہے مگر کس کا نام لیتیں یہ نہیں بتایا؟“

”کسی انسان کا۔۔۔ آپ تو جن معلوم ہوتے ہیں اتنے اونچے لمبے کالے دیو۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح کا

مخصوص جواب دیا۔
افضل اس کے جواب پر ہمیشہ محفوظ ہوتے تھے۔
دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

”دل بھی اتنا ہی بڑا ہے۔“
”یہ بھی خوبی رہی ہوگی؟“
”تو کیا نہیں ہے؟؟؟“

”ہوگی مگر مجھے اس خوبی سے کیا لیتا رہا۔“ اس نے نروٹھے پن سے کہا اور نکیہ درست طور جماتے ہوئے نیم دراز ہو گئی۔ اس نے پیر سے بائنتی پڑے تھیلوں کو سر کا دیا تھا۔ ایک شاپرے بھی گر گیا۔
افضل سعید نے اک طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب کروٹ بدل لی وہ کہنی کے بل ذرا سا اٹھے۔ اس کے سر پہ کوجاں فٹاری کے عالم میں تک رہے تھے۔

”آپ وہ بھی کو کوہ ابا میاں نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔“ وہی قصہ جو اس کے گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے ہی ان کے کانوں میں پھونک دیا تھا۔
”آپ کو اس قصے میں نجانے کیا مزا آتا ہے۔“ وہ چڑی۔

اس نے تو دہلایا کو تپانے کے لیے خوب پلاننگ کر کے سچا جھوٹا قصہ گھڑا تھا۔

آبائی نشین تھی مگر خود بولتے یا ٹھیکے پر دیتے۔ دونوں صورتوں میں بس سال بھر کے دانے ہی مل پاتے۔ بیماری خوشی۔ عی تعلیم تربیت اچھی زندگی گزارنے کے ڈھیروں خواب اس قلیل رقم میں کبھی پورے نہیں ہو سکتے تھے۔

اباجی نے بہت کم عمری میں ان سے بڑی دونوں بہنوں کو بیاہ دیا تھا۔

اب وہ دو بہنیں اور دو چھوٹے بھائی رہ گئے۔ وہ آبائی میٹھے کو ضرور اپنا لیتے۔ جی تو زحمت کرتے مگر اتنا نہیں گما سکتے تھے کہ خون تھوکتی ماں کا علاج کروا سکیں۔ بیاہی اور کنواری دونوں بہنوں کا بوجھ اٹھائیں اور

چھوٹے بھائیوں کی پڑھائی لکھائی۔
کراچی ہر دور میں محنت کرنے والوں کے لیے پارس
پتھر رہا ہے۔ سو وہ بھی ایک بیگ میں دو جوڑے ڈال
بہنوئی جو نایا زاد بھائی بھی تھا کہ پاس چھڑوں کے کواریٹر
میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ابتدائی طور پر محنت مزدوری
کی مگر جلد ہی لکھائی پڑھائی کا چھوٹا موٹا کام ملا تو عزت
مرتبہ اور پیسہ نظر آنے لگا۔
تینوں چیزوں کو ابھی نظر بھر کے دیکھا تھا کہ اباجی کی
شدید بیماری کا تار ملا وہ ہر چیز چھوڑوا پس لوٹے۔ تمام
جمع جتھا لگایا مگر ان کا آخری وقت آچکا تھا۔ اب کی بار
جب لوٹے تو دونوں بہنیں اور چھوٹے بھائی ہمراہ تھے۔
سیدھی سادی بہنیں اردو سے انجان۔
اور بھائی بھی دیسے ہی اسکول میں پڑھتے تھے مگر
کراچی کی ہر شے نئی تھی۔ اب ایک ایسے رہائشی
علاقے میں گھر لیا گیا۔

سب سے بڑی بہن اور بہنوئی کو اپنے ہمراہ رکھا گھر
کے بڑے کی حیثیت سے۔ اب دن اور رات کی ان
تھک محنت تھی۔ اپنا مستقبل اپنی خوشی اپنے خواب
اور آرزو میں تمام کی تمام بہن بھائیوں کے چہروں میں
کھوجنے کی عادت ہو گئی۔
دوسروں کے لیے کام کرتے کرتے نجلے کب اپنا
ذاتی کام شروع کر دیا پھر اسے جمانے کی جدوجہد بہنوں
کی تعلیم اور شادیاں۔ ایک گھر بھی خرید لیا۔ بایک
بھی۔

الفت کے ابا میاں ان کی چھوٹی بہن کو قرآن
پڑھانے آتے تھے۔
وہ ساٹھ کے ہند سے چھوٹے بزرگ شخص تھے۔
وہ بچے شیروانی سفید شلوار میں ملبوس۔ کسی
دفتر میں حساب کتاب دیکھتے تھے اور تین بچے فارغ
ہونے پر گھر جا کر درس قرآن دیا کرتے۔ ان کے پانچ
بچے تھے۔

اللہ نے انہیں ایک عمر گزر جانے کے بعد اچانک
اولاد کی دولت دے دی تھی۔ الفت ان کی تمام
آرزوؤں کا منبع دعاؤں کی تکمیل اور اللہ کا تحفہ بن کر

ان کے آنگن میں اتری تھی۔
ساری زندگی اولاد کے لیے ترسے ہوؤں کے لیے یہ
نعت عظیم تھی۔ وہ اکلوتی بیٹی کو حتی الوسع ناز و نعم سے
پال رہے تھے۔
زندگی بے حد پرسکون تھی مگر وہ بیٹوں کی آمد ایک
کنکر کی طرح تھی۔ پھر وہ بیٹیاں مزید۔ دونوں چھوٹی
بچیاں تو بلا شک و شبہ ان کی نواسیاں پوتیاں کہلائی
جاسکتی تھیں۔
محدود آمدنی تھی اتنی منگائی کا زمانہ نہیں تھا ساوگی کا
عصر نمایاں تھا۔ مگر فیروز بیگ کو ایک فکر لگ گئی وہ اتنی
عمر پا سکیں گے کہ بچوں کو پال سکیں اتنی ہمت کہاں سے
لائیں گے۔ بچوں کی عمر وہ بھی کہ باپ لوہا توڑ اور زمین
پھاڑ کر محنت سے رزق لائے اور وہ عمر کے اس دور میں
دن بدن تنزی کی جانب گامزن تھے۔

یہ احساس بہت شدید تھا۔ ہر بیماری موت کی
دستک معلوم ہوتی۔ رات کو بستر پر جاتے تو لائن سے
سوئے بچوں پر نگاہ پڑتی تو کیکپا کر رہ جاتے اگر جوہ صبح نہ
اٹھے اور فکر بھی دو طرح کی تھی۔ بھرپور جوان ہونی
الفت آرا۔

اگر وہ نہ رہے تو الفت کے ہاتھ کون پیلے کرے گا۔
اور اگر وہ نہ رہے تو چھوٹے بیٹے پندرہ چوہ
برس اور چھوٹی بیٹیاں دس اور بارہ برس کی تھیں۔ ان
چھوٹوں کے روٹی پانی کا بندوبست کہاں سے ہو گا۔
افضل سعید کے گھر میں پہلے کوثر درس لینے لگی پھر
اس سے بڑی کنیز فاطمہ۔ ان دونوں کی خوشی الحالی دیکھ
کر ایک روز خود افضل سعید بھی پہلا سپارہ کھول بیٹھ
گئے۔

چھ ماہ کے اندر وہ بہت خوب صورت قرأت سیکھ
گئے اور قرآن پاک پڑھتے ہوئے خود اپنی آواز سن کر
انہیں جو خوشی ملتی۔ دنیا کی ہر مسرت ان کے سامنے ہیج
تھی۔

انہیں خود پر بے پناہ فخر محسوس ہوتا اور استاد پر ہمار
آٹک معاوضہ تھک تھک دیتے تھے۔ مگر اس احسان کا
بدل وہ معاوضہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ استاد کے گھر راشن

ڈلوانے لگے۔ کبھی خود ان کے گھر نہ گئے ملازم کے
ذریعے۔ درس مکمل ہونے پر فیروز بیگ کا آنا تو بند ہوا
مگر افضل سعید کا جوابی عمل جیسے تمام عمر کے لیے
جاری رہنا تھا۔

اور پھر انہیں ایک خبر ملی کہ ان کی محترم استاد فیروز
بیگ۔ دل کے دورے کے باعث اسپتال میں پڑے
ہیں۔ وہ اپنے باپ کو کھو چکے تھے اور فیروز بیگ روحانی
باپ تھے۔ جب مشینوں میں جکڑے فیروز بیگ کو
ہچکیوں سے روتے دیکھا تو پریشانی کی انتہا نہ رہی وہ
ناقابل فہم خود کلامی کرتے تھے۔

”الفت کا کیا ہو گا۔ بیٹے چھوٹے نابالغ نا سمجھ۔
بچیاں بہت چھوٹی۔ بیگم بیماری کی بوٹ۔ زمانے سے
نا آشنا عورت۔ خود عرض نہ کہنا افضل۔ تم
سے نیک بچہ پوری دنیا میں دوسرا نہیں۔
تم۔ الفت کا۔ الفت کا۔“

افضل سعید کو زمانہ شناسی کا دعوا نہیں تھا۔ وہ
کاروبار کی دو جمع چار کرتے تھے سیدھے ساوے نیک۔
مگر ادھر وارہ جانے والا جملہ۔ انہوں نے ان کا ہاتھ
تھام لیا۔

”ہاں۔ ہاں میں۔ الفت کا۔ بالکل۔“
وہ الفت کا نام ہی جانتے تھے وہ کون ہے کیسی ہے؟
کیسی ہو سکتی ہے اس سے غرض نہیں تھی۔
اور اپنی ذمے داریوں میں کم افضل سعید کی زندگی
میں اس رنگ کی گنجائش کب تھی۔

اپنی شادی کا سالن و گمان بھی نہ تھا۔ ہاں کبھی کسی
کے احساس دلانے پر وہ سوچتے اب شادی کی عمر کہاں
رہی۔ ابھی زندگی میں شادی سے زیادہ اہم ذمہ داریوں
کی طویل فہرست تھی۔ کاروبار پڑھانے کے منصوبے
اور۔ اور۔

وہ وعدہ کر کے آگئے۔ ساری رات ادھیڑ بن میں
رہے۔ کیا فلموں کی طرح اسپتال میں نکل ہو گا اور اگر
فیروز بیگ رات و رات ہی خدا نخواست۔ لیکن آگے کی
کہانی اب الفت کی زبانی تھی۔
”میں ابا میاں کے لیے کچھڑی اور بخنی بنا کر بیٹھی

تھی اور ابا میاں نے اسی کچھڑی پر میرا نکاح پڑھا دیا۔“
نہ مہندی نہ مایوں نہ سہاگ کے گیت۔ اماں نے
نجانے کون سے کون سے ٹرک سے مڈیوں کے بدن کی
بو سے بھرا غراہ پہنا دیا۔ لوتی میں تیار۔ ساری زندگی
کہا میری بیٹی کو بیاہنے راجکار آئے گا گھوڑے پر سوار
دو گڑگ دو گڑگ کرتا۔

اب ابا میاں کو راجکار اور چمار کا فرق نہیں معلوم
تو۔ میرا نصیب۔

افضل سعید کی اردو میں روحانی الفت کی سات سالہ
رفاقت نے بعد میں پیدا کی ورنہ وہ ذات کے راجپوت
تھے۔ ان کے ہاں چوڑے چھپارے کا لفظ استعمال
ہوتا تھا۔ مگر اس وقت نو بیاہتا کی ڈگڑگ ڈگڑگ چلتی
زبان کو دیکھ رہے تھے۔

”اچھا۔ چلو مان لیا راجوں مہاراجوں کا زمانہ نہیں
رہا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

افضل نے ایسی فصاحت و بلاغت سے بھرپور روحانی
اپنی پوری زندگی میں نہ دیکھی نہ سنی۔ باقاعدہ عقیدت
مندی کے انداز میں دوزانوں بس سنتے جا رہے تھے۔

”ان کی بڑی بہنیں۔۔۔ ہر بات کے جواب میں جی
وریہا (جی بھائی) کہتی تھیں۔

اور چھوٹی دونوں جی بھائی جان۔۔۔ ضرورتاً بولتیں
آپس میں بات کرتیں تو مدغم لفظ تول تول کر۔۔۔ جملے
جوڑ جوڑ۔

پر ادھر کوئی اصول نہیں تھا۔ جو جیسے داغ مل کد ہاتھا
زبان سے چھوڑا جا رہا تھا۔

”تو کوئی وزیر زوال پذیر۔۔۔ کوئی صدر ملک بدر
ڈھونڈ لیتے۔۔۔ کوئی وزیر اعظم ہا۔“

”ملک کی وزیر اعظم اس وقت ایک عورت ہیں۔۔۔
الفت۔ اور صدر۔۔۔ صدر غلام اسحاق خان۔۔۔ تم
پاکل تو نہیں۔“ افضل بھونچکے رہ گئے۔

”افو۔ اس نے اپنے سر کو پکڑا۔

”یہ تو میں نے محاورا“ کہا ہے۔ میں کوئی لیڈی ڈیانا
کی طرح پاکل نہیں نہ دولت کی لالچی کہ چارلس جیسے
بڑھے بندر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں؟“

باہ ٹھنڈی سانس۔ ”ہماری بھی وہی مثال۔ بس رنگ کا فرق ہے باقی تو۔“

اس نے بے حد بچکانہ الزانداز میں ہونٹ لٹکائے۔ افضل سعید کا قہقہہ چھت سے چپک گیا۔ انہیں اس کے بے حد قابل اعتراض جملوں پر قطعاً غصہ نہیں آ رہا تھا۔ جیسے کسی چھوٹے بچے کی معصوم احمقانہ ادھر ادھر کی لاف زنی پر بڑے انہیں سینے سے لگا کر چوم لیتے ہیں۔

الفت کی ادائیں بالکل ویسے ہی انہیں اکساتی تھیں کہ۔ بس۔

”ایسا ہولناک نقشہ کھینچا کہ خوف سے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔ بیٹا میرا بدھل چلا۔ اور تمہاری جوالی۔ ہونہ۔ میرا ہارٹ اٹیک۔ ایٹم بم اٹیک کی طرح تم سب کو تباہ برباد کر دے گا خصوصاً مجھے۔ یعنی الفت بیک کو۔ ہونہ!“

ایک تو سر پر بڑے گٹھڑ کی طرح شادی کر دی اچانک۔ چلو میں مان گئی۔ اوپر سے پرانی فلموں کی طرح سینہ مسل مسل کر وہ ڈانسیا لگ بولے کہ۔ اچھی ہوئی یا بری۔ میں تو شادی انجوائے ہی نہ کر سکی۔ ہر دستک پر لگتا۔ ابامیاں کی ہی خبر آئی ہوگی۔

چٹکی اور تادیدہ آنسو پونچھتی۔

”ایسے نہیں کہتے الفت۔!“ افضل سعید کی آنکھیں پہلے ہی ابلی پڑی تھیں۔ فوراً ٹوکا۔

”نہیں نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ کوئی ہارٹ اٹیک وٹیک نہیں ہو گا۔ ابابو خوب جین گے۔“

”تین ہارٹ اٹیک کا کہتے ہیں۔“

”ابھی تو ابامیاں کی دو بیٹیاں باقی ہیں۔“ اس نے بے فکری سے آنکھیں میچیں۔

”الفت۔!“ افضل سعید کا سر جھکا گیا۔

”ویسے ایک بات بتائے۔ یہ ڈیانا نے صرف شہزادی بننے پیسے ویسے کے چکر میں اس اود بلاؤ سے شادی کی تھی یاں۔ اب آئے دن لڑتے ہیں۔“

سعید نے دیکھ ہی لیا تھا۔ اس کا سوال پر اسرار ساٹھ لیتا ہوا تھا۔

افضل نے شانے اچکائے۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مگر سنا ہے ملکہ کو ایک کم عمر دوشیزہ کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی مرضی چلائی تھی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں ڈیانا کی بے پناہ خوب صورتی وجہ انتخاب تھی۔ ملکہ کے پاس تاج برطانیہ ہے۔ مگر خدا نے اتنا بڑا مرتبہ دینے کے بعد خوب صورتی کا خانہ خالی چھوڑ دیا ہے۔ ڈیانا کے ذریعے حسن و جمال کو محل میں جبراً گھسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ آنے والی نسل ماں کا نقشہ لائے۔ جس طرح دولت، عزت و مرتبے میں شاہی خاندان اعلیٰ ہے اگر شکل و صورت بھی مل جائے تو۔ کیا کہنے۔“

الفت کے لیے یہ گویا اندر کی خبریں تھیں۔ آنکھیں پھیلائے ہمہ تن گوش تھی۔ افضل کے جملے کے اختتام تک اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ آرکی۔

”آپ نے بھی تو میرا انتخاب اس لیے نہیں کیا۔ کہ۔ اپنے خاندان میں تھوڑی بہت خوب صورتی لے آئیں ہی ہی۔“ افضل سعید اس کے جملے کی گہرائی میں پہنچے تو دل کھول کر ہنس پڑے۔

”میں نے تو تمہیں گھونٹ گھونٹ اٹھانے کے بعد دیکھا تھا یار!“ ہنسی کے دوران بتایا۔ ”اور ہم کم از کم شاہی خاندان جتنے بھی بد شکل نہیں ہیں۔“

اس نے بغور ان کی صورت دیکھی اور پیٹ پکڑ کر دوہری ہو گئی۔ ہی ہی ہی۔ ہو ہو۔ افضل سعید چمکتے موتیوں کی قطار کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

افضل سعید کا تمام خاندان گہری سانولی رنگت، لمبے قد اور چوڑے شانے۔ کھلے ہاتھ پیر۔ وہ اسماٹ آدی تھے۔ جسم پر چربی نام کو نہ تھی کسرتی جسم۔ ہاں اگر بھی موٹے ہو جاتے تو بقول الفت دیو معلوم ہوتے۔

اور اس نے تو کہہ ہی دیا تھا۔

وہ گاؤں تیکے کے سہارے افضل کے بازو کے گھیرے

میں تھی۔ ان کا بایاں بازو اس کے شانے کے گرد لپٹا تھا اور دائیں ہاتھ میں الفت کے دونوں ملائم ہاتھ تھام رکھے تھے۔ وہ بہت دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہے تھے۔

سنگھار میز کے بڑے آئینے میں اپنا عکس دل کو خوشی سے بھر رہا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً آئینے کی جانب دیکھ لیتے۔

ان کی نظروں کے تعاقب میں جب الفت نے سین دیکھا تو بے ساختہ بول پڑی۔

”دیو کے قبضے میں پری۔“

پھر اپنی تشبیہ پر خود ہی مزہ لیتے ہوئے ان ہی کی گود میں سر گھسا کر ہنسی چلی گئی۔

اس کا ہر انداز افضل کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ خود بھی خوب نہیں۔ انہوں نے تو بعد میں دیکھا تھا۔ مگر خاندان کی عورتوں نے اگلے منٹ ہی میں کہہ دیا تھا۔ ”دلہن بہت کم عمر ہے۔ بہت ہی چھوٹی ہے۔“

افضل گھبرا گئے۔ غرارے میں لپٹی گٹھڑی انہیں بہت چھوٹی معلوم ہوئی تھی۔ مگر۔

”کیا واقعی۔ ایک مرتبہ دیکھ لینا چاہیے تھا۔ یا پوچھ ہی لیتے۔“

وہ پینتیس کا ہندسہ عبور کرنے والے تھے تو کیا دلہن پندرہ کی ہے؟ ارے مولا۔ وہ ڈرتے کانٹے اندر گئے تھے۔ دلہن کم عمر تھی ان کے مقابلے میں۔ مگر اتنی چنی کاکی بھی نہیں۔ وہ میسوس برس میں تھی۔ مگر دلا پتلا سر۔ سائے میں تراشا پیکر بوٹا ساقد۔

سب سے بڑھ کر عمر چور۔

اور سونے پہ سہاگہ بچکانہ انداز۔ منہ بسورنا باقاعدہ انگلیوں سے بات بے بات سچے جھوٹے آنسوؤں کو پونچھتا (افضل کا دل کٹ جاتا)

لا ابالی پن۔ لاپرواہی۔ البر دوشیزہ کی سی ادائیں۔

اس کی احمقانہ گفتگو۔ طنزیہ کٹ دار جملے بھی لہجے کے اتار چڑھاؤ کے باعث بے ضرر معلوم ہوتے۔

یہی باتیں طعنے وہ کسی اکھڑ داغ عقل رکھنے والے

کے سامنے کرتی تو اگلا گردن دیوچ دھکے دے کر نکال باہر کرتا۔

مگر افضل سعید نے پہلے ہی روز اس کی کم عمری، ابھول پن، ناوانی اور معصومیت کو مان لیا تھا۔ وہ چاروں شانے چت تھے۔

الفت! مجھے یہ حرکت قطعاً پسند نہیں۔ میں تمہیں پہلے بھی دو چار مرتبہ صاف صاف الفاظ میں بتا چکا ہوں۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔“

”ہاں۔ ہاں آپ تو کہیں گے یہ۔ اتنا بہت سا سامان بھرا ہے اگر میں نے تھوڑا بہت دے دیا تو کون سی خزانے میں کمی ہوگئی۔ ہاں بولیں۔“

الفت نے ڈھیلا پڑنا تو کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ہر بات کو اپنے نظریات کے حساب سے توڑ مروڑ دیا کرتی تھی۔

”خزانے میں کمی کی بات نہیں ہے۔ الفت!“

افضل زنج ہو گئے۔

غصہ بے بسی برداشت۔

الفت کی حرکت پر غصہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ غصہ کی شدت کی وجہ الفت کا نہ سمجھنا اور مستقل ہٹ دھرمی تھی۔ اور انہیں سب برداشت تھا یہ حرکت کبھی برداشت نہ ہوتی تھی۔

”میں تمہیں ہفتے بھر کا گوشت، مہربانی، راشن اس لیے لا کر دیتا ہوں کہ تم کہاں خوار ہوگی۔ میں گھر میں ہوتا نہیں، اظہر اور اکمل کلج اور بعد میں آفس آتے ہیں۔ تمہیں پریشانی ہوگی۔ کون لا کر دے گا اور تم۔“

”حالانکہ میں سب لا سکتی ہوں۔“ اس پر خاک اثر نہیں تھا فوراً بدتمیزی سے جتا۔

”الفت۔ بس کرو۔ مجھے نہیں پسند کہ تم معمولی معمولی چیزوں کے لیے گلے گلے کی پرچون پر جاؤ یا۔“

”ہاں تو اگر جاؤں گی تو خریداری کے لیے گئے جاؤں گی یاں میں کون سا دکان دار کے ساتھ یا رانہ جوڑ رہی ہوں۔“



”پھر الٹی بات۔“

”آپ کو سارا غصہ یہی ہے کہ آپ کے پیسے لایا سامان میں نے اپنی اماں کو کیوں دے دیا۔ اتنے بڑے سینے میں دل چپوٹی جتنا۔ ہونہ۔“

اس نے صریحا ”الزام لگاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا گلاس بیڈ پر دے مارا تھا۔ وہ جگ بھر کے دودھ مدح افزا لے کر بیٹھی تھی۔

افضل کی ساری باتوں کے دوران گھونٹ گھونٹ یوں بھر رہی تھی۔ جیسے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہو۔ افضل نے آتے ہی بھوک بھوک کا شور مچایا تھا۔ وہ صبح دس بجے جا کر چارپانچ بجے آتے تھے۔

بچے گہری نیند میں سو رہے تھے۔ الفت کے ہاتھ میں دودھ مدح افزا کا جگ تھا۔ کرسی پر پیر رکھ کر بیٹھی تھی۔ پورا جگ بھوکا چکی تھی۔

”مجھے خود بھی بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے بھوک کے سوال پر جواب دیا۔

تویار کھانا لگاؤ میں ہاتھ دھوتا ہوں۔ اکٹھے کھائیں گے۔“ افضل خوش ہوئے۔ انہیں ساتھ ساتھ کھانا کھانا پسند تھا مگر الفت ایسے چونچلے نہیں پالتی تھی۔ اس نے کبھی انتظار نہیں کیا جب دل چاہا کھالیا۔

”کیا لگاؤں۔“ کچھ پکایا ہی نہیں۔“ اس نے صفائی سے کہا۔

”یہ کیا الفت۔۔۔ کیوں نہیں پکایا۔ سب کچھ تو موجود تھا۔“

”اماں آئی تھیں ملنے۔۔۔ واپسی پر سبزی گوشت کے لیے مارکیٹ کے لیے نکلنے لگیں تو میں نے کہاں کہاں گری میں دکان دکان پھریں گی۔ میں نے خود ہی تھیلے باندھ دیے۔“

افضل نے پہلے ٹھنڈی سانس لی۔ پھر ان کا پارہ اوپر چڑھنے لگا۔

”سب کچھ دے دیا الفت! ایک ٹائم کی ہانڈی چڑھا لیتیں۔“

”سب کچھ دے دیا الفت۔۔۔؟“ اس نے ہاتھ نچا کر

نقل اتاری۔

”آپ کی کمائی تھی میں نے لٹا دی۔“ اسی غریب لوگ اور تفسی (آپ) مہمان۔ ہونہ۔“

”الفت! میں یہ سب نہیں کہہ رہا۔ تم بات کو غلط رخ پر کیوں لے جاتی ہو۔۔۔؟؟؟“

”اپنی مرضی سے لٹاتے رہیں گے۔ فلاں کی نیاز ڈھمکانے کا چہلم۔۔۔ صدقے، زکوٰۃ اب میں نے کچھ اپنی مرضی سے کیا تو۔ آگئے۔“

”خدا کا خوف کرو۔ نیاز۔۔۔ صدقے زکوٰۃ کا نام کیوں لیا۔ زیر کفالت لوگوں کو کب دیتے ہیں خیرات۔۔۔ تمہارے ماں باپ سے میرا ذمہ داری کا رشتہ ہے تم نے اتنا غلط لفظ استعمال ہی کیسے کیا۔ لاجل ولا

”ہونہ۔! الفت نے ناک سکوڑی۔“

”تمہارا طریقہ غلط ہے۔ میں ہر مہینے کسی کے علم میں لائے بغیر ان کے گھر پر شے پہنچا دیتا ہوں اور تم نے ٹھیک کیا۔ اماں دھوپ میں کہاں جاتیں۔ لیکن اللہ کی بندی۔۔۔ اپنا شام تک کا تو بندوبست رکھتیں۔ کچھ بھی دال چھنی بنا لیتیں۔ ہم کھانا کھاتے۔ سورج ڈھلنے کے بعد مارکیٹ جاتے۔ سب کچھ لے آتے۔ اب پیٹ خالی۔۔۔ دماغ گرم۔۔۔ لی پی لو ہو گیا۔ قدموں میں سکت نہیں ہے۔ لڑنے بیٹھ گئے۔“

افضل نے جملہ اودھورا چھوڑ دیا۔ الفت کے چہرے پر غصے کا تناؤ ابھر رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے کے ہر تاثر کو پہچان لیتے تھے۔ وہ غلطی پر بھی مگر ان کے سر چڑھنے والی تھی۔

وہ فریج کو ٹٹولنے لگے۔ اُحد کے کپلے بڑے تھے۔ ایک کھالیا۔۔۔ بریڈ کے ہفتے پرانے سوکھے سلائس کو لے کر کچن میں گئے۔

دودھ کی خالی پٹیلی کے پینڈے اور دیواروں پر جے ملائی نما دودھ سے سلائس لگا لگا کر حلق سے اتارے۔

باہر کی گرمی اور اندر کی بجٹ۔۔۔ وہ نہانے اور کپڑے بدلنے غسل خانے کی جانب بڑھے پھر مارکیٹ تک جا کر کچھ پکایا لائے اور باقی سامان بھی۔

سر پرانی بہا بہا کر خود کو ٹھنڈا کر رہے تھے۔

میں دروازے کے کھل بند کی آواز آئی۔ کوئی محلہ پڑوس کا ہو گا۔

مگر دوسری آواز قاتل تشویش تھی۔

وہ ترنت باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ذرا سی جھری سے دیکھا۔

اسد کو تھمتے اُحد کو بمشکل شانے سے لگائے وہ دروازے سے نکل رہی تھی۔ پھپھٹاتا رکشہ نظروں میں آ گیا تھا۔

وہ خفا ہو کر میکے چلی گئی تھی۔

ان کی کاروباری مصروفیات مکمل توجہ کی طالب تھیں۔ مگر الفت کا گھر میں ہونا یا نہ ہونا دونوں سبب توجہ کو ہٹا دیتے تھے۔

اسے ناراض ہونے کے لیے کسی بھی بڑے واقعہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اسے منایا جائے۔ اس کی پروا قطعاً نہیں۔

لیکن افضل کے لیے یہ دونوں باتیں بہت معنی رکھتی تھیں۔

اور کچھ آج کل اس کی حالت۔۔۔ وہ ضد کے عالم میں خود پر جبر کرنی اور تکلیف افضل سعید کو اپنے دل پر جھیلنی پڑتی۔

وہ اگلے دن ہی صبح صبح تھیلوں سے لدے پھندے سرال پہنچے۔ انہیں دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔

ساس نے والہانہ استقبال کیا۔ الفت انہیں دیکھتے ہی چھت پر چلی گئی۔

”بس میرے پیچھے بڑھ گئی۔ ورنہ بیٹے! اللہ کے فضل اور تمہاری مہربانی سے کب کسی چیز کی کمی رہی۔ بڑوسی کے بچے سے رکشہ منگوا دیا اور اسی کے ساتھ مل کر تھیلے رکھنے لگی۔“

وہ اتنی اوچی آواز میں بول رہی تھیں کہ الفت کے کانوں میں بڑ جائے۔

”عقل کی اندھی ہے اول تو دینا ہی نہیں چاہیے

تھا۔ میں نے کہا تھا اس سے کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ہانڈی چڑھا دیتی ہوں۔ چار تو چپا تیاں ڈالنی ہوتی ہیں۔ منع کر دیا۔ سارا گھر بکھیر کے بیٹھی تھی۔ تم ماسی رکھ دو ایک تو اس سے کام ہوتا نہیں دوسرے کرتی بھی نہیں سلا پروا ہے ناں۔“

”مجھے شرمندہ کرنی ہے۔ اب یہاں آکر کیا کیا نہ کہا ہو گا۔ استاد صاحب کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔۔۔ اور آپ سب لوگ۔۔۔“

”ناں نائن۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔“ اماں ان کے نزدیک جھک آئیں۔ اودھرا دھردھ کھا پھر براسرار انداز میں سرگوشی کی۔

”مجھے پتا ہے بھوٹ بولتی ہے۔۔۔ جھوٹی ہے ناں۔“

”اماں۔۔۔ ان کا سچا معصوم انداز۔ افضل سعید نے بازو پھیلا کر انہیں خود سے قریب کیا۔ انہیں زوروں کی ہنسی آرہی تھی۔

الفت کی قصدا ”اڑتی پڑتی نگاہ یوں تھی۔ جیسے نیچے کا منظر اور کروار دونوں اجنبی ہوں غیر متعلق۔۔۔“

”تمہارے لیے ناشتالاتی ہوں۔ دال کے پرانے ہیں۔ ٹماٹر کی چٹنی اور شامی کباب بھی بنائے تھے۔ لاؤں ناں۔“

”بالکل لائیے۔۔۔“ وہ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ نیچے چاکلیٹس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ننگی بان کی چارپائی پر بازو کا تکیہ بنا کر نیم دراز ہو گئے۔

سر پر لگے پادام کے درخت کے پتوں کی درزوں سے چھت پر نظر پڑتی تھی۔ الفت ان کے لائے گول گے بڑا سامنہ کھول خوب سی سی کرتے کھا رہی تھی۔

اس عالم میں اس کے چہرے پر نور کی پرست تھی۔ گندی رنگت میں سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر ہلکی تندرستی کی تہ سی تھی۔ اسے افضل سعید کی خود پر جی نگاہوں کا بخوبی احساس تھا۔ مگر لا تعلقی کا تاثر۔

اس کے کھانے کی رفتار بہت تیز تھی۔ ”مزے کے ہیں؟“ افضل نے شی شی کر کے متوجہ کیا اور پھر پوچھا۔

پوچھا۔

پوچھا۔

الفت نے ان کی جانب دیکھا پھر اس انداز سے رخ پھیرا جیسے وہ اس کے کھائے پیے پر نظر لگانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

افضل سعید نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اس کے ہر انداز سے واقف تھے وہ ان کے ساتھ ہی جا لے گی۔

”پھر کیا خیال ہے رکھ لیں دن تاریخ۔“ افضل سعید نے اسے بھی گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ بڑی باجی آئی بیٹھی تھیں۔ مدعا اظہر کی ممکن یا شادی تھی۔

اسے الفت کی خالہ زاد پس تایا زاد بہن پسند آگئی تھی۔ اس نے سیدھے سیدھے افضل سعید سے ذکر کیا۔ افضل بے حد خوش ہوئے۔ انہیں تمکنت بہت اچھی لگتی تھی۔ دلی پتی دراز قد پر کشش لڑکی۔ خاموش طبع دھیمے دھیمے مسکراتی ہوئی۔

وہ فیروز بیگ کے اکلوتے بڑے بھائی کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی سلی اے پاس اور ایک اچھی شہرت والے پرائیویٹ اسکول کی ٹیچر۔

بڑی بہن شادی شدہ حیدر آباد میں تھی۔ بڑا بھائی اپنی فیملی کے ہمراہ جب سعودیہ شفٹ ہوا تو۔ تمکنت کی رہائش کا مسئلہ اٹھا۔ اکیلی رہ نہیں سکتی تھی اور بھائی کو فقط فیملی ویرا ملا تھا کمپنی کی طرف سے۔ تمکنت بہت خوش خوش اپنے چچا فیروز بیگ کے گھر کراچی آگئی۔

الفت اپنا کام یہ دیور اظہر انہیں اکثر لینے اور چھوڑنے آتا تھا۔ الفت کے تمام گھر والے اس کے سسرال والوں سے بہت محبت اور احترام سے پیش آتے تھے اور بدلے میں ان کا رویہ بھی بے حد محبت اور عزت سے بھرپور ہوتا۔

تمکنت نے محسوس کیا تھا اور کھوج بھی لگائی تھی کہ وہ پہلے دروازے سے چھوڑ سلام کر کے رخصت مگر اب کافی عرصے سے وہ اندر آکر بیٹھ جاتا تھا۔ الفت کا کٹھور پن منہ پھٹ ہوتا۔ اظہر اکمل وغیرہ

کو اس سے دس قدم دور رکھتا تھا۔ وہ ہفتہ وار گھر آتے تھے ورنہ دفتر کے اوپر بنائے گئے دوغول کمروں میں رہتے تھے جہاں ہر سہولت مہیا کی گئی تھی۔ افضل سعید بہنوں بھائیوں کو کسی حوالے سے مسئلہ کا شکا نہیں دیکھ سکتے تھے مگر وہ ان کے گھر سے دور رہ کر عزت سے رہتے تھے تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔

الفت کی زبان کے آگے تو خند تھی۔ اس کی آنکھوں پر بدگمانی کی ٹینک لگی تھی۔ اسے کچھ سیدھا نظر نہیں آتا تھا۔

”ہاں میں نے اکیلے نکل کر بھاگ جانا ہے نا۔ کبھی ایک تو بھی دوسرے دم چھلا۔“

”آپ کو تو خوش ہونا چاہیے ایسا! سب آپ کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔“ تمکنت اس دھیان کے پیچھے چھپی فکر مندی اور محبت کو پہچان چکی تھی۔

”ہاں بہن! مجھے خوش ہونا چاہیے خوش رہنا چاہیے سب کی مشورہ دیتے ہیں۔ کوئی خوش رہنے نہیں دیتا۔ ہمیشہ لوگ ہی بتاتے ہیں کہ بی بی تم خوش ہو مجھے خود کیوں نہیں لگتا کہ میں خوش ہوں یا کیسے خوش رہوں۔ ساری دنیا کے قیامے اور خوش گمانیاں۔ ہونہ۔“

ہر وہ بات جس میں افضل سعید کی مدح کا پہلو ہو اللہ جانے الفت کو آگ کیوں لگا جاتا تھا۔

مزے سے چٹا منہ اور لقمہ بنا تا ہاتھ ٹھنک کر رک گیا پھولے پھولے ہلکے بے وزنی پھلکوں کی جگہ تندوری روٹی کب شروع ہو گئی اس نے چونک کر سر اٹھایا تو کھڑکی میں تمکنت کا چاند چہرہ جھہنپی مسکراہٹ کے ساتھ سجا تھا۔

اظہر نے ایک نظر روٹی اور دوسری تمکین پر ڈالی۔ ”دراصل گندھا آتا ختم ہوا تو میں نے جلدی سے بچے کو بھیج دو روٹیاں منگوائیں۔ آپ کھاتے رہے میں اور آٹا گوندھ رہی ہوں ناں۔“ اس نے آٹا چیلے ہاتھوں کو لہرایا۔

”مائی گاڈ۔ میں اتنی۔۔۔ ی ی ی۔۔۔ روٹیاں کھا گیا؟“

”مم۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ تمکنت کو اس کے انداز پر ہنسی آئی مگر فوراً ”صفائی دی۔“

”سب ہی کھا رہے تھے شاید میں نے آٹا کم گوندھا تھا۔“

”آپ یقیناً اس کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی ہوں گی کہ میرے ہاتھ رکے کہ نہیں رکے۔“ اس نے پالنے والے انداز میں سر ہلایا۔

”نہیں۔ نہیں۔“ تمکنت نے زور و شور سے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں اگر تم بھی رہی تھیں تو کوئی برائی نہیں۔“ وہ تخت سے اتر چکن کھڑکی کے سامنے آکر کا اور چوکھٹ پر کھنی نکا کر گال پھیلی پر رکھا۔ نوالے گننے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

نمبر 1 اگر آپ محبت سے کھلا رہی ہیں تو جملہ اور لہجہ یوں ہو گا۔ ہائے اللہ ابھی تو آپ نے صرف ایک سو ننانوے نوالے کھائے ہیں۔

نمبر 2 ہائے اللہ گیارہ روٹیاں کھا گیا۔ کم بخت کا پیٹ ہے کہ کتوں۔۔۔ اب آپ بتائیے آپ کا نمبر کون سا تھا۔“

تمکنت کو زوروں کی ہنسی آرہی تھی۔

”پہلے والا۔“ وہ چہرے پر اڑتے بالوں سے کچھ پریشان تھی۔ سر جھٹک کر بال پیچھے کے۔

اظہر نے فارغ لگتے ہاتھ کو پشت پر کس لیا۔ دل اور دماغ کی گستاخ خواہش ہاتھ کو آلہ کار بنانے والی تھی۔

تمکنت نے جلدی جلدی گونج لگا کر آٹا سمیٹا اور چولے کی آنج بڑھائی۔

”آپ بیٹھیے۔ میں بس پانی منٹ میں۔“

”ناں۔ نہیں۔ بس پیٹ بھر گیا۔“ وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ ”اور روٹی مت بتائیں۔ میں نے پانی پی لیا ہے بس۔“

”آپ ناراض ہو گئے شاید۔ بس دو منٹ۔“ وہ

پیرا توڑنے لگی۔

”تمکنت پلیز۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بے خیالی میں پتا نہیں چلا ورنہ میں اتنا بھی پیو نہیں۔ بھنڈی گوشت پسند ہے اور اتنے ملائم پھلکے۔ دھیان ہی نہ رہا۔ آپ رک جائیے پلیز۔“

”میں اپنے لیے بتا رہی ہوں۔“ اس نے رخ موڑ کر کما کر مسکراہٹ کی کرن اظہر کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہی۔

”یعنی میں آپ کے حصے کی بھی روٹی کھا گیا ہوں۔“ اظہر کو خود پر افسوس ہوا۔

وہ چپ رہی۔

”اچھا آئندہ ہم مل کر کھائیں گے تو۔“

”آئندہ۔۔۔ مل کر۔۔۔ کیوں؟“ تمکنت کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”اوہ۔۔۔! اظہر دو قدم پیچھے ہوا۔ ”لڑکی ناراض ہو کر چٹنا بھی مار سکتی ہے۔“

”اوہ سوری۔۔۔ بے خیالی میں۔۔۔ میرا مطلب ہے کسم۔“

”یہ بھی کیا تمہارے بھیا جی کا حکم ہے۔ کہ صرف چھوڑنے نہ جاؤ جب تک الفت وہاں رہے۔ ساتھ ساتھ چپکے رہو۔“ الفت کھانے کے برتن لیے بولتی آرہی تھی۔ اس کے خیال میں اظہر جاچکا تھا۔

”نہ۔۔۔ میں ہاتھ دھو رہا تھا۔“ وہ کرنٹ کھا کر پلٹا۔

”ہاں تو ہاتھ دھونے سے منع کون کر رہا تھا۔ مگر میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ پہلے تو تم ”ہاتھ دھونے“ تک آتے ہی نہیں تھے۔“

الفت نے یقیناً اس کے کھانا کھانے پر تنقید کی تھی۔ تمکنت کا رنگ اظہر کے رنگ سے زیادہ پھیکا پڑا تھا۔

عزت نفس ر الفت کا حملہ شدید تھا۔ اظہر جو ابی حملہ کر سکتا تھا۔ یہ بھنڈی گوشت اور دیگر راشن پچھلے ہفتے افضل کے کہنے پر اظہر ہی ڈلو کر گیا تھا۔

مگر یہ جملہ الفت جیسی آنکھوں کی اندھی اور عقل

کی اندھی۔۔۔ ہی کہہ سکتی تھی۔ اس کے سامنے اس کی اماں نے اظہر کو کہہ کہہ کر روکا تھا کہ کھانے کا وقت ہے اور وہ اسے کھانا کھائے بغیر کبھی نہیں جانے دیں گی۔

اظہر کے دل کا حال کیا تھا؟ یہ دوسری بات تھی لیکن سامنے تو یہی تھا کہ اماں نے روکا تھا اور فیروز بیگ بہت محبت کے ساتھ اس کے ساتھ کھا کر گئے تھے۔ وہ تمکنت کے چکر میں چھوٹے لقمے لے کر بیٹھا رہ گیا تھا یہ تو اندر کی بات تھی۔

اظہر کے پاس جواب تو تھے۔ مگر وہ دے نہیں سکتا تھا۔

”میں چلتا ہوں۔“ اس نے تخت پر پڑی چابیاں پیٹھ کی جیب میں ڈالیں۔

”چچ۔۔۔ چائے رکھی تھی۔“ تمکنت نے سفید کپ میں خوش رنگ چائے کو دیکھا۔

اظہر نے تمکنت کا شرمندہ سما چہرہ دیکھا وہ مسکرایا اور یہ بہت مشکل مسکراہٹ تھی۔

”پھر کبھی سہی۔۔۔“ وہ پلٹ گیا۔

الفت ”ہونہ۔“ کہہ کر فریج کھولے کھڑی تھی۔ وہ اظہر کے لائے آموں میں سے ٹکڑے آم چن کر الگ کر رہی تھی۔

میں دروازے پر جا کر اظہر کو پلٹنا پڑا۔ اس کو اپنی پشت پر بھی نگاہیں محسوس ہو رہی تھیں۔

تمکنت نے چائے کا کپ اٹھا کر دکھایا۔ چائے تیار تھی۔ وہ پی کر چلا جاتا۔

”نیکسٹ ٹائم تمکنت۔۔۔!“ وہ والٹ اٹھانے کے بہانے پلٹا تھا۔ ان شاء اللہ۔“ اظہر سعید نے لمحوں میں فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ بائیس برس کا تھا اور اسے اسٹیبلش ہونے اور شادی بیاہ تک پہنچنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

وہ بہت مزے سے تمکنت کے ساتھ لکا چھپی کا کھیل انجوائے کر سکتا تھا ایک اٹل ارادہ، ایک مسکراہٹ۔۔۔ ہفتے بھر کی طمانیت اور خوشی کے لیے

ایک گنگنا تا جملہ۔

مگر الفت۔۔۔

الفت۔۔۔ خوش نہیں رہتی تھی۔ وہ کسی کو خوش رہنے بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔ الفت کی جگہ کوئی اور محبت کرنے والی پر خلوص بہن ہوتی تو خوش ہوتی کہ بہن کے لیے ایک اچھا مستقبل بن سکتا ہے۔ کوشش کرتی۔

الفت کی جگہ کوئی اور بھابھی ہوتی تو چھوٹے لاڈلے دیور کے من پسند دیورانی لاکر (اور اگر اپنی ہی بہن ہو تو کیا بات ہو) خوش ہوتی۔ زمانے بھر سے واہ واہ سمیٹتی سب کی نظروں میں اچھی بنتی۔

مگر یہ الفت تھی۔ جسے کسی کی اچھائی برائی سے غرض نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب اماں نے دبے لفظوں میں کہا کہ۔

”کیا ہی اچھا ہوتا کہ اظہر ارجمند کو پسند کر لیتا تمکنت کے بجائے۔“

تب فیروز بیگ نے اونہوں کہہ کر ناگواری کا اظہار کیا۔

تمکنت ان کے لیے چوتھی بیٹی کی طرح تھی۔ کوئی فرق نہیں۔

الفت کی رائے مانگی گئی تو جواب حق دق کروینے والا تھا۔

”میرا حال دیکھ لیں۔ پہلی بیٹی کے سکھ دیکھ لیں تو دوسری دے دیں۔ ہونہ۔“ اور فیروز بیگ پہلی بیٹی کے سکھ دکھ سے بخوبی واقف تھے۔

اظہر نے اس روز بتا چائے پیے واپس پلٹتے ہوئے بائیک کو کک لگانے تک فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ دونوں بڑی باجیوں کا قطعی انکار وہ جانتا تھا۔ چھوٹیوں کو قائل کیا جاسکتا تھا۔ سب سے آسان راستہ افضل سعید ہی تھے۔

وہ دفتر میں کھلکویٹر اور پن پکڑے بے حد مصروف تھے۔ اس نے چھوٹے ہی کہہ دیا۔

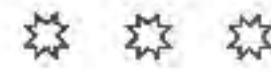
”مجھے تمکنت سے شادی کرنی ہے۔ آپ میرا رشتہ مانگ لیں۔“

افضل سعید نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔ ”شادی بڑھائی لکھائی اور کام سیٹ ہونے کے بعد کروں گا۔ بس آپ متکنتی کر دیں بلکہ۔۔۔ نکاح کر دیں۔ بھابھی کہتی ہیں میں ان کی اماں کے گھر آکر کیوں بیٹھتا ہوں۔ انہیں بھی پتا لگے ان کے لیے نہیں بیٹھتا۔“ وہ انہیں بولنے کا موقع دیے بغیر تیز تیز کہہ رہا تھا۔

”بھابھی کی ضد میں رشتہ مانگنا ہے؟“ افضل سعید نے تحمل سے پوچھا۔ ”یہ تو لڑکی کی زندگی خراب کرنے والی بات ہوئی۔“ وہ اس کا اندر ٹٹولنا چاہ رہے تھے۔

”لیے آندھی طوفان کی طرح۔“

”وہ نہ ملی تو میری زندگی خراب ہو جائے گی۔“ وہ تیزی سے بولا پھر بڑے بھائی کا لحاظ یاد آیا تو تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ افضل سعید کے لبوں پہ مسکراہٹ آ رہی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔



افضل سعید کی چاروں بہنوں کو الفت کے طور کبھی بھی کسی پہلو سے بھی پسند نہیں تھے۔ لاپرواہی، غیر ذمہ داری۔ منہ پھٹ۔۔۔ نا عاقبت اندیشی بد مسلط تھی۔ انہیں ہر چیز پر اعتراض تھا۔

افضل سعید کی شادی کا ارمان تھا دل میں بے حد مگر ماں باپ کا آگے پیچھے فوت ہو جانا، شریدل لینا اور پھر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو جگہ پر جمانے میں دن سالوں میں کیسے بدلتے رہے۔ خبر ہی نہ ہوئی۔

دوسرے بڑی باجی کو کراچی میں اتنے سال رہنے کے باوجود یہ شہر ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ موسم، رہن سہن، لوگ، ہنگامو گھربازار، راستے اور پھر اسی شہر سے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنا ایک سراسر احمقانہ خیال تھا۔ وہ ہر سال گاؤں کے چکر میں خاندان برادری کی لڑکیوں کو دیکھا کرتیں۔ مگر حتمی فیصلہ۔ افضل سعید نے کرنا تھا جو اس موضوع پر آتے نہیں تھے۔

چھوٹی باجی اتنی انتہا پسند نہیں تھیں۔ مگر وہ مشترکہ خاندانی نظام کی بڑی بہو تھیں سو جب ملتیں۔ ہر پارٹی

کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔

کوثر اور کینز کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اور افضل سعید ایک روز اچانک دھلا لٹھے کا سوٹ پہن بغیر بری اور باجے گاہے کے دلہن لے آئے۔

دلہن پہلی نگاہ ہی میں سب کو پسند آئی پر جب تک گھونگھٹ گرا رہا اور منہ بند رہا۔۔۔ بعد کی کہانی میں کوئی زیر زبر پیش نہیں۔ سیدھے سیدھے کٹھنر جیلے بڑی باجی کے معیار پر تو وہ خیر کسی بھی صورت پوری نہیں اتری تھی۔

اور بعد کی حرکتیں آخری کیل جیسی۔

اس کی تمام باتیں برواشت کو آجاتی تھیں۔ مگر ناقابل برواشت حرکت اور عمل اور بات اس کا ہر وقت وجہ بے وجہ افضل سعید کا مذاق اڑانا تھا۔ بنا سوچے سمجھے، انتہائی عجیب و غریب مثالیں۔ وہ کبھی انہیں کالا کہتی۔ بڑی باجی کا دل کرتا پھٹوں سے اس کا منہ لال کر دیں۔

قطب مینار کہہ کر دراز قامتی کی بھد اڑاتی تو باجی سوچتیں۔

”بد بخت پانچ منہ باہر ہے۔ اسے دس فٹ اندر رک دیں۔“

وہ افضل سعید کے محبت بھرے دل کو اپنی ٹھوک پر رکھتی تھی۔ پیار لٹاتی آنکھوں سے نگاہیں چرائے وہ اپنے آپ میں مگن رہتی۔ اسے صرف اپنے آپ سے پیار تھا۔ اپنا کھانا پینا، گھربار، شوہر اور بچے۔ ہاں بچوں سے لڑھکی اور ایک چبھی کا بے ساختہ رشتہ۔

جو شاید ہر عورت کے لہو میں موجود ہوتا ہے۔ کسی بلڈ ٹیسٹ کے بغیر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

مگر الفت کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ مضحکہ اڑانا اور بنا سوچے سمجھے کچھ بھی کہہ بھی کسی کو بھی کہہ دینا اس کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ اس کا یہ تنک۔ آمیز رویہ صرف افضل سعید کے لیے نہیں تھا۔

وہ اپنے بچوں کا، ارد گرد کے لوگوں کا، ٹی وی دیکھتے اور اکاروں کا۔ کلی میں سبزی والے تک کا مذاق اڑاتی۔

حد تو یہ کہ اپنے اہل باوا کے لیے بھی یہی انداز اپنائے رکھتی تھی۔

اسے گھر کی کوئی پروا نہیں تھی۔ چولہا جل رہا ہے۔ موٹر چل رہی ہے۔ پانی بہہ رہا ہے۔ فریق میں چیزیں گل سڑ جاتیں۔ پچھلا ختم نہیں ہوتا۔ وہ اگلا منگوا لیتی۔ گھر کی صفائی دھلائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ (فریق کی ہفتہ وار صفائی افضل خود کرتے)

بڑی باجی کے تمام اعتراضات افضل کے لیے ذرا درخواتنا نہیں تھے۔ انہیں الفت کی ہر بات ہر اداسپند تھی۔ آمنہ صداقت۔

صفائی ماسی کر جاتی۔ مگر صفائی ”صفایا“ میں کب بدلتی الفت کو خاک پتہ نہ چلتا۔

ماسی بہ ماسی بدلتی جاتی۔ مگر اس پر نگاہ بھی افضل کو رکھنی پڑتی۔ اب افضل ماسی پر نگاہ رکھیں یا کاروبار پر دھیان دیں۔

گاؤں سے بی بی نسیم نامی بیوہ عورت بھی بڑی باجی تک آمد جنگ اند لائی تھیں۔ مگر وہ جب جب چھٹی لے کر گاؤں جاتی۔ پیچھے افضل کے گھر دھول اڑتی۔

افضل کے کپڑے بنیان تولیہ ہفتہ وار لانڈری جاتے۔ وہ بھی افضل خود اکٹھے کرتے الفت کلف لگے کپڑوں میں ازار بند ڈالتے ہوئے بھی سوسو باتیں سناتی۔

”نیفے تک کلف لگانے کی کیا تک ہے۔ لگتا ہے نالی میں بائس ڈال کر گھر کھول رہی ہوں۔“

وہ پین کو زور زور سے نیفے میں بڑھاتی۔ افضل کی ہر شلوار کے نیفے میں پین کی نوک کے سوراخ ہوتے تھے۔

بڑی باجی اس جیلے پر اقدام قتل کا سوچتیں اور اگر افضل کو بے قابو ہو کر شتا دیکھ لیتیں تو سچ مچ فوری طور پر بال نوچ لیتیں۔

باجی کی موجودگی میں افضل محتاط ہو جاتے مگر سچ تو یہ تھا کہ انہیں الفت کی اوّل جلول باتوں اور حرکتوں پر دل کھول کر ہنسی آیا کرتی تھی۔

بہت کم عمری اور نا بھیجی کے زمانے سے وہ کڑی

محنت و مشقت سے کڑے موسموں سے لڑتے خود فراموشی کی زندگی گزار رہے تھے اور آگے بھی گزارتے رہتے۔

بہن بھائیوں کی ذمے داریاں کاروبار جمانے کی دھن ایک مسلسل جدوجہد کے دور میں الفت ان کے لیے پھجھڑی تھی۔ آبشار بھرنے جیسی ہنسی چنچل باتیں۔

بڑی باجی کو الفت پر تو جو غصہ آتا سو آتا۔ افضل کا حال دیکھ کر تو دانشوں انگلیاں داب لیتیں۔

اور اب اسی بد عقل بد سلیقہ۔ اور بہت سارے بدرکھنے والی الفت کی خالہ زاد اور تایا زاد بہن تمکنت

وہ سب سے بڑی مخالف تھیں۔ چھوٹی باجی دونوں فریقین کو سنتی تھیں۔ کوثر اور کنیر تمکنت سے ملتی رہی تھیں۔ وہ دونوں اسے پسند کرتی تھیں۔ رہے افضل۔ اگر ہاتھ اٹھا کر روٹ دیتا ہوتا تو وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بے ایمانی بھی کر لیتے۔

اور الفت باجی کے تمام اعتراضات ایسے سن رہی تھی جیسے وہ کسی اور کا ذکر کر رہی ہوں۔ مسالہ لگے کئے امرود کی پلیٹ گود میں تھی۔ بڑی باجی کا داغ گھوم گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر اس دیوار کو ڈھونڈنے لگیں جس پر اپنا سر مار سکیں۔

اتنی اہم سنجیدہ گفتگو۔ ساری فیملی کا اقرار دونوں کے لیے اہم۔ انکار ہو تو تمکنت یعنی الفت کے میکے میں ایک مایوسی ناخوشی۔ اور الفت کو کسی انکار اقرار بجاواز سے دلچسپی نہیں تھی۔

اور وہ کانٹے سے بنار کے امرود کھاتے اور افضل اس کی جانب چہرہ کرتے تو ناچاچتے ہوئے ایک جھوٹا سا نکلوان کے منہ میں بھی رکھ دیتی تھی۔

”نہیں تو اس طرف کی تیاریاں کیا مطلب۔؟ ہر شے تو نکاح کے روز ہم لے کر جائیں گے کپڑے انگوٹھی۔ پھول۔۔۔ تمہیں اور بچوں کو شاپنگ

کر دادی۔ اب کیا تم نے اس حال میں دیواروں پر رنگ کرنا یا گلی میں پتیاں لگانی ہیں۔“

وہ بے حد تھکے ہوئے چار بجے لوٹے تھے۔ نماز سے پہلے جھپکی لگانے کا ارادہ تھا۔ الفت کھانا لگا کر بیٹھی تھی۔ ان کی بھوک چمک اٹھی۔

عام طور پر وہ ایسی مسکاتی کے پیچھے چھپے سبب کو بھانپ لیتے تھے مگر ابھی بھوک تھکاوٹ اور دوبارہ جانے کا خیال حاوی تھا۔

”مجھے جاتے ہوئے چھوڑ دیں گے؟“ وہ آخری لقمہ حلق سے اترتے ہی مطلب پر آئی۔

”نہیں الفت! مجھے واپس پہنچنا ہے۔ اگر پیسے اور کچھ کاغذ نہ اٹھانے ہوتے تو میں نہ آتا۔ سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔“

”احد کو میرے پاس لٹا دو۔ اور دیکھو اسد شور نہ کرے۔ چائے اٹھنے پر پی لوں گا۔“

”میں نے آپ سے ٹائم ٹیبل نہیں پوچھا۔“ الفت بد تمیزی سے ہاتھ چلا کر بولی۔ ”یہ کر لیتا تو نہ کر دیتا۔“ ہونہ۔! نظر نہیں آ رہا۔ میں پوری تیاری سے بیٹھی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم مجھے چھوڑ کر آئیں۔ ہاں نہیں تو۔ ہونہ۔“

”دروازہ بند کر دینا۔“ افضل نے کروٹ بدل کر الفت کو بچی بچی کی آگ لگا دی۔

”کیا مطلب دروازہ بند کر دینا؟“ اس نے بے حد بد تمیزی سے افضل کا پیر ہلایا۔

”ہاں۔ ہاں بولیں۔“ افضل سعید کے کھلتے لب دیکھ کر وہ اچھلی۔

”پہلی بات الفت! ایسی اچانک آمد می کی طرح کے پلان مت بنایا کرو۔ ہم کوئی بھی معاملہ پہلے طے کر سکتے ہیں۔ دوسرے تم کو جانا تھا تو صبح سے جاتیں۔“

اب اس وقت بچوں کے ساتھ اس حالت میں کون سے بازار کی خاک چھانوی؟ کچھ لیتا ہے تو کل صبح چھوڑ دوں گا۔ ابھی جاؤ گی تو لوٹو گی کب۔۔۔؟

”تو لوٹنا ضروری ہے کیا۔ میں کیا رات فٹ پاتھ پر

گزاروں گی۔ بھرا پر اگھر ہے۔ ساری زندگی وہیں تو گزارا کیوں ساعیب لگ گیا۔ جو لگ جائے گا اب۔“

”فضول بات مت کرو۔“

”فضول تو آپ کر رہے ہیں۔ سیدھے سیدھے جو کہا وہ کرتے کیوں نہیں؟ اور چھوڑ کر آتے ہیں یا میں خود نکلوں۔“ وہ دفعتا برس دیوچ کر کھڑی ہو گئی۔

”نہروار جو۔ اکیلے نکلنے والی بات کی۔ بالکل نہیں۔“ افضل سعید کو غصہ آ گیا۔

”اتنی تکلیف ہے تو چھوڑ کر آئیے۔ بھاشن مت دیں۔“ اس نے چمک کر کہا۔

”میں یہی تو کہہ رہا ہوں، کل صبح جلدی چھوڑ دوں گا۔ رات کا کھانا کہیں باہر کھا کر لوٹیں گے۔“ افضل کا غصہ بھی ایک بل ہی کا تھا۔ وہ دوبارہ جت لیٹ گئے۔

افتلہ نے بے یقینی کے عالم میں دیکھا تھا۔ اس کی مرضی کا کیا ہوا۔

”تو کرنی تو آپ نے اپنی من مانی ہی ہے ناں۔ میں نے ابھی جانے کا پروگرام بنایا تھا ناں۔“

”اور میں نے کہہ دیا۔ مجھے رات والی بات پسند نہیں۔“ بند آنکھوں کے ساتھ ہی جواب دیا۔

”کیوں؟“ الفت کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

افضل کے پہلو سے لگا احد شور کے باعث کسمسا رہا تھا۔

”یار! اپنے بچوں سے لپٹے بنا مجھے رات کو نیند ہی نہیں آتی۔“ ایک ہاتھ سے احد کو تھپتھا کر دوسرے سے اسد کو خود سے قریب کر کے چومنے ہوئے ان کا لہجہ طمانیت، سرور اور خوشی سے بھر پور تھا۔ بے فکر سا سرشار۔

ان کے دونوں چھوٹے بازو ان کے پہلوؤں سے لگے تھے۔

افتلہ کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹیں۔ اس کی مرضی کی کوئی حیثیت نہیں۔ افضل کی ہمت اس پر فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش۔؟

”تو پھر لیٹے رہیں اپنے بیٹوں کے ساتھ۔ ساری

رات چومتے رہیں اور لپٹاتے رہیں۔
وہ تن فن کرتی باہر لپکی جب تک افضل سمجھ کر باہر نکلتے وہ دروازہ بار کر چکی تھی۔ افضل تیر کی طرح ننگے پیر لپکے۔ وہ گلی کے کونے پر بھی۔ وہ جوتے پہنتے اور اس تک جاتے اور وہ الفت کو بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

گھر کا تماشا گلی میں پیش کیا جائے تو اچھا ہو یا برا زبان زد عام ہو جاتا ہے۔ وہ سکتے کے عالم میں تھے۔ مگر یہ اسد کے رونے کی آواز تھی۔ ”اُمی۔۔۔ ماما جی۔۔۔“ اس کی آوازوں میں اسد کی ریں ریں بھی شامل ہوئی۔
افضل اندر کی جانب دوڑے۔

افضل فطرتاً غصے نہیں تھے اور دوسرے یہ غصہ کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی ساری مصروفیت بھول کر رات میں بچے الفت کے پاس چھوڑ آئے۔ اور اس کی طنز جتنی بتلاتی نگاہوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ساس، سر اور سارے سالیوں کے ساتھ محو گفتگو رہے۔

وہ اس جھگڑے اور الفت کی بد تمیزی کی بھٹک بھی اپنے بہن بھائیوں کو نہیں پڑنے دینا چاہتے تھے۔ مبارا بڑی باجی عین ٹائم پر تمکنت اور اظہر کے رشتے سے منکر نہ ہو جائیں اور اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے تھے۔ ساس، سر اور دیگر بھی ان کے ہم خیال تھے۔

لیکن۔۔۔ الفت۔۔۔
کسی بھی قسم کی محتاط روی اور دنیا داری کا خوف اس کا بال بھی رک نہیں کر سکتا تھا۔
وہ تمام تحفل میں افضل سعید کو نظر انداز کرتی رہی ان کے سائے سے بھی جیسے پناہ مانگتی رہی۔ ایک گروپ فوٹو نہ بنوایا۔ ایک بھی فیملی فوٹو نہیں۔
افضل سعید نے جبراً ہاتھ پکڑتے ساتھ بٹھایا تو

چہرے کے تاثرات اس قدر سیاہ اور پھر ناگوار تھے کہ بچے بچے کو اندر کے حال کی خبر ہو گئی۔
الفت کو اس فنکشن میں دھرا کر دار ادا کرنا تھا۔ سالی بھی اور بھابھی بھی لیکن اس نے ہاتھ جھاڑ رکھے تھے۔

کچھ اس کا اپنا قدرتی نقشہ دل موہ لینے والا تھا۔ اس پر بے فکری کی چمک اور تڑکا تھا اس حالت کے بے پناہ روپ کا۔

پیلے فرائک اور جوڑی دار پاجامے میں سلور کرن لگے دوپٹے کو سر سے گزار پیٹ کو ڈھانپنے گیندے کے پھول بالوں میں پروئے۔

جب وہ پائڈن کے ڈھکن سے وقتاً فوقتاً ”سونف نکال کر منہ میں ڈالتی تو افضل سعید کا دل ڈول ڈول جاتا۔

تصاویر کا سیشن چل رہا تھا۔ وہ لاڈلی کوثر کے ساتھ بیٹھے الفت کو دیکھ دیکھ کر توصیفی جملے کہتے تھے۔
”پاکیزہ کی مینا کماری لگ رہی ہے۔ تمہاری بھابھی سے نا۔۔۔؟“

کوثر کا سر اثبات میں زور زور سے ہلاتا۔
کوثر کی دوسری جانب بڑی باجی تھیں۔

”امراؤ جان ادا کی بد بخت نائیکہ والے پچھن ہیں کم بخت کے سارے ہے۔ اونہہ!“ کوثر اسٹرا کے ذریعے بول چڑھ رہی تھی زور سے اچھو لگا۔

بڑی باجی اور دیگر کو سب کی جانب سے خصوصی پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ مگر الفت کی جوتی سے۔۔۔ وہ اپنے حال مست تھی۔

سب باہر کے مہمان رخصت ہونے پر یہ تمام لوگ بڑے کمرے کی فرش نشست پر آرام وہ حالت میں چائے کے منتظر تھے۔

”تبریز (تمکنت کے سعودیہ والے بھائی جان) تقریباً دو برس بعد آئے گا رخصتی تب ہوگی۔ میں اس سے کہوں گا درمیان میں کوئی موقع نکالے تو جتنی جلدی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“

”کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کی کون سی عمر نکل رہی ہے تیسواں لگا ہے ابھی۔“

”دو سال کا انتظار ٹھیک ہے۔ اظہر بھی تیسویں میں لگا ہے۔ لڑکوں کے حساب سے یہ کافی کم عمری ہے۔ ذرا تعلیم مکمل کر لے۔ اسے پڑھنے کا شوق بھی ہے۔ شادی تو ہو ہی جانی ہے۔ خدا بھائی کو سلامت رکھے جو تعلیم کا خرچہ اٹھا رہے ہیں جو مرضی پڑھنا چاہے۔ باقی کاروبار ماشاء اللہ پھلتا پھولتا جا رہا ہے۔ اللہ اور ترقی دے گا۔“

بڑی باجی اور باقی دونوں چھوٹی بہنیں بھی ہم خیال تھیں۔

”تعلیم اور کاروبار کا مسئلہ نہیں۔ میں ہوں ناں کاروبار بڑھانے اور سنبھالنے کے لیے۔ میں تو کہتا ہوں، آپ ابھی ہی رخصتی دے دیں۔ اچھا ہے استانی گھر آئے گی۔ اظہر کو خود ہی بڑھالے گی۔ بابا بابا۔۔۔ اور عمر بھی ٹھیک ہے۔ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔ تعلیم اور کاروبار ساری زندگی بڑھایا جاسکتا ہے۔ مجھے خبر ہوئی تو میں تو خود بیس برس ہی میں شادی کر لیتا الفت سے۔“

افضل سعید خوش دلی سے کہہ رہے تھے۔
سب کا قہقہہ بلند ہوا۔ الفت نیم دراز تھی۔ جھٹکے سے اٹھی۔ اسے لہجے کی نقل اتارنے میں مہارت حاصل تھی۔

”تو میں تو خود بیس برس ہی میں شادی کر لیتا۔ ہونہ۔۔۔ الفت سے خواہ مخواہ۔۔۔ الفت بے چاری نے آپ کے بیس برس میں۔۔۔ فقط سات برس کا ہونا تھا۔ شادی کر لیتا الفت سے۔“

اس کا نیلا لہجہ۔۔۔ مانوا سے آگ لگ گئی تھی۔
اس کی بات کی گہرائی جانچ کر کمرے میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ سب سے بلند آواز خود افضل سعید کی تھی۔

وہ اپنی اور ان کی عمر کے فرق کو جتانے کے ایک سو ایک طریقے جانتی تھی اور یہ والی مثال ہوئی ایک سو دو

اپنی بات کہہ کر وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ وہ کچھ کھا رہی تھی نجانے کیا۔

بڑی باجی دانت کچکچا کر رہ گئیں۔ الفت کی باتیں۔۔۔ سر پر زور دار ہتھوڑا تھیں گویا۔ افضل کا تقہ۔۔۔

اسد کا اسکول میں داخلہ اور ننھی افزا کی پیدائش بھی الفت کے اطوار بدلتے میں ناکام رہے تھے۔

بی بی نسیم کے علاوہ چھوٹی بچی کے بھلانے کھلانے کے لیے ایک جزوقتی لڑکی بھی رکھ لی گئی۔ مگر الفت کے لیے کوئی ذمہ داری، ذمے داری نہیں تھی۔

وہ پورے دن میں ایک سالن بنانے کا کام کرتی اور اسے بھی افضل پر سو سو مرتبہ جتاتی۔ اس کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا۔ اٹنے ہاتھ سے ہی ڈولی گھما دیتی تو لذت آ جاتی تھی۔

افضل گوشت خور تھے اور وہ نہاری پائے مغز قورے بریانی بنانے میں ماہر۔

افضل کے جسم پر چربی کی تہہ جمنے لگی تھی۔ الفت انہیں جتاتی تو بے فکری سے بات ہنسی میں اڑا دیتے۔ ان کی خوب محنت رنگ جمانے لگی نئے سے نئے قدم اٹھاتے ہوئے اب جھجک یا ناکامی کا خوف دل کو لرزاتا نہیں تھا۔ لیکن۔۔۔

اس بار کا ارادہ دل کو ڈانوا ڈول کر رہا تھا۔
وہ کاروباری مد میں کچھ نئے فیصلے کرنا چاہ رہے تھے اور سرمائے کے طور گھر کو بیچنے کا خیال تھا۔

برکھوں کی زمین جائیداد چھوڑتے ہوئے دکھ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس پانچ کمروں کے گھر اور بڑے سے آنگن سے انہیں بہت انسیت تھی۔ اسے خریدنا بھی اس وقت دانتوں پسینہ لایا تھا اور اب۔۔۔

انہیں کامیابی کا پورا یقین تھا۔ لیکن آخری قدم اٹھانے کا سوچتے ہی غیر ارادی طور پر ٹھٹھک سے جاتے۔

بڑی اور چھوٹی باجی متفکر مگر خاموش تھیں۔ کوثر نے البتہ رونا شروع کر دیا۔

”ایسے موقع بار بار نہیں ملتے چھوٹی!“

”مجھے نہیں پتا۔ آپ سمجھائیے ناں بھابی۔“ اتنے ارمانوں سے میں نے ایک ایک چیز سجائی تھی۔ اپنی پسند کا رنگ دیواریوں کی تصاویر پھول بوٹے اور مٹی پلاٹ اگانے کے لیے کتنے جتن کیے۔ لگتی ہی نہیں تھی۔ مٹی بدلی کھاؤ والی چوری کر کے بھی لگا کر دیکھی اور اب جب اسے پھلتا پھولتا دیکھتی ہوں تو دل خوشی سے بھر جاتا ہے اور بھائی جی کو دیکھیں۔ آپ بھی تو کچھ بولیں ناں۔“ آپ کے دل کو کچھ نہیں ہو رہا کیا؟ کوثر نے اسے چھو کر ہلایا۔

وہ کرسی پر بیٹھی گھٹنے پر سر رکھے جھکی ہوئی پیروں کے ناخن کاٹ رہی تھی۔ حسب عادت ادائے بے نیازی عروج پر تھی۔

”میں کیا اور میرا دل کیا۔ جن کا گھر ہے وہ رکھیں یا بیچیں۔ میں کاہے کو رو کر نحوست ڈالوں۔ نیا خرید لیں گے کرائے پر ملتے ہیں اس سے بھی اچھے۔“

اس کے حقیقت پسند جملے افضل سعد کے حق میں تھے مگر سب کے ساتھ ساتھ انہیں بھی دھچکا لگا۔ الفت کو اس گھر سے ذرا سی بھی انیت نہیں تھی کہ ذرا سادل کڑھتایا آنکھ نم ہوئی۔

یہ اہم ترین فیصلہ تھا۔ کامیابی گھر اور کاروبار دونوں کے لیے بہترین ہوتی۔ اظہر اور اکمل کے کاروباری حوالے سے تحفظات تھے تو دوسری جانب بہنوں کے اپنے خیالات۔ گھر کا بیچنا جان پر کھینے کے مترادف تھا۔

کوثر بھائی سے زیادہ نزدیک تھی۔ وہ اپنی شادی سے پہلے جب سے گاؤں سے یہاں آئی تھی بھائی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اسے کاروبار کی سمجھ بھی نہیں تھی مگر وہ گھروں سے ہی ان سے پوچھتی تھی۔

”تھک گئے ناں۔۔۔ پانی کا پیالا بڑھاتی۔“ کچر کام زیادہ تھا ناں۔“ وہ ان کے پیچھے گھرے ہو کر ان کی گردن سہلاتی۔

اسے کاروباری معاملات کی الف بے کا نہیں پتا تھا۔ مگر وہ پوچھتی تھی۔ نیا کام کیسا ہوا۔ فلاں ہو گیا۔ ڈھمکاں کب ہوگا۔

اور تین سال پہلے اس کی شادی کے بعد افضل سعید کی زندگی سے چھوٹے چھوٹے بے ضرر سوال و جواب کم ہوئے تو وہ بوکھلا سے گئے۔

مگر کوثر کہاں تھی۔ سب سے چھوٹی کینرا پیڑ بھائی لکھائی والی لڑکی تھی۔ وہ ان کی آمد پر چائے پانی پوچھ لیتی۔ بس۔

افضل نے الفت کے ساتھ کوثر والا بے ضرر کاروباری رشتہ بنانا چاہا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ اسے کسی تھکاوٹ فائدے نقصان سے دلچسپی نہیں تھی۔

افضل کا کاروبار مندا جا رہا ہے۔ تو وہ کیا کرے۔ کھانا پینا کم کر دے۔ تو لو کرو یا۔۔۔

مگر وہ کندھے سے کندھا جوڑ لٹو چو نہیں کر سکتی تھی۔ افضل کو کامیابیاں مل رہی ہیں۔ تو ملتی رہیں۔ اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔

اسے بس اپنی ذات سے پیار تھا اور اس سے زیادہ پیار اس کی ذات سے افضل کو تھا۔ اور پیار بھی بے جالا ڈھونڈتا ہے۔

اظہر کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا۔ اسے اب الفت کے سہارے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ وہ جب دل چاہتا فیوز بیگ کے گھر پہنچ جاتا۔ اس کی عزت اور محبت میں اضافہ ہوا تھا۔ بیٹی کا دیور بھیجی کا شوہر۔ مگر

مگر کسی بھی پابندی کے بغیر تمکنت اس کی آمد کی بو پاتے ہی منظر سے غائب ہو جاتی۔ کہیں سے کسی کی

پابندی پابندی کا چکر نہیں تھا۔ مگر تمکنت کو بے حد شرم آتی۔

اظہر کو تو جیسے کسی کا لحاظ نہیں رہا تھا۔ وہ سب کی موجودگی میں اسے لگا رہا کرتا۔ اس کے لیے یہ بڑے مزے کی سچویشن تھی۔ مگر تمکنت بے حد سلجھی ہوئی بلو قار لڑکی تھی۔ ان کا رشتہ مذہبی اعتبار سے مکمل تھا۔ مگر معاشرتی حد بندی ابھی راہ میں حائل تھی۔

وہ جتنا اس کی جانب لپکتا وہ اتنا دامن بچاتی۔ اس روز وہ اسکول سے نکلی تو وہ بائیک پر ٹانگیں پھیلائے ہوئے کھڑا تھا۔ تیز دھوپ میں بھی طمانیت کا عالم یوں تھا جیسے کھنے درخت کے سائے میں کھڑا ٹھنڈک سمیٹ رہا ہو۔

تمکنت کے لیے یہ بالکل اچانک صورت حال تھی۔ یہ تو اس کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ ”تم گھر میں لفٹ نہیں کرواؤ گی تو میں ایسے ہی یہاں آجایا کروں گا۔“

”آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ ارد گرد نکلتی ٹیچرز اور اسٹوڈنٹ کو دیکھتے ہوئے دبی زبان سے بولی۔ ”یہ کوئی جگہ ہے۔ اس طرح۔“

”نہیں تو ہم یہاں ہی تھوڑا کھڑا رہیں گے کہیں دور چلیں گے میری اس بائیک کو ایسا ویسا نہ سمجھو“ 125 ہے۔ افق کے اس پار بھی لے جاسکتی ہے۔

اس نے بائیک کی ٹنکی پر تقاضے سے ہاتھ مارا۔ وہ اسے انکار کرنا چاہتی تھی۔ مگر قریب آتی کو لیگز جن کو دیکھ کر میں کچھ تصویر آشنا تھیں وہ تیزی سے بائیک پر بیٹھ گئی۔

اظہر اور اس کی بائیک دونوں ہواؤں میں اڑنے لگے جیسے۔

وہ اسے لیے ایک مشہور شاپنگ ایریا تک آگیا۔ پہلے شاپنگ کا ارادہ تھا پھر اسے خیال آیا۔ وہ صبح سے اسکول میں مغز ماری کر رہی تھی۔ بھوک لگی ہوئی تو اوپر بنے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔

ویٹر کو آرڈر اس نے کیا۔ تمکنت اتنے عرصے میں منہ پھلائے انگلیاں مروڑتی رہی۔

”مزے دار۔۔۔ یار!“ اظہر نے کھانے کی ہلیٹس دیکھ کر چخار ابھرا۔

”شروع کرو ناں۔۔۔“

”مم۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یہ۔۔۔“

”کیا کھانا اچھا نہیں لگتا؟“

”نن۔۔۔ نہیں دراصل مجھے اچھا نہیں لگتا کہ۔“

”کیا میں اچھا نہیں لگتا؟“

”نہیں نہیں۔۔۔ یہ اس طرح ملتا۔ لوگ۔ لوگ۔“

کیا۔ بلیک پلیس پر۔۔۔“

”مجھے بھی۔۔۔“ اظہر نے ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

”مجھے بھی ایسے تیز دھوپ گرمی کا خشک موسم۔۔۔ بند

ریشٹورنٹ میں ملنا اچھا نہیں لگتا۔ کالے سیاہ بادل

ہوں۔ کن من ٹھنڈی ہوا میں۔ ہریالی کی مہک۔

تمہارے بالوں میں پھول گندھے ہوں۔ جب ہم گھر

سے نکلیں۔۔۔ اور یہ بیک گراؤنڈ میں آریٹیفشل

دھنیں نہ ہوں۔ میں بجائوں اور تم گاؤ۔۔۔ گاتے گاتے

بارش تیز ہو جائے۔ پھر رسات میں ہمارا ایک ڈوسٹ

کیسا؟“

تمکنت کی آنکھیں حلقوں سے اٹل پڑیں۔ پھر اپنی

بے ساختہ ہنسی کو چھپانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

”یار تم کھل کر ہنستی بھی نہیں ہو۔“ اس کی

آنکھوں سے چھلکتی ہنسی اس کا دل سرشار کر گئی تھی۔

”یہ کھل کر ہنسنے کا موقع نہیں ہے۔“

”اور وہ موقع کب آئے گا؟“

”جب آپ بڑے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے

افضل بھائی نے یہ ہی کہا ہے۔“ اس نے فوراً تصحیح

کی۔

”تمہارا کہنے کا مطلب ہے، میں ابھی بڑا نہیں

ہوا۔“

”نن۔۔۔ نن نہیں۔۔۔ مم، میرا نہیں ہے۔ آپ

میری کلائی تو چھوڑیں ناں۔۔۔ پلیز اظہر! میرا ہاتھ تو

چھوڑیں۔۔۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔“ وہ اس کی اچانک

جسارت پر حیران ہوئی اور آنکھوں میں نمی ابھر آئی۔

”ارے تمکنت۔۔۔!“ اظہر نے گھبرا کر کلائی چھوڑ دی۔ اس نے مصنوعی خفگی دکھاتے ہوئے کلائی تھامی تھی۔ اس کی مروانہ سخت پکڑ سے کلائی پر سرخ شکبہ ابھر آیا۔

”سوری یار۔۔۔!“ وہ دونوں ہاتھوں سے کلائی سسلانے لگا۔

”چھوڑیے۔ لوگ دیکھیں گے۔“ وہ منمنائی۔
”میں لوگوں سے نہیں ڈرتا۔“ وہ خفا ہوا۔ ”اور تمہیں بھی دنیا سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں ناں تمہارا محافظ۔“

”ٹھیک ہے لیکن ابھی تو چھوڑیں ناں۔ ٹھیک ہے کچھ نہیں ہوا ہے۔“ وہ آستین ہاتھ تک درست کرتے ہوئے صلح جو انداز میں بولی۔

”کھانا کھالو۔ تو پھر تمہیں شاپنگ کرواؤں گا۔“
”لیکن مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ تو ہے میرے پاس۔“

”معلوم ہے یار! تم کماتی ہو۔ ہر چیز لے سکتی ہو اور ہم ابھی زیر تعلیم ہیں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا اظہر! وہ گھبرا گئی۔
”اتنا کماتی ہو اور کلائیاں خالی رکھی ہوئی ہیں۔

چوڑیاں نہیں خرید سکتی ہو۔“
وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ ایک ڈسینٹ ٹیچر اسکول میں چوڑیاں چڑھا کر جاتی کیا اچھی لگے گی۔
مگر وہ خفا ہو گیا تھا اور بد گمان بھی۔

”چوڑیاں تو آپ دلائیں گے۔ آپ نے آج تک لے کر ہی نہیں دیں اسی لیے میں نے اپنی نہیں۔“

اس نے جھوٹ سچ ملا کر کہا اور وہ فوراً خوش ہو گیا۔

”سچ۔۔۔ سچ کہہ رہی ہوں ناں؟“
”بہت سارے سیٹ لوں گی۔ اتنے پیسے ہیں ناں۔“
وہ شرارت برآمادہ تھی۔

اس کا دم خم شریر دل موہ لینے والا لہجہ۔ اظہر کا دل لوٹ پوٹ ہو گیا۔

”اضافی کلائیوں کی ضرورت پڑ جائے گی۔ تم صرف پسند کرنا۔“
”نہیں۔ آپ کی پسند سے۔“ تمکنت نے اسے بے حال کر دیا تھا۔

الفت ہر فن مولا تھی۔ خصوصاً ”چھوٹی سی بات کو بڑا بنانا اور بڑی بات کو چھوٹا ثابت کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

اس نے نئے محلے میں آتے ہی تھائی اور بورت کا روٹا ڈال دیا۔ افضل کے پاس فی الوقت اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ وہ نئے پروجیکٹ میں بے حد مصروف تھے کامیابی کا راستہ روشن تھا۔ وہ ان تھک محنت کر رہے تھے دن رات۔۔۔

صبح کو نکلتے تو رات گئے لوٹے، اگلی صبح سویرے کا الارم لگا کر۔ یہاں الفت کی سہیلیاں نہیں تھیں۔ دلچسپی کے لیے کوئی چیز نہیں۔۔۔

”مجھے ڈش لگوادیں۔“ اس کی نئی فرمائش۔۔۔
”یار! میں نے سنا ہے اس پر بہت بے ہو وہ پروگرام آتے ہیں۔“ افضل نے خدشہ بیان کیا۔

”سنا ہے۔“ الفت نے چٹکارا بھرا۔ ”دیکھا تو نہیں۔“ اس نے آنکھیں میچیں۔

”یار! اظہر! اکمل بھی آتے ہیں ہفتہ وار۔ کیا سوچیں گے۔“

”سوچیں گے نہیں۔ دیکھیں گے نت نئے پروگرام۔“ اس نے ایک بار پھر آنکھ دیانی۔

”ڈش دیکھنے سے پہلے تمہارا یہ حال ہے بات بے بات آنکھیں منک رہی ہیں۔ تو بعد میں۔“

”بعد میں۔۔۔ میں بالکل خراب ہو جاؤں گی سرجی!“
الفت کو مطلب پورا کرنا تھا۔ وہ بڑے دل موہ لینے والے انداز میں ان کے گلے میں جھول گئی۔

الفت کا ایسا بے ساختہ التفات۔ افضل کے لیے حد ہوتا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے مان گئے۔

”دیکھیں ناں پھر گھر سے باہر نہیں جاؤں گی۔ آپ

کو پسند نہیں ہے ناں میرا گھر سے نکلنا۔ فل ٹائم پاس۔“
الفضل سر ہلا کر رہ گئے۔ ورنہ کہہ سکتے تھے۔ اس کے پاس تو ”گزارنے“ کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا چاہیے تھا کہ پاس کرنے کی فکر پالتی۔

تین بجے۔ نورے گھر کی ذمہ داری اگر وہ ایک سلیقہ مند گریجویٹ کی طرح وقت کی تقسیم کرتی تو سر سنبھالنے کا وقت بھی نہ ملتا۔ مگر۔۔۔ مگر وہ الفت تھی۔

اور الفت نے خراب تو کیا ہوتا تھا۔ مزید لا پرواہ ہو گئی۔

نہیں افزا جھولے سے گری بڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پر گومڑا بھرا تھا اور چیخ چیخ اس کا گلاب بند ہو چکا تھا۔

اشارہ پس کے کسی سوپ کی ڈش ڈش ڈھاں ڈھاں سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ کمرے کے باہر موجود جوتوں کا ڈھیر تیار رہا تھا کہ اندر نئی نکور سہیلیاں موجود ہیں۔ افضل نے دانت پیس کر خود کو پرسکون کرنا چاہا۔

وہ بچی کو اٹھانے جھکے پھر رک گئے۔ جسم کے اندر خون کی جگہ گرم سیال دوڑ رہا تھا۔

”الفت۔ الفت۔“ وہ حلق کے بل چلائے۔
اچانک آواز پر وہ چونکتی گرتی پڑتی آئی۔ افضل کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ افضل کے پاس آٹومٹک لاک کی چابی موجود رہتی تھی۔

الفضل کے ہاتھ کے اشارے اور نظروں کے تعاقب میں وہ ٹھٹک گئی۔ ”ارے یہ کب الٹی؟“

”اور یہ کب گری اور کب اس کا یہ حال ہوا؟“
الفضل نے دانت کچکچا کر جملہ مکمل کیا۔

”تو نہیں چلا۔۔۔ دراصل۔“
”مجھے معلوم ہے الفت! تمہیں کچھ بتا نہیں چلتا۔

تم۔“ انہیں ایک دم احساس ہوا بچی ابھی تک اسی حال میں تھی۔ وہ تیر کی طرح بڑھے تھے اور بچی کو سینے سے لگا لیا۔ وہ گلاب ڈکڑو رہی تھی۔ افضل نے اسے سینے سے لگایا۔

”لگا لیا۔“ اس کی سہیلیاں دبے قدموں سرک گئی تھیں۔

اس نے خاموشی سے گھر کو بلالیا۔

بچی کے ہاتھ کو بوسہ دیتے افضل خود کو پرسکون کرنے کی سعی کر رہے تھے۔

افزا کے ہاتھ پر گومڑا تھا۔ اس کے سر کے اوپر نمی تھی۔ جس نے سفید کلف لگے سوٹ کے گریبان کو سرخ کر دیا تھا۔

سرعت سے ان کی انگلیوں نے زخم ٹٹولا پھر نظریں زمین پر جمیں تو چابی کا کچھا دکھائی دیا تنجانے بچی کس طرح گری تھی۔

الفضل کے نرم ہاتھوں کا لمس اور ہونٹوں کی گرائش۔

بچی سسک رہی تھی اس کے کپڑے بھی گندے تھے۔ الفت صورت حال کو سمجھنے اور تاویل میں گھڑنے کے عمل میں تھی۔

اسے ہوش آیا جب افضل کے پے درپے دو تھپڑ اس کے گالوں پر پڑے اور بے حد صدمے کے زیر اثر ہڑبڑا کر لڑکھڑاتی گری تو بلنگ کے کونے نے ہاتھ کو لہولہا کر دیا۔

الفضل کو افزا کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بچی کو دھلانے کے لیے باہر نکلے۔ وہ فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتے تھے۔

اور واپسی کا منظر ان کی توقع کے برعکس تھا۔ باہر سے کنڈی لگی تھی۔ اسد اور احد کے رونے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔

ان کا غصہ بے حد شدید تھا اور گھر سے الفت کو غائب دیکھ کر دو چند ہو گیا ان کا پارہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ وہ الفت کی لا پرواہیوں کے سامنے ہمیشہ ڈھال تھے۔ مگر اس وقت۔۔۔ فون کر کے۔۔۔ کنیز کو بلوایا۔ اس کی شادی کو دو سال ہوئے تھے اور اس کے بچے نہیں تھے۔ اسے تین بچوں کو سنبھالنے کا قطعاً تجربہ نہیں تھا۔ گھٹ گھٹ کر روتا اسد۔۔۔ گلابھاڑتا ضدی احد

عادتاً ماں کی کالی تھا اور دودھ کے لیے تڑپتی افزا اس نے خاموشی سے گھر کو بلالیا۔

اس نے خاموشی سے گھر کو بلالیا۔

اس نے خاموشی سے گھر کو بلالیا۔

اس نے خاموشی سے گھر کو بلالیا۔

اس نے خاموشی سے گھر کو بلالیا۔

اس نے خاموشی سے گھر کو بلالیا۔

اس نے خاموشی سے گھر کو بلالیا۔

اس نے خاموشی سے گھر کو بلالیا۔

کوڑا اپنی بچی سنبھالتی گرتی پڑتی پنہی۔ سب سے خراب حالت احد کی تھی۔ وہاں کے لیے رو رو کر پاگل ہو رہا تھا اور افزا کی بھوک۔۔۔ وہ فیڈر منہ میں لینے کو تیار نہیں تھی۔

کوڑا کیسا جبر کرتی۔ اتنے ننھے بچوں پر۔۔۔ کنیز گھر کی حالت دیکھ دیکھ حیران تھی اور آستینیں چڑھا کر پائے ننھے اٹھائے کونوں کھدروں میں گھسی گھسی۔ لی بی نسیم ایک بار پھر گاؤں یا ترار گئی ہوئی تھیں۔ ”بھابھی کو لے آ میں بھائی!“ کوڑا ہار گئی۔ ”نہیں لاؤں گا۔ آج کی حرکت کے بعد کبھی نہیں لاؤں گا۔“

”ان کی حرکتیں ہمیشہ کی یہی تھیں۔ آج کون سی انہونی۔“ کوڑا تاسف سے بولی۔ ”فضول مت بولو اور سنبھال سکتی ہو تو سنبھالو ورنہ میں کوئی اور بندوبست کرتا ہوں۔“ ”جو مرضی بندوبست کریں مگر بھائی جی! افزا اور احد کا حال بہت خراب ہے۔“

افضل نے کوئی جواب نہ دیا مگر چرے کی سختی اور قطعیت کی چادر ذرا نہ سرکی۔ کوڑا امید بھری نگاہوں سے ان کو دیکھتی رہی مگر وہ ریموٹ کنٹرول کا سیل بدل رہے تھے۔

”جب سچ مچ منانے کی ضرورت بلکہ منت ترے کی ضرورت ہے تو اکڑ گئے ہیں اور جب ایک ٹھڈے کی ضرورت تھی تب بھاگ بھاگ کر جاتے تھے۔ افزا کا حال یہ ہے کہ ان کے پیروں گر جائیں۔ اور احد کی چیخ و پکار۔۔۔ اف ٹاک رگڑ لیں۔“

کوڑا نے طے دل سے کہا۔ افضل پر ذرا اثر نہ ہوا۔ ”ویسے بھائی جی آج آپ کو ہو کیا گیا تھا؟“



”اپنی بیٹی کے لیے اتنی محبت۔۔۔ میں کیا کسی کی بیٹی نہیں تھی اور چلو غلطی ہو گئی مگر بچی کو میں نے گرایا تو نہیں۔ خود بخود گر گئی۔ اپنی بیٹی ہی خون گوشت سے بنی ہے۔ دوسرے کی اولاد تو لکڑی کا بے جان ٹکڑا راستے

کا پتھر ٹھوکر مار گزر جاؤ۔ کیوں جی؟“ الفت کی آنکھیں ماتھے پر ٹکی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی۔۔۔ اپنی بیٹی کی گردان یوں کر رہی تھی جیسے وہ افضل سعید کی مانگے مانگے کی اولاد ہو یا کم از کم الفت کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔

کوڑا ششدر تھی۔ وہ بمشکل سوئی افزا کو ابھی تک پیرے پیرے ہاتھ سے تھیک رہی تھی۔ بچی گود میں تھی۔ ”بھابھی! آپ کی اپنی بچی۔۔۔“ کنیز الفت کی چلتی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

”ارے جاؤ۔۔۔ میری ہوتی تو۔۔۔ میں جو مرضی کرتی۔ یہ ہیں ناں بیٹھے اس کے اصل مالک۔۔۔ اب کیوں آگئے؟ میں نے کوئی جان بوجھ کر گرائی تھی۔ بولیں ناں ابامیاں۔۔۔“

اس نے پریشان عرق ندامت سے بھیلے فیروز بیگ کا شانہ جھنجھوڑا۔

”میں۔۔۔ میں کیا کہوں۔“ وہ واقعی کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھے۔

”ہاں ہاں۔ آپ کیوں لیں گے میری سائیڈ جس کی روٹیاں کھاتے ہیں اس کی مالا چپیں گے ناں۔“ الفت کی بد لحاظی کی حد تھی۔

”بکو اس نہ کرو الفت!“ افضل سعید کو حد درجہ ناگوار گزرا۔

”دیکھیے۔۔۔ دیکھیے۔۔۔ کیسی منہ زوری سے بول رہا ہے یہ شخص۔۔۔ اب یاد آ گیا کہ الفت ماں ہے۔ جب ٹھوکر مار کے گئے تب کیا میں ماں نہیں تھی۔“ وہ حد درجہ بد تمیزی سے ہاتھ نچانچا کر بول رہی تھی۔

کوڑا کنیز پہلو بدل کر رہ گئیں۔ افضل سعید نے دانت کچکچائے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے۔ احد ماں سے چپکا کھڑا تھا مگر ماں نے ابھی تک اس کو پیار سے چھوا نہیں تھا۔ بچے کے لیے کافی تھا۔ ماں نظروں کے سامنے تھی اور وہ اس سے لگا کھڑا ہے۔ وہ اس کے چیخ کر بولنے سے پریشان تو تھا مگر۔۔۔ ماں اور باپ دونوں سامنے ہیں۔ وہ بے فکر ہو چکا تھا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔ کہہ دیجئے اس شخص سے خود صبح کے نکلے شام کو لوٹیں گے۔ میرے گھر سے نکلنے پر پابندی۔۔۔ جی نیا محلہ ہے تو پرانے میں کون سا میں گلی میں ہچک (پہل دوج) کھیلتی تھی۔ ہاں نہیں تو۔“

”میں افضل کو اچھی طرح جانتا ہوں الفت۔۔۔! تمہاری حرکتیں پہلی بار ہی۔۔۔ تھپڑ کھانے والی تھیں۔ آج بھی تم نے کوئی حد کر دی ہوگی۔“ ابامیاں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ الفت کا ماتن من جھلس گیا۔

اس کی آنکھوں سے شعلے اور سانسوں سے پھنکاریں نکلنے لگیں۔

”اٹھو اور بچی کو دودھ دو۔“ ابامیاں کے اشارے پر کوثر نے بازو بڑھا دیے۔ افزا کے ہونٹ دھیرے دھیرے لٹک رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

”کیوں۔۔۔ کیوں۔۔۔ میں کیا گائے ہوں؟“ اس نے بچی پر گہری نگاہ ڈالی۔ دل کو کچھ ہوا تھا۔ مگر بچی اب دودھ پیے گی افضل کے چہرے کی اس طمانیت نے

دل غم پھر گھما دیا۔

ابامیاں نے آگے بڑھ کر کوثر کی گود سے بچی لے کر الفت کے بازوؤں میں۔ جبراً گھسادی۔

ماں کا رنگ روپ، آواز، انداز، کردار و اخلاق خواہ جیسا بھی ہو، بچے کے لیے اس کی پہلی پہچان اس کے وجود سے اٹھتی تمک ہوتی ہے۔ ماں کی گود کی خوشبو سانس میں جاتے ہی وہ پرسکون ہو چکی تھی۔ دنیا کے ہر بچے کی پسندیدہ خوشبو ماں کے سینے کی بو ہوتی ہے۔

”عورت کی زبان اور مرد کا ہاتھ ایک بار کھل جائے تو اس دور کو دوبارہ گھر نہیں لگائی جاسکتی۔“

افضل سعید کا نیا کاروبار دن دو گنی رات چو گنی ترقی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ انہیں توقع سے بڑھ کر فائدہ حاصل ہوا تھا اور مزید نئے راستے کھلے تھے۔

سب بہت اچھا ہو رہا تھا۔ لیکن افضل کے دل کا

ایک بڑا حصہ بے سکون تھا۔ انہوں نے بی بی نسیم کو جلد بلوایا تھا۔ انہوں نے مستقل ایک بچی گھر رکھ دی تھی جو صرف بچوں پر نگاہ رکھے گی۔ الفت کی طرف سے ایک گرہ پڑ گئی تھی۔

وہ اپنی دلچسپیوں میں بچوں کو نظر انداز تو کرتی تھی مگر نقصان پہنچ جانے والا خیال۔۔۔ دو جمع چار کرتے ہوئے حاوی رہنے لگا تھا۔

الفت سے محبت وہیں کی وہیں تھی۔ مگر اب انہوں نے آنکھیں کھلی رکھنی شروع کر دی تھیں۔

انہیں اس روز کی لاپرواہی پر بے پناہ غصہ تھا۔ مگر ان کے دل کے اندر انتہا درجے کی شرمندگی سانس لیتی تھی اور ان کی حساس طبیعت اندر ہی اندر سسکیاں بھرتی۔

انہوں نے۔۔۔ افضل سعید نے الفت پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ اپنا ہاتھ توڑ ڈالتے۔ واقعی بچے جھولوں سے گرتے ہیں مگر آج تک کوئی بچہ جھولے سے گر کے مرا تو نہیں۔ اور بچی تیسرے دن تک فٹ فاٹ ہو کر قلعاریاں مارنے لگی تھی۔ مگر الفت کی آنکھ کے عین اوپر ماتھے پر لگا چوٹ کا نشان اب مرنے کے ساتھ ہی جانا تھا اور افضل سعید شدید احساس جرم میں مبتلا تھے۔

ان جیسے نرم دل، حساس محبت کرنے والے شخص کو اپنی محبت کو اس طرح ٹھوکروں کی زور پر نہیں رکھنا چاہیے تھا۔

جن گالوں کو وہ یوں چھوتے تھے جیسے نودمیدہ گلاب کی نازک پتیاں ان پر پھپھروں کی برسات۔۔۔ وہ نسیم کھاتے ہیں کہ آئندہ زندگی بھر ایسا نہیں ہوگا۔

انہوں نے اپنے آپ سے عہد کیا کچھ بھی ہو دوبارہ ایسا کم ظفری کا عمل نہیں دہرائیں گے۔ مگر وہ بھول گئے۔

”وعدہ تو ٹوٹ جاتا ہے۔“

اسد افضل پہلا بچہ ہونے کی وجہ سے خاندان بھر کا

لاڈلا تھا۔ الفت نے تو اسے جنم دیا تھا۔ مگر احد افضل کی پیدائش کے بعد ان کا دھیان احد کی جانب زیادہ تھا۔

اسد نے رنگ روپ باپ کا چرایا تھا۔ فقط اس کی آنکھیں ہو سہو ماں جیسی تھیں۔ جبکہ احد بنا بنایا الفت تھا۔ اس کی شکل، چال، ڈھال، آوازیں ضدی طبیعت اور من مانی کی عادت روٹھنا سب الفت تھا۔

اکلوتی بی بی افزا ماں اور باپ دونوں کا مکسچر تھی۔ افضل سعید کا گمان تھا کہ وہ سب سے زیادہ پیار اسد سے کرتے ہیں۔ مگر یہ افزا نے تو آکر ان کے پورے دل پر قبضہ جمالیا تھا۔

لیکن۔۔۔

ایک روز۔۔۔

بی بی نسیم کام والی چھوٹی بچی کو ڈپٹ رہی تھیں۔

”تو اپنے اندازے (اندازے) اپنے کول رکھ۔ بیگم بی بی کالی کو پیار نہیں کرتیں تو کیا تیرے ورگی چھٹکی (خیرے جیسی چھوٹی) کو دکھا کر کرے گی۔“

”میرا یہ مطلب نہیں۔۔۔ بی بی!“ بچی کے انداز میں جھجک اور نہ سمجھا سکنے کی الجھن تھی۔

”افزا کتنی پیاری گڈی ورگی ہے سچی اگر اس کا ساہ کھٹے کا ڈرنہ ہو (سانس گھٹنا) تو شوکیس میں سجاؤ۔۔۔“

بر بیگم بی بی تو اسے اپنے پاس ہی نہیں آنے دیتیں۔

بھبی ہاتھ بھی آگے کرے تو پیچھے دھکیل دیتی ہیں اور جب بچوں کو سپر ہلیک کھلاتی ہیں تو ناں کچھو۔۔۔ کہ۔۔۔

”بس کرنی ڈھائی نئی فسادیں۔۔۔!“ بی بی نسیم ششدر تھیں۔ وہ تو یہ سمجھتی تھیں کہ اس بات کا علم صرف انہیں ہے (الفت بچی سے فرق کرنے لگی تھی) اور ہر تو کم عقل بچی بھی یہی دیکھ اور سب سمجھ رہی تھی۔

”تجھے کالی کھڈائے کے لیے رکھا ہے (بچی کھلانا) کہ تو نے رزلٹ کارڈ بنانا ہے خبردار جو کسی اور کے آگے بکواس کی تو۔“

لے۔۔۔ دس تے۔۔۔ ماں کا پیار ناپنے چلی ہے۔

ڈڈی سپر کورٹ کی بچ۔۔۔

شک رسی کے سرے پر گلی آگ کی طرح تھا اور اس کے دوسری جانب دھماکہ خیز مواد سے بھرا گولہ۔۔۔ یہ ناقابل یقین منظر تھا۔ یہ سچ تھا یا کہ جھوٹ۔۔۔ مگر اندھا بھی وہ دیکھتا جو بینائی والا دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔

چھوٹی باجی کی چھوٹی بیٹی افزا سے تھوڑی چھوٹی تھی۔ وہ چھٹیاں گزارنے بھائی کے گھر آئی ہوئی تھیں۔

الفت بڑے سے پیالے میں سوچی کا پتلا حلہ لے لے بیٹھی تھی۔ اسد۔۔۔ احد اور دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ خود الفت بلکے اور گہرے نیلے لائن کے سوٹ میں نہائی دھوئی نکھری تیار تھی۔

وہ ایک چچ اسد کے منہ میں دیتی۔۔۔ وہ پانچ سال کا بچہ تھا اور خوب لطف اندوز ہو کر کھاتا تھا احد کچھ لاڈ کر کے کچھ منہ جدا کر ایک کی جگہ دو چچ لے کر اگلی باری دیتا تھا۔ کرن بہت چھوٹی الفت اس کو چھوٹے سے چچ کے سرے پر بہت معمولی سا حلہ رکھ کر اس کے منہ میں دیتی پھر نفاست سے سب سے ہونٹ صاف کرتی۔

یہ منظر مکمل خوب صورت مٹھانیٹ انگیز اور بے عیب تھا۔ مگر نہیں۔۔۔

جب افزا کی باری آتی۔ الفت اس کے منہ تک چچ لے کر جاتی۔ وہ منہ کھولتی۔ آنکھوں میں چمک ابھر آتی۔ وہ چچ کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر قلعاری مارتی اور وا کر کے رنگ بال پر زور زور سے خوشی کے عالم میں ہاتھ مارتی۔

مگر یہ کیا۔۔۔ بھرا چچ اس کے ہونٹوں اور دودانت سے نکڑا واپس پلٹ جاتا۔ بچی تیز تیز زبان نکال کر محاس کو چاٹتی۔ مگر اس کے منہ میں تو کچھ نہ جاتا۔ پیٹ تو ویسے ہی خالی۔

دو ایک چچ اسد۔۔۔ دو تین چچ احد۔۔۔ پھر افزا۔

افزا وا کر کے رنگز پر زور۔۔۔ زور سے ہاتھ مار کے ماں کو متوجہ کر رہی تھی۔ اس بار الفت نے جان چھڑاتے انداز میں ایک چچ منہ میں دیا۔

بچی کے منہ سے جب جب کی تیز آوازیں ابھریں۔ اسے بہت بھوک لگی تھی اور بی بی نسیم کے

ہاتھ کا حلوہ پسندیدہ ترین۔

الفت بچی کو اذیت دے رہی تھی۔

وہ تین چار بار بچے کو محض دانتوں سے ٹکرا کر واپس لے لیتی تھی۔ وہ اس کے ہونٹوں کو حلوہ چکھانے کے بعد چبچب کر منہ میں دیتی تو وہ معصوم اس لاڈ اور امتیازی سلوک پر تالی پٹیتا۔

”ماماجی۔۔۔ بہنا زیادہ بھوکے ہے“ اسے دوتاں۔“ اسد کا پیٹ بھرا تو بہن کا احتجاجی ہاتھ پیر بار تان نظروں میں آگیا۔ ”اب میرا پیٹ بھر گیا۔“

”تو دے رہی ہوتاں!“ الفت نے بے پروائی سے کہا۔

کرن کا پیٹ بھر گیا تو وہ کھلونوں سے ہاتھ مارنے لگی۔ اسد نے گاڑی چلانا شروع کی تو اسد اس کے پیچھے لگا۔ پیالا تقریباً خالی تھا۔ دیواروں سے لگے حلوے کو اپنی شہادت کی انگلی سے چاٹ الفت کھڑی ہو گئی۔

افزا کا پیٹ بدستور خالی تھا۔ وہ وا کر کے اندر زور زور سے باؤں مار رہی تھی۔ گردن اٹھا کر اس کو اور ماں کے ہاتھ کے خالی پیالے کو دیکھ رہی تھی۔ اب اس کے چیخنے کا وقت شروع ہوا چاہتا تھا۔

”اے کاکے! آکر اسے فیڈر بنا دے اور اندر لے جا کر جھولے میں ڈال۔ نیند کرے گی۔“ الفت چلا کر پٹی۔

پشت پر دونوں ہاتھ باندھے افضل سعید سر ہونگا ہوں سے اسے اور پیالے کو بغور دیکھ رہے تھے۔

”بچے بھوکے ہو رہے تھے۔“ ان کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں الفت نے مسکرا کر کہا۔

افضل سعید لاکھ دل کو سمجھاتے۔ آنکھوں دیکھی کو جھوٹ کہتے۔ مگر بعض اوقات حقیقت وجدان کی طرح ہوتی ہے۔ بے عیب یقین۔ فقط یقین کرنے کے لیے۔

الفت بھونچکی رہ گئی۔ اس کا جرم کیا تھا؟

”ارے یہ بیٹی ہے۔ نو ماہ پیٹ میں رکھا۔ دودھ پلایا۔۔۔ مانو آستین میں سناپ رکھا۔ سناپ کو دودھ پلایا۔“ الفت خون خوار نگاہوں سے گل گو تھنی افزا کو دیکھ رہی تھی۔

”جس دن سے میری زندگی میں آئی ہے۔ میری تو مصیبت آگئی۔ مار کٹائی، کالم کلوچ۔ اپنی بیٹی اپنی ہے۔ کوئی گرم آنکھ سے نہ دیکھے۔ اور ہم کسی کی اولاد نہیں اور یہ ہمارے بابا میاں بیٹھے ہیں۔ سر جھکائے۔ آج بھی نہ پوچھیں گے دامادگی۔ ہماری بیٹیا کے گال طابچے لگا لگا کیسے لال کر دیے۔ آج بھی میرا ہی قصور نکلے گا۔“

الفت کی مرضی کا ماحول تھا۔ سب خاموش ہارے ہوئے اور اسے خطاب کی کھلی جھوٹ۔

افضل سعید کے لیے بہت مشکل، ناپسندیدہ کام تھا کہ وہ بی بی نسیم اور کاکے سے تفتیش کریں اور پھر وہ آنکھوں دیکھی۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو خیال آیا۔ شاید آنکھوں دیکھی بھی غلط ہو۔ یونہی بدگمانی سی۔ کوئی ماں اپنی اولاد سے بھید بھاؤ کیسے کر سکتی ہے اور وہ بھی اپنی لاڈلی اکلوتی دس ماہ کی بیٹی۔ تین دن تک بچے خود ہی سنبھالتے رہے۔

لیکن افضل سعید غصہ اور عناد پالنے والے شخص نہیں تھے۔

دو نم۔ احد کی ضد اور رونا پٹنا ناقابل برواشت تھا۔ سب اسے سنبھالنے اور سمجھانے سے قاصر تھے۔

افزا کو سنبھالنا نسبتاً آسان تھا۔

احد کی ضد کے آگے وہ بھی اڑے رہے۔ پھر اسد کا بے حد خاموش رویہ۔ وہ ماں اور باپ دونوں کے درمیان سونے والا بچہ تھا۔ رات باپ کی جانب سے کروٹ بدل جب سسکیاں دبا دیا کر بے آواز مماماجی کہہ کر رویا۔ تو افضل سعید کے جسم سے جیسے کانٹوں کا جھاڑ لپٹ گیا۔ رات کے دو بجے کا عمل نہ ہوتا تو اسی وقت جاتے اور اب صبح صبح وہ کوثر، ظہیر بچوں اور بی بی نسیم کے

ہمراہ حاضر تھے۔ احد حسب عادت ماں کو دیکھتے ہی مطمئن ہو کر کھیل میں مگن ہو گیا۔ اور خود ہی مماماجی کہہ کر لپٹ گیا۔ تو الفت نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ افزا بدستور بی بی نسیم کی گود میں تھی۔ اور الفت یا قاعدہ افزا اور افضل سعید سے منہ موڑے کھڑی تھی۔

افضل سعید سے تو منہ موڑنے کی وجہ سمجھ میں آتی تھی لیکن افزا سعید سے۔؟؟؟

”بیٹی تو ماں کی سہیلی ہوتی ہے۔ یہ تو سنبھالنا بن کر آئی۔ ابھی تو نہ منہ دانت نہ پیٹ میں آنت۔ تو ماں کی چوٹی نچوادی۔ کل کو کھڑی ہو گئی۔ تو مٹی چٹوائے گی۔ ہاں نہیں تو۔“

فیروز بیگ اور اماں سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ وہ افضل سعید کے غیر انسانی سلوک پر احتجاج کر سکتے تھے۔ ناراض ہو سکتے تھے۔ لڑ سکتے تھے۔ گالیاں دے سکتے تھے۔ پر الفت کے رویے کے لیے کس در کو کھٹکھٹاتے۔

شوہر مارے تو انسانی حقوق کے علمبردار آجاتے ہیں۔

اتنی چھوٹی بچی پر ماں کا غیر انسانی رویہ مبہمانہ سلوک۔

الفت ان کا گھر تھی۔ ان کی بیوی۔ بچوں کی ماں۔ اور سب سے بڑی بات ان کی محبت۔ وہ اسے لیے بغیر کیسے گھر جا سکتے تھے۔

یہ ان کی زندگی کا اہم ترین وقت تھا۔ نیا کاروبار زبردست کامیابیاں سمیٹ رہا تھا۔ وہ عنقریب ایک گھر خریدنے والے تھے۔ افزا ان کی زندگی کے لیے کامزائیاں لے کر آئی تھی۔ ان کے پاس مستقبل کے بہت سے خواب تھے اور تعبیر حاصل کرنے کے لیے بہت لگن، شوق اور جذبہ۔

اللہ نے انہیں ہر نعمت سے نوازا تھا۔ صحت، ہنر۔ علم عقل اور عزت۔ اور عزت ایک بار چلی جائے تو۔

الفت کے واہیات رویے، بے لگام زبان نے تمکنت اور اظہر کے رشتے کو نگاہیں چرائے پہلو بند لے پر مجبور کر دیا تھا۔ الفت نے یہ وتیرہ اپنا لیا تھا کہ وہ پندرہ روز سیدھی رہتی۔ پانچ روز کسی معمولی سی بات پر منہ پھلائی۔ افضل سعید کا ضبط آزمائی اور میکے روانہ ہو جاتی۔ روٹھنے اور مننے میں دس روز کٹ ہی جاتے۔

بھی بچے اس کے ساتھ ہوتے۔ اسد اور احد کی پڑھائی اس کے نزدیک ابھی اتنی اہم بھی نہیں تھی کہ فوجی ڈسپلن کے تحت کھڑی اور تارن کچھکھی جاتی۔ اور کبھی بچے گھر چھوڑ جاتی۔ پیچھے سے جو مرضی ہوتا رہے قاعدہ نقصان۔

افضل کے لیے دونوں صورت حال ایک سے بڑھ کر ایک تکلیف دہ ہوتیں۔

بچوں کی غیر موجودگی انہیں باؤلا کر دیتی۔ اور الفت کی غیر موجودگی بچوں کو۔

ہر دو صورت کٹھنے افضل سعید ہی کو ٹکینے ہوتے۔

الفت کے غیر جذباتی، محبت سے خالی رویوں نے افضل سعید کی اپنی کسی وجہ سے الفت کی واپسی کو خیال و خواب کا قصہ کر دیا تھا۔ کتے کی صرف دم ٹیڑھی ہوتی ہے۔ الفت ساری کی ساری ٹیڑھی تھی۔

وہ خفا ہو کر میکے بیٹھتی تو اس کے پاس کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اپنی جلی گئی سے وہ اماں باؤا کا کلیجہ جلاتی۔ چھوٹے بن بھائی نا سمجھی کے عالم میں اس کی سنتے۔ افضل کی برائیاں جو صرف الفت کو دکھائی دیتی تھیں۔

اصل مسئلہ تمکنت کے لیے تھا۔ ان کی شادی کے دن اب نزدیک آتے جا رہے تھے تمبریز بھائی کی عنقریب واپسی پر رخصتی کا ارادہ تھا۔ تمکنت کی بڑی آپا۔ شوہر کے ٹرانسفر کے باعث اندرون سندھ سرکاری گھر میں رہتی تھیں۔ سنا تھا رخصتی سے پہلے وہ بچوں کے ہمراہ حیدر آباد شفٹ ہو جائیں گی۔ تمکنت نے آپا

کے گھر سے رخصت ہونا تھا۔

ہر بار کسی بڑے پھڑے کے بعد جب پنجائیت بیٹھتی تو مندریں اس کا چہرہ کھوجتیں۔ کہ ان بی بی کی خاموشی کے پیچھے بھی کیا ایسا ہی کوئی طوفان چھپا ہے۔ گلے پڑا پچھلا ڈھول پیٹ پیٹ کر ہی ہاتھ شل اور گردن جھک گئی اور ان کے جلوے تو ابھی باقی ہیں حالانکہ تمکنت کا چہرہ وہ چہرہ تھا۔

جو ہر انداز سے اپنا اندر چھلکا تا تھا۔

نفاست نراکت شرافت اس کے چہرے پر پھیلی نرم روشنی اس کے اندر کا عکس ہی تھی۔ مگر ان سب کی آنکھوں میں الفت کے انتہائی غلط رویے کی سلوٹ زور چادر آگئی تھی۔ اس ملک جی دھند میں تمکنت کا چہرہ لرزتا دکھائی دیتا۔

اس کا ستھرا دل اس کے چہرہ کا نکھار تھا۔

مگر یہ نکھار سفیدی اور زردی میں بدل گیا۔ جب ایک روز الفت نے ختمی فیصلہ سنایا۔

”میں تنگ آچکی ہوں اس روز روز کی ڈرامہ بازی سے۔ میں کوئی زر خرید لونڈی نہیں ہوں۔ نہیں رہوں گی افضل سعید کے ساتھ۔ وہ مجھے طلاق دے دے۔ وہ کیا خود کو دنیا کا آخری مرد سمجھتا ہے۔ بوڑھا کالا بوس۔ اور میرا بھی بگڑا ہی کیا ہے؟“

فیروز بیگ سنے پر ہاتھ رکھ کے جھک گئے۔ اماں کی آنکھوں کے آگے تر مرے ناچ اٹھے۔

اتنی بڑی بات۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔

”بیگ صاحب! سنبھالیے خود کو۔“ وہ پسینہ پسینہ ہوئے فیروز بیگ کو سہارا دینے لگیں۔ تمکنت سینہ مسنے لگی۔ فرحت اور عزت پٹکھا جھلنے لگیں۔

”چھوڑ دیں ابامیاں! اس ڈرامے کو۔ وہ میری نا سبھی کا زمانہ تھا۔ جب آپ کے دل کے دورے سے ڈر کر اپنی پوری زندگی برباد کرنے کی ہائی بھری تھی۔ میں نہیں آنے والی ان ہنگاموں میں۔ ہونہ۔“

”ایسا پلیز ایسا نہ کہیں۔ چچا جان کا حال تو دیکھیں ان۔ تمکنت ہاتھ جوڑتی آگے آئی۔

”ارے ہٹو۔ ایک تمہارے چچا جان۔

دوسرے جیٹھ جی اور تیسرے سیاں۔ تم تو نماز کے بعد تسبیح میں بھی یہی تین نام کی مالا چپتی ہونالیں۔“

الفت نے اس کے ہاتھ جھٹکے۔ وہ انگلی کی پوروں پر فیروز بیگ۔ افضل سعید اور اطہر سعید کا نام گن رہی تھی۔

”لاحول ولا۔ استغفار۔“ تمکنت کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”ارے اچھی روٹی کھلاتا ہے۔ نظر آگیا اور جو ڈنڈے کے گھونٹے صبح و شام کھاتی ہوں یہ نہیں دکھائی پڑتے۔“ الفت کے جھوٹ کی حد کہاں تھی۔

”کپڑے۔ قیمتی ہوتے ہیں۔ تن ہی تو ڈھانپنا ہے پتے باندھ لوں گی۔ اس پندرہ سو کے سوٹ کے پیچھے چھپے نیل نظر نہیں آئے تم لوگوں کو۔ میں کیوں رہوں اس بڑھے کے ساتھ مار کھانے کے لیے۔

میرا بھی بگڑا ہی کیا ہے۔“

اس نے کسی چھوٹی بچی کی طرح دامن کو چٹکی سے پکڑ لیا اور گھوم کر جیسے خود کو دکھایا۔

”ارے تو اپنی حرکتیں تو دیکھو۔ عورت ناجائز کو گراتے ہوئے سو بار سوچی ہے۔ تو ایسے ہی بیٹھے بیٹھے کوکھ جھاڑ کے آگئی۔ اری نا ہنجر لوگ کچرا پھینکے سے پہلے سوچ لیتے ہیں۔ کوئی کام کی چیز نہ ہو اندر۔ تو نے اپنا خون گوشت ضائع کر دیا۔“

اماں اتنا منہ پھاڑ کر یہ سچ کبھی نہ کہتیں۔ وہ فیروز بیگ کو یہ شرمناک بات بتانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس کی ہٹ دھرمی اور فضول گوئی نے ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

”اللہ کی بھی گناہ گار۔ بندے کو بھی جواب دہ۔ نہیں پیدا کر سکتی تھی تو آنے ہی کیوں دیا۔ گناہ کی طرح چھپا کر رکھا۔ پالنے کی ہمت نہیں تھی۔ کیا کھلانے کو روٹی نہیں دے۔“

”تمہاری تو ہر تان روٹی پر آکر ٹوٹتی ہے اماں!“

الفت نے انہیں ٹوک کر ناک سے مکھی اڑائی۔ ”اس روٹی کے لیے۔ پہلے مجھے۔ اس قصائی کے آگے۔“

”اسے چپ کرواؤ۔“ فیروز بیگ کی لرزتی کانپتی آواز بمشکل نکلی انہیں یہ الزام کبھی برداشت نہ تھا۔

”ہاں۔ ہاں۔ چپ ہو جاتی ہوں۔ نہیں بولتی۔ کہیں ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ جیسے پہلے ہوا تھا۔ نوے کا سن تھا۔ آج ستانوے چڑھ آیا۔ اباجی ہی جارہے ہیں۔ اس وقت تو ایک بل کا بھروسہ نہیں تھا۔ ہونہ!“ اس کے جملے کی تلخی کم تھی۔ لٹھیک آمیز مسکراہٹ کے سامنے۔

”اللہ کا واسطہ۔ الفت اپنا۔ بس کریں۔ کسی ایک کو بخش دیں۔ دنیا کی کسی بھی عدالت میں چلی جائیں۔ آپ کا جرم ہر منزل پر سنگین جرم ہی ہو گا نام نہاد لبل کو چھوڑ کر۔ ایک معصوم ننھی جان۔ جب اللہ نے زندگی پھونک دی تھی تو آپ کو عزرائیل بننے کی کیا سوچھی۔ قصور کیا تھا مسئلہ کیا تھا؟“

”مجھے روز خواب آرہے تھے بیٹی ہوگی۔“ اس نے سچ اگل ہی دیا امی کا بھی یہی اندازہ تھا۔

”کیا۔“ تمکنت کے سر دھماکا ہوا۔

”تو کیا مطلب۔ آپ کی کون سی یہ ساتویں بیٹی تھی۔ یا سسرال کا ظلم و جبر تھا کہ بیٹی نہیں پیدا کرنا۔ افضل بھائی تو جان چھڑکتے ہیں افزا پر۔ وہ تو شکرانے کے نوافل ادا کرتے۔“ اس کے سر سے سب گزرنے لگا۔ وہ بھونچکی الفت کا بے پروا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ہاں تو تب ہی ناں۔ پہلی نے آکر کون سا مجھے تاج و تخت دلوا دیا۔ ٹھوکروں میں پڑی ہوں۔ وہ ہو جائیں تو۔ میرا پائیدار بنا لیتے۔ باپ بیٹیاں مل کر۔ روز صبح و شام پیر پوچھتے۔ مٹی رگڑتے۔ ذکیل کرتے گزرا کرتے۔ ہونہ۔“

تمکنت سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

”اللہ آپ کو سخت سزا دے گا۔ سخت ترین۔ آپ معاشرے کی مجرم شوہر کی نافرمانی اور نعوذ باللہ اللہ سے مقابلہ۔ جسے وہ زندگی دے رہا تھا آپ نے چھین لی۔“

”ارے ہٹو۔ آمیں بڑی مفتی اعظم۔ بندے کی سزا سے تو میٹ لوں۔ اللہ کو تو سب پتا ہے۔ ایسے

ہی گھونٹے برسانا شروع نہیں کر دیں گے۔ کم از کم میری بات سنیں گے تو۔ یہاں تو سب۔“

”بس۔ اب ایک لفظ نہیں۔ کوئی کفریہ کلمہ نہ نکل جائے منہ سے۔ آپ سچی باقی سب غلط۔“

تمکنت نے خوفزدگی کے عالم میں جھٹ سے ہاتھ جوڑ دیے۔

الفت پیر پختی کمرے سے نکل گئی۔

دنیا کا سب سے آسان کام جرم کرنا ہوتا ہے اور سب سے مشکل کام جرم کو چھپانا۔ الفت کی جرم کرنے تک کی پلاننگ بے عیب تھی۔ چھپانے کا پہلو نظروں سے چوک گیا۔ اور جرم بھی ایسا۔ اور وہ شوہر سے چھپ سکتا تھا بھلا؟؟؟

اس نے تین ماہ کا حمل ضائع کروایا تھا۔ یہ افضل کی سوچ کے دائرے سے باہر کا عمل تھا۔ انہوں نے نہیں دیکھا۔ ٹھڈے کہاں پڑے۔

گھونٹوں نے ناک سجائی یا آنکھ پھوڑی۔

ان کے غصے کی انتہا تھی۔ وہ سات سالوں میں پہلی بار۔ پہلی بار اسے باپ کی دلیز پر روتا سسکتا چھوڑ گئے۔

”اب تمہارے میرے راستے جدا۔“ غصے میں ایسے جملے نکلا ہی کرتے ہیں۔

مگر الفت کے لیے یہ قطعی فیصلہ تھا۔ افضل کے جملے نے راہ دی تھی۔

افضل کے لیے یہ الفت کی جانب سے انتہا تھی۔ وہ اس سے زیادہ کیا برا کر سکتی تھی۔ اور یہ افضل کی خام خیالی تھی۔

افضل کی سوچ کا اختتام الفت کا نقطہ آغاز ہوتا تھا۔ پھر کیا ہوا۔؟

بچے ماں کے حاضری رجسٹرر غیر حاضری کے سرخ نشان لگانے کے عادی ہو چکے تھے مگر رخصت اتفاقی ہو یا درخواست کے ساتھ۔ وہ تین سے زیادہ دن نہیں برداشت کر پاتے تھے۔

ماہنامہ شعاع 113 ستمبر 2012

اور اس بار کا جھگڑا تو انتہا تھا۔ افضل کا جانے سے انکار۔

اسد بی بی نسیم اور پھپھی کے سامنے بہل جاتا۔ افزا پہلے ہی بی بی اور کاکی کی عادی تھی۔ مسئلہ احد کا اٹھتا۔ وہ الفت کا رتو تھا اور کوئی بہانہ اس کے بہلاوے کے لیے کارگر نہیں تھا۔ مگر افضل سعید نے زندگی میں پہلی بار احد کے گال پر بھی ایک پھٹروے مارا کہ ماں کا نام بھول جائے۔ افضل کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کا کاروبار ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔

گھر بیچ کر کاروبار میں لگاتے ہوئے وہ ڈرے ہوئے تھے۔ خدشات تھے۔ مگر اب کاروبار نے بھی ترقی کی تھی اور وہ عنقریب گھر خریدنے والے تھے۔ یہ سر پرانہ تھا۔

اظہر اور اکمل کے لیے وہ ایک ایک شہ زور ٹرک خرید چکے تھے۔ ان کے نام پر تاکہ ان کی مستقل آمدنی کا ذریعہ ہو۔

الفت بروقتی طور پر جیسے لعنت بھیج چکے تھے۔ بسن بھائیوں کی ذمے داری اور معاشی مسائل میں گھرے افضل کی زندگی میں کوئی رنگینی نہیں تھی۔ ان کے پاس ان سب کے لیے تو خوابوں کا ڈھیر تھا مگر اپنے لیے کچھ نہیں۔ لیکن الفت نے ان کی زندگی میں آکر رنگ بھرے تھے۔ انہیں اولاد دی، گھر بنا۔ وہ جیسے قوس قزح میں رہتے تھے۔ لال نیلے پیلے اودے رنگ مگر قوس قزح کی خوب صورتی رنگوں کے گول دائرے مناسب امتزاج اور توازن میں ہوتی ہے۔ رنگ بے ہنگم ہو کر ایک دوسرے پر چڑھ جائیں۔ اپنا دائرہ بھول جائیں۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ تو فقط سیاہی رہ جاتے ہیں۔ آسمان کی سیاہی دنیا کو اندھیرا کرتی ہے۔

رنگوں کی سیاہی منہ پر پڑ جائے تو زندگی اندھیر ہو جاتی ہے۔ اور ایسی ہی ایک کالک تھوپنے الفت ان کی زندگی کی طرف آ رہی تھی۔



گھر کی پے منٹ کرتے ہی افضل سعید نے اپنی

مرضی کا کام شروع کروا دیا۔ ان کی ترقی کا سفر قابل رشک اور قابل تہلید تھا۔

افضل سعید کی شدید ترین خواہش تھی ایک نئی ٹکڑی لینے کی۔ وہ اور انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

ہفتے کے آغاز پر۔۔۔ وہ نیا آسمانی کلف لگا سوٹ اور نئے شوز پہن جب دفتر پہنچے تو ان کی 97 عماڈل کی کڑوا۔۔۔ ان کی شان کو چار چاند لگا رہی تھی۔

محنت مشقت کے بعد حاصل انعام کا غور چہرے پر تھا۔ ان کا سانولا رنگ دمک رہا تھا۔ دراز قامتی انہیں فاتح بناتی تھی۔ حسد، رشک، خوشی حیرت اور مبارکباد کے جملے سمیٹتے وہ دفتر میں داخل ہوئے۔

الفت کی ہٹ دھرمی اور طلاق جیسے۔۔۔ بے ہودہ مطالبے کے باوجود۔۔۔ حسب عادت تقریباً "مہینے بھر میں ان کا غصہ دم توڑ چکا تھا۔

وہ گھر، کاروبار اور بچوں میں مصروف تھے۔ الفت فون پر۔۔۔ انہیں مسلسل طلاق دینے پر اکساتی تھی، بھڑکاتی تھی۔

"چھوڑ کر گئے تھے۔۔۔ تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔" میں نہیں رہوں گی اب۔ تاک سے لیکر کھینچو گے تب بھی نہیں۔

اپنی دولت اپنے پاس رکھو۔ روٹی کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ شوہر نے نہیں۔۔۔ "اماں کانپ کانپ جاتی تھیں۔

(اس کی طلاق کی گردان نے تمکنت کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ اس کا دل انجانے خدشات سے لرز رہا تھا۔)

اظہر بھائی کے زیر نگرانی اپنے کاروبار پر بھرپور توجہ دے رہا تھا۔ دوسرے وہ گھر کو بھی دیکھ رہا تھا اس کی بے پناہ مصروفیت، تمکنت کے خدشات کو ہوا دیتی تھی۔

اظہر اور اس کی ملاقات کم ہوتی تھی۔ اظہر کی محبت اسی طرح تھی اس کا التفات اور لگاؤ شہ نثار ہوتی نگاہیں چھوٹے چھوٹے جملے۔۔۔ سب وہیں کے وہیں تھے۔

مگر تمکنت کے دل کو قرار نہ تھا۔

یہ کاروباری مرکز تھا۔ مال اتار اور چڑھایا جا رہا تھا۔
میٹنگ لوگ ریش مگر اس شور میں افضل سعید کا نام
پکارا جا رہا تھا۔

وہ کچھ چونک کر تصدیق کے لیے اپنے ملازمین کی
جانب مڑے۔

تو حیران ہوئے۔ ان تمام کے چہروں پر خوف سے
زردی کھنڈی تھی۔

وہ ان کے سوالوں پر جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک
دوسرے کو دیکھتے تھے اور ان سے نگاہیں جراتے تھے۔

”کیا مسئلہ ہے؟ بولتے کیوں نہیں کیا ہوا ہے؟“
ایک مسلسل چپ۔ وہ الجھ کر خفا ہو کر باہر کو لپکے۔

”سیٹھ صاحب! باہر نہ نکلو۔“ ایک بوڑھا ورکر
منمنایا۔

”کیوں۔ کیا ہوا ہے؟“ وہ ٹھنک کر رک گئے
تھے۔

”اکمل۔ اظہر۔ باہر آؤ۔ دیکھو تو۔“
جوان خزان ہے بیٹا۔! ان کو آواز نہ مارو۔“ وہی

بوڑھا گھگھیا تالان کے روبرو ہو گیا۔
سیٹھ جی سے بیٹا۔ انہیں لگا وہ بچپن کی طرح باہر

لوگوں سے بھڑنے جا رہے ہیں اور انہیں ان کے والد
صاحب روک رہے ہیں۔

اکمل پیچھے اسٹور میں کارٹن گنوار ہاتھ اور اظہر کوئی
کھاتہ کھولے اندراج کر رہا تھا۔ بھائی کی پکار پر باہر

آئے تو منظر نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔ وہ بھائی سے
پوچھنا چاہتے تھے۔

تب ہی ”م افضل سیٹھ“ کی پکار بہت واضح تھی۔
دروازے کے باہر کارٹن اب ان کی نگاہوں کے سامنے

ہی آگیا۔ وہ چونکے اور تیزی سے بھائی کے پیچھے لپکے۔
نئی ٹکڑ 97ء ماڈل کی سیاہ کروڑا۔ کے نزدیک ریش

تھا۔
کیا گاڑی کو کوئی نقصان پہنچا؟؟؟

ان کے دفتر کے عین سامنے والے دفتر کے بیرونی
حصے پر رکھی میز اور کرسی کے پاس جھوم کا دائرہ بڑھتا جا

رہا تھا۔ ایریاں اٹھا سر کال ایک دوسرے کی بظلوں
کیا کاغذ کیوں نہیں دیتا۔“

میں منہ دیے۔ اندر جھانکنے کی جستجو میں ایک دوسرے
سے پرکچل رہے تھے۔

مگر افضل سعید اور ان کے پیچھے آتے اکمل و اظہر کو
دیکھ دائرے کا ابر خود بخود کھینچ گیا۔ ان کے لیے راستہ بن

گیا۔ افضل کے دائیں ہاتھ میں موبائل اور بائیں میں
نئی گاڑی کی چابی تھی۔ اکمل ہلکے براؤن سوٹ کے

ساتھ تلے والے پسندیدہ جوتے میں تھا۔ جبکہ اظہر سیاہ
جینز کے ساتھ گرے لی شرٹ میں اس کی انگلیوں میں

پین پھنسا تھا۔
یہ ایک بہترین کاروباری صبح کا آغاز تھا۔ لیکن۔۔۔

تینوں بھائیوں کی نگاہ ایک ساتھ ہی سیاہ و سفید
پرنٹ کے لان سوٹ میں ملبوس الفت پر پڑی اس نے

دوڑے کی بکل مار رکھی تھی اور ایک درمیانے سائز کا
پرس بغل میں پھنسا تھا۔

آسمان ان کے سر پر گرا۔
دن کی تیز چمکیلی روشنی سیاہ تاریکی میں بدل گئی کہ

آنکھوں سے بینائی رخصت ہونے کا گمان ہوا۔
پتھر کا ہو جانا لغت کا محاورہ نہیں ہے ایسا حقیقت میں

بھی ہوتا ہے۔ وہ تینوں خوب صورت خوش لباس
بے عیب مجسموں میں ڈھیل چکے تھے۔

مگر اذیت اور ذلت یہ تھی کہ وہ مجسمے نہیں تھے۔ ان
کا سانس چلتا تھا وہ اپنی عزت کے نکتے جنازے کو اپنی

آنکھوں سے دیکھ اور سن رہے تھے۔
”جب میں رہنا نہیں چاہتی اس شخص کے ساتھ

منہ سے طلاق مانگ رہی ہوں تو دیتا کیوں نہیں۔
ہو گا دولت مند نشان و شوکت پیسے والا پٹانے بنگلے اور

محل۔ گھوڑے بڑی گاڑیوں میں خریدے ٹرک اور دنیا
کی ہر شے۔

مگر میرے کس کام کی۔ میں کیوں رہوں جب
میں رہنا نہیں چاہتی۔ مل جائے گی اسے دولت کے

بل بوتے پر اور کوئی پاکل کی پچی مار کھانے کے لیے بڑا
عقل کل بنتا ہے۔ سمجھاؤ ناں آپ اسے۔ کیوں

نہیں فارغ کرنا چھو۔ اس دن چھوڑ کر تو آیا تھا ناں۔
پکا کاغذ کیوں نہیں دیتا۔“

کہتے ہیں مرنے کے بعد اعمال کے کارن چہرے بڑ
جاتے ہیں۔ خوفناک ہیبت ناک اور اگر کسی زندہ کا چہرہ

بگڑے تو۔ افضل سعید کے جسم میں خون کی ایک
بوند نہیں باقی تھی پھر بھی وہ زندہ کیوں تھے۔

اظہر کے منہ سے صرف بھابھی نکل سکا تھا۔ اس کی
توت گویا کی سب ہو چکی تھی۔

اکمل کو سب سے پہلے ہوش آیا۔ وہ تیزی سے
آگے بڑھا۔

”کیا کر رہی ہو بھابھی۔؟“ اس نے اس کا شانہ
ہلایا۔

”ارے ہٹو۔ بھابھی کے بچے۔ کوئی بھابھی وہابی
نہیں۔“ اس نے جھٹکے سے اپنا شانہ چھڑوایا۔

”آپ دوست احباب ہیں۔ کاروباری ناتا ہے۔
مشورے دیتے ہیں۔ سمجھائیں اسے جب میں رہنا

نہیں چاہتی تو فارغ کر دے۔ اس کا راستہ صاف میرا
بھی۔ رکھے اپنے بچے بھی۔ مجھے نہیں لینے۔

جب شوہر ملے گا تو بچے بھی ہو جائیں گے۔ میرا کیا
خاک بگڑا ہے۔“ اس نے ٹھیکنگا دکھایا۔ ”ہو نہ!“

اس کے کاروباری حریف حشمت اللہ کا دل لرز
اٹھا۔ وہ کچھ دیر پہلے افضل کی نئی گاڑی پر رشک کر رہا

تھا۔ وہ اب افضل کے حال پر کس کیفیت کا اظہار
کرے۔ اسے توبہ کرنی چاہیے۔

”عزت سے ذلت کا سفر اتنا مختصر۔؟“
اس کا دل چاہا وہ اس عورت کا گلا گھونٹ دے۔

افضل سعید کے عزت کے جنازے میں شرکت
کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

خوف خدا رکھنے والوں کے لیے یہ مقام عبرت تھا۔
وہ افضل سعید کو زنانوں سے جانتے تھے۔

”کیوں۔ کیا کب کیسے۔؟ وہ عورت سچی بھی
ہوتی مظلوم بھی۔“

تب بھی اسے اس طرح یہاں آکر۔ ہا۔
”اب چپ کا ہے کی لگی ہے۔ دھمکی تو بڑی شان

سے دے گئے تھے۔ میں تمہیں جی کر دکھاؤں گی۔
پوچھتے رہنا پیسے سے ناک۔ ہو نہ۔“

پیسہ کیا ہے ہاتھ کا میل۔ لو میں نے جھاڑ دیا۔“
اس نے مائی پیسنے کے انداز میں ہاتھ بجا کر کر گڑے۔

بے یقینی خوف، سکتہ، مجھکا۔ ذلت، الفت کے
ساتھ گزارے سات سالوں کی فلم نظروں میں پھر گئی۔

پھر اس کے ابھی کے جملے کانوں سے ٹکرائے۔
انہیں غش سا آ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر سارے

کے لیے اٹھے ہاتھ کو اظہر نے تھام لیا تھا۔
”میں۔۔۔ میں افضل سعید۔۔۔ میں افضل سعید

چوہدری۔ الفت بیگ کو طلاق۔ دیتا ہوں۔۔۔
طلاق۔۔۔ طلاق دے چکا ہوں۔ میرا اس سے کوئی

تعلق نہیں۔ کوئی گنجائش نہیں۔ کوئی۔۔۔
رشتہ نہیں۔ میں۔۔۔ میں۔ افضل سعید۔ میں۔۔۔

افضل۔ میں افضل۔۔۔“
اونچا لہبا، عزت دار، شاندار مرد۔ ہوش و حواس

سے بے گانہ ہونے کو تھا۔

”پرسوں کہا تھا نئی گاڑی میں ماما کو لینے جائیں گے
اب تو چار دن ہو گئے گاڑی پرانی ہو گئی۔ ماما نہیں

لائے۔“ کوثر تو اسے سلا کر آئی تھی۔ ہسلا پھسلا کر
ڈانٹ کر بچکار کے۔ ابھی وہ افضل سعید کے پاس آکر

بیٹھی ہی تھی۔ احد آنکھیں ملتا آگیا۔ اس کے بال
ماتھے پر بھرے تھے۔ پھولے گل خفگی کے باعث کیا

معلوم ہوتے تھے۔ افضل سعید اس کا چہرہ دیکھ رہے
تھے۔ مگر ان کا ذہن کہیں دور خلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔

اس کا گندمی رنگ، آنکھوں کی بناوٹ ناک اور ٹھوڑی
کا کٹ سب الفت جیسا تھا۔ وہ ان تین دنوں میں سب

بھول چکے تھے مگر یہ ننھا چہرہ ایک دوسرے چہرے کی یاد
جگا رہا تھا۔

اور یہ یاد اپنے جلو میں اور بھی بہت کچھ لائی تھی۔
درندہ ہر شے کو بھولے ہوئے تھے جیسے۔

”لے جاؤ اسے کوثر۔ اب کوئی نیڈا رمانہ شروع
ہو۔“ اکمل بھی نیم تاریک کمرے کے کونے میں

سو رہا تھا۔
اپنا نامہ شعاع 117 ستمبر 2012

صوفے پر بیٹھا تھا۔

کوثر ہمت مجتمع کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ سب سے مشکل کام احد کے چہرے سے جھلکتی ہٹ دھرمی اس کے ارادے ظاہر کر رہی تھی۔

اور افضل سعید کا بے تاثر چہرہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ کچھ سن نہ رہے ہوں کچھ دیکھ نہ پا رہے ہوں کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو۔

ساری زندگی دامن بچا بچا کر جلنے سے کیا حاصل ہوا جب انت میں اتنی غلاطت کے اندر منہ کے بل گرنا تھا کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔۔۔

اتنی بڑی زندگی اور صدیوں پر پھیلا قصہ ایک جیل کے ادا ہونے کے بعد ختم ہو گیا۔ احد کی پکاریں اور چیخ چیخ کر رونا رات کے سناٹے میں اعصاب کے لیے کڑا امتحان تھا۔

”چلا نا بند کرو۔ مر گئی وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔“ افضل جو کھٹ پر کھڑے تھے۔

نہیں۔۔۔ نہیں مری نہیں۔ نانا میاں کے گھر گئی ہیں۔ مجھے مئی چاہیے لا کر دیں۔“ وہ ضد میں الفت سے آگے تھا۔ باب کے چہرے کا سناٹا اور آنکھوں کی مرنی اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ افضل کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ احد کا بازو دوچ لیا۔

اکمل اور کوثر نا سمجھی کے عالم میں تھے۔ شور کی آواز سے اسد آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔

”آج کے بعد مئی کا نام نہیں لیتا۔ کبھی نہیں۔۔۔ بھولے سے بھی نہیں۔ غلطی سے بھی نہیں۔ وہ اس گھر میں اب کبھی نہیں آئے گی۔ بھول جاؤ کہ ماں تھی بھی۔“ باب کے شرے لہجے نے احد کے جنون کو روک دیا تھا۔

”ممالا دیں۔“ وہ سسک رہا تھا۔ اس کا لرزنا سسکتا وجود مسخ وکتے آگ جیسے گل۔۔۔ بھیگی چپ چپ کرتی پلکیں وہ نیند کی وادی میں چلا گیا تھا یا بے دم ہو چکا۔

☆ ☆ ☆

”میرا قصور اظہر ہے؟“ اس کی بھری آنکھوں سے

لوٹک رہا تھا۔

”اور میرا قصور تمکنت جلال بیگ؟“

”مم۔۔۔ مم۔۔۔ دنیا کو کیا جواب دوں گی۔ کیا منہ دکھاؤں گی؟“

”ویسا ہی منہ اور وہی جواب جو۔۔۔ میں دنیا کو دے رہا ہوں۔“ اظہر اپنی شہوت کی انگلی اس کے شانے میں چھو چھو کر کہہ رہا تھا۔

تمکنت کے پیر اکھڑ گئے وہ لہرائی تو گرنے کے انداز میں صوفے پر گر گئی۔

”آپ۔۔۔ تو مجھے بہت اچھی طرح جاننے کا دعوا کرتے تھے۔“ وہ ہار مانے کو تیار نہیں تھی۔

”جاننے کا دعوا۔“ وہ سرعت سے پلٹا۔ ”اس وقت میں خود کو بھی بھول بیٹھا ہوں۔ اپنا نام مقام رشتے سب بھول چکا ہوں۔ یاد ہے تو صرف ایک تماشا گاہ جہاں ہماری زمانوں کی کمائی عزت لوگوں کے پیروں میں رُل رہی تھی۔ ہمارے شعلے تماش بینوں کی ٹھوکروں میں بڑے تھے یاد ہے تو۔“

تمکنت صوفے کی پشت سے چپکی ہوئی تھی۔ اظہر کے دونوں ہاتھ صوفے کی ہتھیلی پر تھے اور وہ اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔

”اور۔۔۔ محبت؟“ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے نوحہ پڑھا تھا۔

”او۔۔۔ ڈیم اٹ۔۔۔ محبت۔“ وہ بھنا کر ایڑیوں پر گھوم گیا۔

”محبت اور عزت میں سے ایک چیز چھنی ہو تو میرے ہاتھ صرف عزت کی طرف بڑھیں گے۔“

”تو تھام لیجئے ناں میرا ہاتھ۔۔۔ میں آپ کی عزت ہی تو ہوں۔“ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ ”محبت بھی اور عزت بھی۔“

”عزت اس روز بازار میں سرعام لٹ گئی تھی اور محبت نفرت کے جذبات کو میں بھول گیا۔ ایک بے حس بے بس۔“

”لیکن میرا قصور تو بتائیے۔“ وہ بے دم ہو چکی تھی۔

”تو میرا جرم بھی بتا دو۔۔۔ میں گھر سے باہر نہیں نکل سکتا کہ وہ جارہا ہے اظہر جس کی بھابھی (آخ تھو) نے اس روز۔۔۔ میں شاید زندگی بھر دفتر والے روڈ پر نہ جاؤں۔“

”لیکن میرا نام۔۔۔ ناکرہ جرم کی سزا مجھے کیوں ملے۔“

”صرف تمہیں نہیں۔۔۔ میں بھی بھگت رہا ہوں۔ ہمارا پورا خاندان آنے والی نسل۔“

”میں ان جیسی نہیں ہوں اظہر۔“ رو رو کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

وہ اسے کیسے ٹھکرا کر جا رہا تھا۔ الفت نے اپنا کارنامہ بہت فاتحانہ انداز میں بے فکری سے بتایا تھا۔ رونا بیٹھا۔ بین کرنا سب ثانوی باتیں تھیں۔

وہ سرعت سے فون کی طرف بڑھی تھی۔ وہ اظہر سے تصدیق چاہتی تھی۔ وہ افضل سعید سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کی انگلیاں پاگلوں کی طرح فون کے بین دبائی رہیں مگر ہر در بند ہو چکا تھا۔

وہ حق دق سب کی صورتیں دیکھتی اور صبح سے شام کرتی۔ دنیا بھر سے منہ چھپا کر سسکیاں بھرتے فیروز بیگ اس کے کسی کام نہ آسکتے تھے۔ کوثر اس کی مددگار بنی۔ بھائی کے گھر اور زندگی کو سنبھالنا اس کے بس کی بات نہیں تھا۔ اسے یہ رہ کر تمکنت اور اظہر کے رشتے کی فکر کھارہی تھی۔ لیکن وہ مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہتی تھی مگر یہ وقت بڑا کڑا تھا۔ ہر وقت التما ہی پڑتا تھا۔

افضل سعید دنیا سے منہ چھپا کر گھر میں پڑے تھے۔ اظہر اور اکمل کی رہائش وہیں دفتر کے اوپر تھی۔ وہ کب تک لوگوں کا سامنا نہ کرتے۔

اور وہ اکمل تھا انیس برس کا جو شیدا خوش مزاج شوخ و شنگ رنگوں پر جان دینے والا کلف لگے کپڑے پہننا اور تلے والے جوتے اور تھکے بیش قیمت گھڑیاں دل جان سے لگا کر رکھی بائیک۔۔۔ اپنے ظاہری حیلے

سے وہ ایک مغرور تاثر دیتا جو سامنے والے کو جھجک میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اسے کاروباری حریف کے بیٹے نے روک کر پوچھ لیا تھا۔

”اس روز کیا ہوا؟“ وہ بظاہر افسوس کر رہا تھا۔ افضل سعید کے طلاق والے فوری ری ایکشن کو سراہ رہا تھا اس کے لہجے کی تضحیک اور آنکھوں سے چھلکتی کھینی مسکراہٹ۔ اکمل کے پورے وجود کو جھلسائی۔

وہ راستے میں کتنوں کو مار تا اور کتنوں سے پتھا گھر آیا تھا۔ اس کی ٹھوکروں سے گلے ٹوٹ گئے۔ دیوار گیر آرائشی شیشہ گلاس مار کے توڑ دیا۔ اس نے احد کے گال پر پھٹا مارے پھر اپنے ان ہاتھوں کو دیوار سے ٹکراتے لگا اور آخر میں بے دم ہو کر اپنے بال نوچتا ڈھے گیا۔

”اکمل۔۔۔ اکمل میرے دیر۔۔۔!“ بہنوں کے ہوش اڑ گئے۔ بڑی باجی اس سے چمٹ گئیں۔ کوثر پانی کا گلاس لے آئی۔ چھوٹی باجی بال سنوارتے ہوئے منہ سر جو منے لگیں۔

”ہمارا کیا تعلق اس کٹنی سے۔۔۔ ختم قصہ۔ اب ڈر کیا؟“

”لیکن! لیکن میں کس منہ سے دفتر جاؤں باجی! لوگ آوازیں کیسے گے وہ دیکھو جارہا ہے وہی چوہدری اکمل سعید جس کی بھابھی۔“ اس نے اپنے بال کٹھی میں جکڑے۔

”کیسی شرم!“ بڑی باجی نے چمک کر کمان اپنے ہاتھ لی۔

”کننے والے کیا عقل کے اندھے۔ یا بہرے تھے۔ سرعام بے عزت کرنے والی عورت اپنے تئیں منہ پر تھوکنے آئی تھی۔ تماشا لگانے۔ تماشا تو اس کا لگا۔ ساکن بن کر آئی تھی اور طلا قن بن کر لوٹی۔ آتے وقت کسی نے پہچانا ہو گا تو افضل سیٹھ کی بیگم۔ اکمل اظہر کی بھابھی۔ سعید سنز کی مالکن۔ کسی کامے (کام کرنے والا) نے سلام بھی جھاڑا ہو گا پہچان کر راستہ بھی دیا ہو گا اور جب لوٹی۔ تو کیا اوقات تھی

کئے کی نہیں۔ نہ بیوی رہی نہ بھابھی نہ مالکین۔ آتے وقت کوئی اسے تنہی آنکھ سے دیکھتا تو آنکھ نکال کر ہاتھ پر رکھنے والا شوہر اور دیور تھے۔ اور واپسی میں کوئی ہاتھ پکڑا ندر بھی گھسیٹ لیتا تو کون والی وارث ہوتا تھا۔ کٹی پٹنگ۔ وہ میرے بھائی کے منہ پر تھوکنے آئی تھی۔ آئی تھی نال۔ خود کیسے لوٹی ننگے سر۔ ہونہ۔ بڑی باجی کے اندر کا عناد اور غصہ رونے دھونے بیٹنے اور چلانے کے بعد اس وقت صرف اکمل کی تشفی کے لیے شہر ادھیرا اور دلال سے پڑھا۔ ورنہ بہنوں کی محفل میں وہ باقاعدہ مغالطات سے اسے کوس رہی تھیں۔

اکمل کے دھتکتے دل و دماغ پر سکھ کی پھوار برس رہی تھی۔ ہاں انہوں نے یہی تو کہا تھا۔ وہ سینہ تان کر چل سکتے تھے۔ ان کی غیرت پر حملہ کرنے والی کو منہ توڑ جواب طلاق سے بڑھ کر کیا تھا۔ اکمل کوڑ کے دیے پانی کے گلاس سے گھونٹ بھر رہا تھا۔ تب ہی نگاہ سیڑھیوں پر کھڑے اظہر پڑی۔ وہ اوپر سو رہا تھا۔ شور کی آواز سن کر آیا تھا۔ اس نے اکمل کا رد عمل اور بہنوں کے جملے سب سنے تھے۔ اس کا دماغ سن رہا تھا۔ اس کے فون پر مستقل ایک سکیوں بھری کال تھی۔ جسے وہ ڈسکنکٹ کر رہا تھا۔

ایک وکتا چہرہ سک رہا ہے۔ اس نے فراموش کر دیا تھا۔ زندگی بس اس "صبح" پر محیط ہو گئی تھی اور کچھ نہیں۔

اکمل کو اچھو سا لگا۔ وہ اظہر کی جانب انگلی کر کے چلایا۔ وہ بہنوں سے پوچھ رہا تھا۔ "آپ تو کہہ رہی تھیں کہ اب کوئی تعلق نہیں۔ اس کا ہے نال۔ وہ اس ناگن کی بہن۔ یہاں اس گھر میں میرے سامنے۔ گھوٹے کی۔ اس سے کہو اسے فابریع کرے۔ ابھی اسی وقت

بویس آیا۔" وہ ایک بار پھر جنونوں کی طرح چیخنا شروع ہو گیا۔ اظہر سیڑھیوں سے اتر۔ "میں نہیں لاؤں گا اسے اکمل۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔" میں بھی اسے طلاق دے رہا ہوں۔" وہ اس کی تشفی کروا رہا تھا۔ چھوٹی باجی اور کوثر لرزا تھیں۔ "نہیں اظہر۔ نہیں۔" کوثر اظہر کی پشت سے چپک گئی۔ "نہیں اظہر۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے اور سر نشی میں ہل رہا تھا۔

اظہر سے ملنے کی تمام کوشش بے سود تھیں۔ وہ اس کے ہاتھ آکے نہیں دے رہا تھا فون نہیں سنتا تھا۔ اس نے پی سی او سے فون کیا اور پوچھوٹے ہی بولی۔ "مجھ سے ایک بار مل لیں اظہر۔ خدا کے لیے۔ بس ایک بار۔" آپ گھر نہ آئے گا۔ اسکول آجائیں۔ پلیز اظہر۔ میں مر جاؤں گی۔ ف۔ فون مت رکھیں اظہر! ہماری زندگی داؤ پر لگی ہے۔" ہماری زندگی ختم ہو چکی ہے۔" اس نے پہلی بار جواب دیا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ آپ میری بات تو سنیں۔" اگر آپ نہ آئے تو میں آجاتی ہوں آپ کے پاس اظہر! آپ جگہ بتائیے۔ میری کوئی نہیں سنتا۔ بھائی اتنی دور۔ آپا خود پریشان۔ وہ آئیں گی۔ چچا بستر پر بڑے ہیں۔ میں کس سے کہوں؟" رونے سے ممکنیت کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

"یہاں فون نہ کرنا ممکنیت دوبارہ کبھی۔ میں۔" "میں آپ کے دفتر آ جاؤں گی۔ آپ مجھ پر ایسے ظلم نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر روڑی اور اس کی تیزی اظہر کے وجود کو دھتکتے کو نکلوں پر ڈال گئی۔ "او آئی سی۔ یہی۔ یہی تو بات ہے۔ جانتا ہوں الفت بیگ کی بہن دفاتروں چور اہوں تک آسکتی ہے۔

ہوئیں اسی الفت کی بہن۔ متزلزل تھا میں تمہارے اس پلان نے ذہن کلیئر کر دیا۔" وہ دانت پس کر زہر خند بولا۔ "مگر دیکھ لو بی بی! ایک دفتر آنے والی کو کیا ملا۔ تم بھی آکر دیکھ لو۔ کرلو شوق پورا۔" وہ چبا چبا کر بولا اور ریسیور پٹخ دیا۔ وہ درمیان میں روتے ہوئے تڑپ تڑپ کر "ظہر! اظہر میری بات تو سنیں۔" پکارتی رہی "نہیں۔ اظہر میری تو سنیں آئی ایم سوری میرا وہ مطلب نہیں اظہر۔" وہ مدھال ہو کر ڈھس گئی تھی۔

آپا کے ہاں چند روز میں بچے کی پیدائش متوقع تھی اور ممکنیت کا معصوم دل لرز رہا تھا۔ وہ کہاں جاتی کس سے کہتی۔ چچی اماں کو چپ لگ گئی تھی اور چچا فیروز بیگ دنیا سے منہ چھپائے بستر پر۔ گھر میں موت کا سناٹا تھا موت سے پہلے کا۔ موت کے بعد کا۔

"عدت کاٹ کر چلی جاؤں گی۔" اس نے ماں کے کوسنوں کے جواب میں مزے سے کہا تھا۔ اس کے پرس میں خوب نوٹ تھے۔ اپنے ذاتی۔ اور افضل سعید کی جانب سے مہر کی رقم اور زیور۔ نجانے وہ کس بے حس مٹی سے بنائی گئی تھی۔

اس صبح کے منظر کو قصداً دہرا دیکھتی اور ان بھائیوں کے چہرے یاد کر کے حظ اٹھاتی۔ اسے بچے یاد نہیں آتے تھے۔ وہ ایف ایم ریڈیو کان سے جوڑے جھمت پر نیم دراز رہتی۔ بھوک لگنے پر خود ہی پکا لیتی۔ کبھی کبھی پکے پکائے پر آ بیٹھتی۔ باہر سے سمو سے رول منگوائی۔

اس کی بلا سے کہ کس کس کی زندگی آخری ہچکیاں لے رہی ہے۔

ممکنیت کی خیر خواہ کوثر تھی۔ اس نے اسے مطمئن رہنے کا مشورہ دیا۔

صبح وقت کا انتظار۔ افضل سعید کا نارمل زندگی کی طرف لوٹ جانا۔ اکمل کے پرسکون ہونے۔ الفت

کی دکانی آگ کے سر دھونے کا۔ مگر اس دن اکمل کے جنونی رویے نے بے ہودہ فرمائش اور اس پر اظہر کی کرائی جانے والی تشفی۔ کوثر کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ان دونوں کی محبت سے واقف تھی۔ وہ ممکنیت کی فطرت آشنائی کی دعوے دار بھی تھی۔ دوسری جانب اظہر کا دھماکے دار فیصلہ۔ وہ ملک سے باہر جا رہا تھا۔

کیوں۔ کہاں۔ کب کس لیے۔؟ ابھی چند روز پہلے تک وہ کوثر جیسی سنبھلی نما بہن کو قائل کر رہا تھا کہ اب حد ہو گئی ہے رخصتی لی جائے اور اب۔ وہ ممکنیت سے اسکول جا کر ملی اسے اپنے گھر بلایا اور اظہر کو بھی بتا رہا تھا وہ ظاہر کیسے بلوالیا۔

اس کا خیال تھا۔ وہ ممکنیت سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی موہنی صورت دیکھ اس کا سہما بکھرا خچر د سر اپا دیکھ کر پھل جائے گا۔

"تم بیوی ہو۔ کیسے بھی کر کے منالینا۔ منت تر لے کر کے۔ روپیٹ کر۔ لڑکے، جھگڑ کے لپٹ کے۔ اور مرد کا دل پھلنا کیا مشکل ہے اور جب عورت بھی دل دار ہو تو۔ اسے روک لینا۔"

اظہر اس کی ایک جھلک پانے کے لیے گھٹنوں دھوپ میں جلتا تھا۔ اتنے دنوں بعد اس کو دیکھ سب بھول جائے گا۔ کوثر نے اسے اندر دھکیل چھٹی لگا دی۔

مگر یہ کوثر کی بھول تھی۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

وہ سب کچھ جو ممکنیت کی ان دونوں کی زندگی کو برباد کرنے والا تھا۔

وہ روتی رہی اور یقین دلاتی رہی کہ وہ دھندلی آنکھوں سے دھند بھرے آنکھوں میں اس کی صورت نہ دیکھے ایک ہاتھ مارے تو چہرہ واضح ہو جائے۔

اس نے ہچکیوں کے درمیان بتایا کہ وہ "اس" جیسی نہیں ہے۔ وہ آخری سانس تک اس کا انتظار کرے گی۔

وہ بے یقین تھا اور اس کے دعوے کو استہزا سے

دیکھتا تھا۔

وہ بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔
وہ ٹھوکر مار گیا۔

دروازہ باہر سے بند تھا۔ غصے نے اس کا دل آگ سے بھر دیا۔ اس کی ٹھوکر سے روشن دکن کے پٹ بند ہو گئے۔

”میں فیصلہ کر چکا ہوں کوثر!“ وہ حلق کے بل چلایا۔

کوثر باہر کھڑی کانپتی رہی۔ اس کے پیروں میں دم نہیں تھا۔ ”ان اوچھے ہتھکنڈوں سے تم کیا جیتنے آئی ہو؟“

اس نے اس کا بازو دوچا۔ وہ سسمی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

اظہر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا اور اس کے بولنے کی صلاحیت پر شیطان کا قبضہ ہو گیا تھا۔
”میں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے۔ آگئی تمہارے ان آنسوؤں کی سمجھ۔ بے فکر رہو۔ تمہیں تا سرحد چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ تمکنت کے آنسو رک گئے۔ وہ نا سنجی کے عالم میں اظہر کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
”تم لوگ جوگ کلٹنے والی ٹھوڑی ہو۔ کرنا انجوائے لائف۔ تمہارا مسئلہ حل کر کے جاؤں گا۔ نا انصافی کیوں بھی؟“

”میں تمہیں آزاد کرتا ہوں اس رشتے سے۔ مزے سے نیا راستہ بناتا۔“

”آگے ایک لفظ بھی نہ بولنا۔“ تمکنت نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

متورم چہرہ سوچی ہوئی آنکھیں روتی ہوئی۔ بلکتی ہوئی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ یک دم خاموش ہو گیا۔

شیطان کامیاب ہو گیا تھا۔
تمکنت تیور اٹکے نیچے۔

اظہر کی دھاڑ نے کوثر کو کنڈی کھولنے پر مجبور کر دیا۔

دیا۔

”اچھا کیا تم نے۔ مجھے تو دھیان ہی نہ رہا۔ اتنے فون اور ترے فٹس کس لیے ہو رہی تھیں۔ حل کر دیا ہے میں نے اس کا مسئلہ۔ اب اجازت ہے۔ شکر دل پر کوئی بوجھ لے کر نہیں جا رہا۔“ وہ باہر نکل گیا۔ کوثر کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

تیرہ سالوں کی چار ہزار سات سو پینتالیس راتوں کو اس ایک رات میں سوچ لیتا۔ کتنا عجیب لگتا تھا۔ اذیت کا ہر پل ہزار سال جتنا طویل ہوتا ہے۔ تو اس طرح تو شاید وہ اس وقت سے اذیت جھیل رہی تھی جب یہ دنیا تخلیق کی گئی تھی اور ابھی بھی خاتمے کی کوئی امید نہیں۔

وہ پاگل پن کر رہی تھی۔ ایک ضد کے پیچھے زندگی برباد۔ اس نے عدالت سے رجوع کیوں نہیں کیا۔ وہ اب تک اس نام نہاد رشتے کو کیوں نبھاتی رہی تھی۔ ایسے سوالات کے اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھے۔ وہ جواب میں کیا کہتی۔ یہ انا نہیں تھی۔ اس نے کوئی مقابلہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی چیلنج قبول کیا تھا۔ رشتے کی ڈور ٹوٹی تھی۔

ساری دنیا کے قیافے غلط تھے۔ وہ دور دور کی کوڑیاں لاتے۔ احمق اتنی سی بات نہیں سمجھتے تھے یہ جوگ نہیں روگ تھا اور اسے محبت کہتے ہیں۔

وہ آپا کے پاس چلی گئی اور حیدر آباد کے بہترین اسکول میں ملازم ہو گئی اس نے اپنا ماسٹرز مکمل کیا۔ زندگی بس صبح اور شام تھی نہ کہیں آنا نہ جانا۔ نہ کوئی دوست نہ دشمن۔ وہ جانتی تھی۔ وہ کہیں ہے۔ کس حال میں ہے۔ وہ کوثر کو فون کر کے سب خیریت کی تسلی لیا کرتی تھی۔

اس نے دوبارہ کبھی کراچی شہر کا رخ نہیں کیا۔ یہاں وہ سڑکیں چلیں۔ جن پر وہ اس کو ہوا میں اڑائے پھرتا تھا۔

وہ بلند عمارتیں جن کی وہ یونہی خواجواہ گردن اٹھا کر

منزلیں گنا کرتے تھے اور وہ سمندر اور ساحل جو قدموں کے نشانوں کو خود پر پل بھر کے لیے بھی شہرے نہیں دیتا۔ اس کی ہر لہر ثبوت مٹاتی جاتی ہے۔
ہاں قدموں سے لپٹی ریت چلنے والوں کے گھروں تک جاتی ہے اور اس کی تو آنکھوں میں یہ ریت بھر گئی تھی۔

اس نے سب کی خبر رکھی تھی۔ خود کو بھول کر۔ افضل سعید کی خاموشی اور بے حسی یوں معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک ساتھ جائے گی۔ مگر ایک روز وہ بہت نارمل انداز میں اٹھے اور یوں دفتر کی طرف روانہ ہوئے جیسے چھٹیاں گزار کر اگلے روز بندہ ایک نئی لگن سے روانہ ہوتا ہے۔ ان کی سیاہ کروٹا اس روز کے بعد جب اس دن احاطے میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لیے گویا سب کو سانپ سو گھ گیا۔ چلتے ہاتھ اور اٹھتے قدم رک گئے۔ لوگ منہ کی بات بھول گئے تھے۔

کچھ نے ہڑونگ پر قابو پاتے ہوئے سلام جھاڑا تھا اور افضل سعید نے سر کی خفیف جنبش سے جواب دیا تھا۔

وہ اپنے ہمیشہ والے چلے میں تھے۔ سفید کلف لگے کپڑے سیاہ چمکیلے جوتے گاڑی کی چابی اور موبائل۔ ان کا دروازہ قد نمایاں اور کندھے سیدھے تھے۔

کا دیواری مرکز میں آنے اور جانے والے بچے بچے کو اس صبح کا منظر ازیر تھا۔ یہ ایک علم تھا گویا جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوا تھا۔

لیکن افضل سعید نے جیسے پلٹ کر نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ وہ مٹی کو ہاتھ لگا کر سونا کرنے کے فن میں ماہر ہو چکے تھے۔

ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ اسد سعید۔ احد سعید اور افزا سعید۔ اور بس بھانجی زندگی میں عورت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کا عورت ذات سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ بہنوں سے ان کی تنہائی دیکھی نہ جاتی تھی۔ پھر گھر سنبھالنے کا بھی مسئلہ تھا۔ افزا بہت چھوٹی تھی۔

اس کی دیکھ بھال ملازموں پر نہیں چھوڑی جاسکتی تھی۔ بہنیں ان کا گھر بسانا چاہتی تھیں۔ مگر ان کا ایک ہی انکار تھا۔

”ایک عورت۔۔۔ کی وجہ سے آپ سب کو برا نہیں کہہ سکتے۔“ کوثر نے احتجاج کیا۔

”میں سب کو برا نہیں کہہ رہا۔ میرے حصے میں اچھی عورت ہوتی تو پہلی بار ہی میں مل جاتی مگر اب مجھے کسی کا اعتبار نہیں۔“

لیکن بچوں کی تربیت کا مسئلہ کھڑا تھا۔ انہیں سر جھکانا ہی پڑا۔

ان میں کمی بھی کیا تھی۔ اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی تھی۔ بڑی باجی نے بہت دیکھ بھال کرا انتخاب کیا۔ فاطمہ پڑھی لکھی، سمجھ دار اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اچھے کھاتے پیتے کھرانے سے تعلق تھا۔ افضل سعید کو اب حسن کی چاہ نہیں تھی لیکن گھونگھٹ اٹھا کر جب فاطمہ کو دیکھا تو ششدر رہے ہو گئے تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔

اس کے حسن میں عجیب سی کشش اور تمکنت تھی۔

چہرے پر سنجیدگی اور متانت نے اس کی شخصیت میں ایک وقار سا پیدا کر دیا تھا۔ الفت کے ناز و انداز کا ابالی پن ادائیں اس میں کچھ بھی ایسا نہ تھا جو الفت کی یاد دلاتا۔ افضل سعید کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا تھا۔ زندگی ایک ڈھرے پر رواں ہو گئی تھی۔

افزا اپنی ماں کا ماضی اور باپ کا حال جانتی تھی۔ وہ بہت محتاط خاموش اور سمجھ دار بچی تھی وہ اپنی عمر کی باقی بچیوں کی نسبت زیادہ سنجیدہ تھی۔ کچھ ڈری سی۔ لیکن اس کے دل و دماغ میں راسخ تھا کہ اسے بہت اچھی بیٹی بننا ہے۔ بہت اچھی۔

افضل سعید کی زندگی کا مسئلہ احد سعید رہا تھا۔ سال بھر کی عمر ہی سے وہ ایک ضدی بچہ تھا۔ ہٹ و دھرم، بد تمیز اور ماں کے جانے کے بعد وہ جیسے ہاتھ سے نکل جانے والا تھا۔ لیکن اکمل نے اسے اپنی سرپرستی میں

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

✽ گرمے ہوئے بالوں کو روکتا ہے

✽ بے ہال اگاتا ہے۔

✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔

✽ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے

یکساں مفید۔

✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سوہنی ہیرائل

قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جری بوتلیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری

کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں

یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک

بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے بھی آڈر بھیج

کر رہیں ڈپارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے بھی آڈر اس

حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے

3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھجوانے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

اور اظہر کہتا ہے۔ وہ اسے لینے جا رہا ہے۔ اسے اپنا

بنانے

اب اتنا سب ہونے کے بعد۔۔۔ وہ پاگل دیوانہ تو

نہیں ہو گیا۔ یہ تو مذہبی معاملہ ہو گیا ناں۔۔۔ طلاق دی

ہوئی عورت کو دوبارہ۔۔۔ کیسے۔۔۔ کیسے۔۔۔

اکمل جتنے سے اکھڑ گیا۔ ”یہی کرنا تھا تو ڈرامہ کیوں

کیا۔“ اس کی حلقہی بس نام کی تھی۔

بڑی باجیاں اچھ کرنا پسندیدی سے بھائیوں کو سن

رہی تھیں۔ اب باسی کڑھی میں ابال دینے کا فائدہ۔۔۔

اور کوثر لرز رہی تھی۔ سال میں ایک بار وہ فون سنا

کرتی تھی اس کا۔ وہ پی سی او سے فون کرتی تھی اور

حال احوال دیتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ شادی کر

چکی ہے تو کیا اس نے نکاح پر نکاح کر لیا اور اگر اظہر

ٹھیک کہہ رہا ہے تو اب۔۔۔ اب کیا ہو گا۔ کون سا طوفان

آنے والا ہے۔

تمکنت نے اپنا پتا کبھی نہ دیا۔ وہ بہت کھٹکتے لہجے

میں محبت سے سب کا پوچھ کر فون رکھ دیتی تھی۔

”مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں

نہ کب کہا کہ میں بارات چڑھاؤں گا۔ گھوڑی پر بیٹھوں

گا۔ میں تو بس اسے لے کر آؤں گا۔ نہیں رہوں گا

میں یہاں۔ اسے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”اتنے سال گزر گئے بھائی جان۔۔۔! باجی! پلوں کے

نیچے سے کتنا پانی گزر گیا۔ اب محبت لگاؤ نہیں ہے۔

ایک بوجھ ہے جو اتارنا ہے بس۔“

وہ مڑتا رہا نہیں رہا تھا۔ مگر وہ نا اور کہتے ہیں؟

”ان پلوں کے نیچے پانی نہیں تھا جو گزر جاتا یہ غلط

بدروازہ کچر تھی جو آج بھی وہیں کی وہیں جی ہے۔ اور تم

پھر اسی گزر گاہ کو اپنا پنا چاہتے ہو۔“

اکمل چمک کر بولا تھا۔ وہ اپنا سر پھوڑ دینا چاہتا تھا یا

پھر اس کا۔

”اس کا قصور کیا تھا؟“ وہ بیچ و بیچ کھڑا بول رہا تھا۔

اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ ”ہم طلاق راتوں میں اذان

کے وقت سورج گرہن دیکھ کر فوراً سر بسجود ہو

جاتے ہیں، رورو کر گھر گڑا اپنے کردہ ناکرہ، شعوری

وہ سب اسے اچانک اسے دیکھ کر حیران تھے۔

سب زندگی میں آگے بڑھ چکے تھے۔

ماضی کا ایک داغ آج بھی پیشانی پر چمک رہا تھا۔ مگر

اس وقت کی درد چھین، تکلیف اب یاد بن چکی تھی۔

اس کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ وہ اپنے پچھتاوؤں کو

زبان بڑے سکنا۔

اپنی خود ساختہ جلا وطنی کاٹ کر بھائی لوٹ آیا تھا۔

بہنوں کی خوشی کا حال ہی کیا۔۔۔ وہ اسے چوم رہی

تھیں، نثار ہو رہی تھیں۔ افضل سعید اور اکمل اپنے

اندر ایک توانائی، ہمت جوانی، خوشی بیدار ہوتے دیکھ

رہے تھے۔

اس محفل میں قہقہے تھے، لطیفے باتیں۔۔۔ سب

ایک دوسرے سے خوشی کے اظہار میں سبقت لے

جانے کی دوڑ میں تھے۔

✽ ✽ ✽

اظہر نے اپنے واپس آنے کا مقصد دہرایا۔ تو جیسے

طوفان آ گیا۔ یہاں سب بول رہے تھے۔ اپنی اپنی

بولیاں مگر معنی ایک ہی تھیں۔

حیرانگی، غصہ، اچھٹا، بے یقینی۔۔۔

اظہر ایسا کیسے کہہ سکتا ہے۔ وہ تو اسے فارغ کر گیا

تھا۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر کوثر سے کہا تھا۔

اس نے تمکنت بی بی کا مسئلہ حل کر دیا ہے طلاق دے

کر، فارغ کر کے۔ کوثر کرنٹ کھا کر تمکنت کی

جانب مڑی تو وہ۔

نیشن پر بکھری لٹی سی بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو اور

شکوہ کنال بے بس نگاہیں اظہر کے بیان کی تصدیق کر

رہی تھیں۔ کیسے تمکنت جلال برپا واپس پٹی تھی۔

اس کا وہ پٹا جو سر پر نکا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے مرک کر

کندھے پر گر گیا تھا وہ چلتی نہیں تھکتی تھی۔ اس کی

آنسوؤں سے لبریز آنکھیں کوثر کو کبھی نہیں بھولی

تھیں۔

1

لے لیا۔ اس کا ہر طرح خیال رکھا۔

انیس برس کی عمر میں لگنے والا جھٹکا جیسے اکمل کو دنیا

کی حقیقت دکھلا گیا۔ اس نے زندگی کو بہت قریب سے

دیکھا اور سمجھا۔ اس کا جو شیلا مزاج نرم روی میں بدل

گیا۔ وہ دوستوں کی مجلس کا شائق تھا پھر کتابوں سے

دل لگا لیا اس کی سخت مزاجی اور پر غرور انداز نجانے

کب عاجزی اور نرمی میں ڈھلا کہ وہ خود نا آشنا رہا۔

اسد اور احمد بڑی باجی اور دیگر اہل خاندان کی

موشگافیوں کے باعث بہت کم عمری میں سب چیزوں

سے باخبر ہو گئے۔ وہ بہت بڑے کاروبار کے مالک تھے۔

ان کی عزت تھی۔ افضل اور اکمل نے ان پر کڑی سے

کڑی نگاہ رکھی تھی۔

وہ کلج جاتے تھے۔ اکمل کے ساتھ پانچ ٹائم مسجد

اور درس میں شرکت کرتے۔ ان کے موبائلز پر پاپ

اور پچا کا بہت پکا چیک تھا۔ وہ اپنے ہم عمروں سے کچھ

الگ تھے۔ مگر ٹھیک تھے۔

انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ انہیں سنبھال لیا گیا

تھا۔

✽ ✽ ✽

سزا اور جزا انسانوں کے ہاتھ دی جاتی۔ تو انسان کی

افیت پسند، خود غرض، طوطا، چشم فطرت، بھی تھوڑے

پر اکتفا نہ کرتی۔ وہ سزا سنا تا ڈومور کے نعرے کے ساتھ

۔۔۔

اظہر سعید تیرہ سال بعد لوٹ آیا تھا۔

وہی شہر وہی ہوا، وہی لوگ۔ ہاں وہی لوگ۔ پھر

دل بے درد۔

افضل سعید نے اپنے نیچے بہت محنت سے پالے

تھے۔ ماضی کے کسی طعنے کے بغیر۔

اکمل سعید کے چہرے پر پھیلی عاجزی اور نرمی اس

کے احساس جرم کو برعاقب تھی۔ اسے اپنے کیے پر جی

بھر کے افسوس ہوا۔

یہاں سب ماضی کو بھول چلے میں جی رہے تھے۔

2

لاشعوری گناہوں، جانے انجانے جرائم سے توبہ کرتے ہیں۔ رحم مانگتے ہیں اور اگر کبھی معاف کرنے کا اختیار ہمیں دیا جائے تو ہم صرف فرعون رہ جاتے ہیں۔ کھنور بے حس ظالم۔ بھیانک چروں والے تنگ دل خدا۔ جب ہم انسان ہو کر انسان کا جرم معاف نہیں کر سکتے تو پھر کوئی حق نہیں کہ ہم داڑھیاں سجا کر ٹوپیاں پہن کر۔ خود کو اللہ کا ماننے والے بتائیں۔ دکھائیں اور جبراً بتائیں۔

اس کی آواز پھر لڑکھرائی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اتنا اونچا لہجہ مرد۔
”میں اپنے لیے نہیں رو رہا میں اس کے لیے نہیں رو رہا۔ خدا کی قسم۔ میں تو اللہ سے ڈر رہا ہوں۔ اپنے لیے۔ کس منہ سے کب کیسے معافی مانگوں گا۔ کیونکہ جب خدا نے ایک اختیار مجھے دیا تو میں نے کیسے اندھا دھند ناجائز فائدہ اٹھایا۔“

”تت۔ تمہیں یاد ہے کوثر!“ وہ بے چینی سے کوثر کی جانب مڑا۔ ”اس کی چادر شانوں سے سرک رہی تھی اور اس کے پیر جوتے سے باہر تھے ایریاں زمین پر گھسکتی تھیں۔“

اور مجھ جیسا مکینہ شخص۔ (چ) میں نے تو وعدہ کیا تھا۔ تمام عمر اس کے سر کو ڈھانپ کر رکھنے کا۔
”آپ نے اپنا فیصلہ صحیح کیا ہو گا۔ آپ نے جرم پکڑ لیا تھا۔ میں نے کس بات کی سزا دی؟“ وہ افضل سعید سے مخاطب ہوا۔

تیرہ سال کا جوگ کاٹا۔ اس پر احسان نہیں۔ کوئی اس قابل ہی نہ لگی۔

میں نے اسے کیا اپنانے جانا ہے وہ مجھے اپنائے گی؟ وہ تو سرخ رو رہی۔ ہمارے منہ پر دو سری بار بھی کالک ایک عورت ہی نے ملی۔

پہلی نے بے وفائی بے عزتی سے۔ اور دو سری نے وفا سے عزت کو سنبھال کے۔ رکھ کر۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور آپ اسے معاف نہ کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ میرا تو دل لرز رہا ہے۔ وہ مجھے معاف کرے گی اور اس نے نہ کیا تو

۔ اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

عصر اور مغرب کا یہ درمیانی وقت افطاری کی تیاری کے باعث چٹکی بجاتے کیسے گزر جاتا تھا۔ پتا نہیں چتا اور سے آج صبح ہی سے کالے کالے بابل ٹھنڈی ہوا کے ساتھ سارے حیدر آباد شہر پر تن گئے تھے۔ ان بادلوں کو برسنے میں نجانے کیا جھجک مانع تھی۔

تمکنت مین گیٹ تک جاتی اندرونی پہلی ریلواری میں کرسی ڈال کر قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ وہ افطاری میں مدد دینے کے بعد مغرب کی اذان سے بیس منٹ پہلے ایک پارہ پڑھتی تھی۔ لائٹ جانے کے باعث اندھیرا تھا۔ گرمی زیادہ محسوس ہوئی تو ادھر آگئی۔ ریلواری کی چھت نہیں تھی۔ حفاظت کے خیال سے سیاہ لوہے کی جالی لگی تھی۔ ہلکی کن من نے اس کے دوٹے اور چند ٹٹوں کو نمی دے دی تھی۔ وہ کرسی پر پیر اوپر کیے پھوار سے صفحے کو پچانے کے لیے جھکی ہوئی سی تھی۔

حناء اور حرا پکوڑوں اور چاٹ سے نبرد آزما تھیں جبکہ سامنے آیا بڑے پٹیلے میں لال سرخ شربت میں چینی گھول رہی تھیں۔

”کل بہت تیز میٹھا ہو گیا تھا امی!“ حرا نے کہا۔

”اور پر سول بہت پھیکا۔“ حنا نے لقمہ دیا۔

”تو کون سی قیامت آگئی تھی۔“ آیا بھنا گئیں۔

”تیز ہو گیا تو پانی ڈال لیتا اور کم ہوا تو چینی برہا لیں گے ایسا کون سا ناقابل صحیح کام ہو گیا تھا۔ ہونہ۔“

کاش زندگی کی کچی کوکھی بیشی کو بھی ایسی آسانی سے برہایا اور گھٹایا جاسکتا پھوار دھار میں بدل رہی تھی اس نے انگلی پھنسا کر قرآن بند کر لیا۔

وہ چہرہ اوپر اٹھا کر بے پناہ لطف اٹھا رہی تھی۔ مٹی کی سوندھی مہک نے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑا دی تھی۔

”ٹھک ٹھک۔“ اس کی مسکراہٹ کا دم ٹوٹ گیا۔ ”آپا کا یہ گھر پوش علاقے میں تھا۔ مگر کالونی کی

باؤنڈری وال کے پیچھے چھوٹے موٹے مزدور پیشہ لوگ ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہتے تھے۔ بھوسی ٹکڑے والے، آواز لگا کر امرود اور فالسے بچنے والے، لفافے بنانے والے۔ آپا نے ان میں سے کئی کو ریفوینے کا کہہ رکھا تھا۔ وہ ڈھیروں برتن جمائیتیں۔ عصر کے بعد سے دروازے پر لگا تارو تنک ہوئی تھی۔ آبا عصر کے بعد خود ہی تھیلیاں بنا کر رکھ لیتیں اور دیا کرتیں۔

اس نے پیر نیچے لٹکا کر سولٹی پھنسا ئی تب ہی صدا بلند ہوئی۔ ”اللہ کے نام پر بابا اللہ بھلا کرے گا۔“ دروازے پر شاید فقیر تھا۔

اس نے ذرا سا پٹ واکر کے انگلی میں دبے دو سکے آگے بڑھائے۔

”اللہ تجھے سکھی رکھے۔ دلی مراد پوری کرے۔ دے دے نخی دے دے۔“ وہ جھکی۔

اس نے دروازے کا پٹ مزید کھولا۔ قیمتی گاڑی سے اترتی عورت اپنے پرس پر جھکی ہوئی تھی۔ باہر وہی فقیر تھے۔

تمکنت نے چونک کر دو سیڑھی نیچے کھڑے بلبو جینز اور بسکٹ جیکٹ والے فقیر کو دیکھا۔ اس کے سانولے پھیلے ہاتھ میں دو سکے تھے۔ وہ دو سیڑھی نیچے کھڑا تھا۔ اسے تمکنت کا چہرہ دیکھنے کے لیے اوپر نگاہیں اٹھانی پڑتی تھیں۔

”معاف۔ کف۔ بابا داغ میں تیار فقرہ ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں بکھرا۔“

گھڑی کی سوئی نے اس بار جب اپنا چکر پورا لیا۔ تو چھوٹی سوئی بڑی سوئی کے اوپر تھی۔ سیکنڈ منٹ گھنٹوں کا حساب اب کی بار اس کی جھجک سے معلوم ہوتا تھا۔

دنیا ہونی کا نام ہے اور آخرت انہونی۔

ہاں ہمارے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ اس کا خیال عبث ہے اور آخرت ہزاروں سال کے بعد نہیں آئے گا۔ کبھی کبھار آخرت تیرہ سال بعد بھی آجاتی ہے۔

ترازو میں تولتے تو دونوں کا رشتہ برابری کا تھا۔ شک، نفرت اور گمان و اندیشے نے ایک بار اظہر سعید کو اوپر کر دیا تھا تمکنت جلال بیگ دھار سے نیچے نشن دوس۔

وفا، یقین، محبت انتظار، اس بار وہ اونچی تھی۔ بلند اتنی کہ اسے دیکھنے کے لیے ایریاں اٹھانی پڑی تھیں۔ وہ دوسرے سے دور ہو چکی تھی۔

اظہر سعید کے لیے نگاہیں اٹھانے کا نہیں۔ جھکانے کا وقت تھا۔ اس کا دلایاں پیر سیڑھی پر اٹھا۔ اس نے انہی مٹی بند کر لی۔

اور تمکنت نے آنکھیں۔ وہ خود پر اختیار کھو رہی تھی۔ ہوائے دونوں پٹا اکڑے۔

آپا نے حیرت سے گاڑی کو معورت کو اور مرد کو دیکھا۔ چیخ پر ہاتھ لرزاتو سیخ پانی جھلک گیا۔ وہ دلی پر ہاتھ رکھے اپنی بے یقینی کو یقین میں بدلنا دیکھ رہی تھیں۔

”خدا کی قسم۔ خدا کی قسم تمکنت۔ تم اسے کبھی معاف نہ کرنا۔ کبھی نہیں۔ ناقیامت۔ مگر اس کے ساتھ چلی چلنا۔ فیصلے کا اختیار تمہارا ہے اور در خواست ہماری۔“

کوثر تیزی سے راستہ بناتی۔ تمکنت کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

”زندگی بھر اس کے ساتھ رہنا، ہنسنا بولنا، رونا، خوشیاں دیکھنا، غم جھیلنا، گمراہی سے معاف نہ کرنا۔ اب کی بار اختیار تمہارا ہے تمکنت اظہر سعید۔ معاف کر دو گی تو ساری عمر شرم سے پانی پانی رہے گا۔ نظروں سے نظریں ملانے کے مقابل نہ ہو گا۔ معاف نہ کیا تو جیسے گا ایک احساس جرم کے ساتھ آخر سانس تک۔“

ان تیرہ سالوں کے ایک ایک اذیت ناک پل کا حساب روز حشر کے لیے رکھ دینا مگر اللہ کے لیے اپنی زندگی کو میدان حشر نہ بناؤ۔ جہاں سورج کندھوں پر سواری کرے گا۔

کوثر کینیوں سے اوپر اس کے بازو پکڑے اسے

جھوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
بارش نے یقیناً "چرے بھگو دیے تھے۔ مگر
آنکھوں میں ڈولتی سرخی آنسوؤں کی تھی۔
تمکنت منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کا داغ
آنکھیں دل سوچ سب ساتھ چھوڑ گئے تھے اس نے
کتاب الہی کو سینے میں بھینچ رکھا تھا۔ وہ دیوار سے جا
لگی۔

کوثر سب کے ساتھ اوپن کچن والے لاونج کے
فرشی و سترخان پر بیٹھی تھی۔
اظہر بیرونی مہمان خانے میں تھا تھا۔ بھائی صاحب
اور آپا کے دونوں بیٹے تھوڑا بہت کھا کر نماز مغرب کے
لیے جاتے تھے۔ حنا نماز سے پہلے کمرے میں گئی کہ
کچھ چاہیے ہو تو۔

"انہوں نے کچھ نہیں کھایا۔ ویسے کے ویسے
بیٹھے ہیں۔ ہر چیز جو کی توں ہے" انہوں نے ہاتھ بھی
نہیں لگایا۔

آپا نے کوثر کی صورت دیکھی وہ اٹھنے لگی۔ تو یکدم
تمکنت کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے
اسے روکا تھا۔

میون کارپٹ پر اس کے پیر اظہر کی نگاہوں میں آ
گئے۔

درمیانی تپائی افطاری کے لوازمات اور موم بیویوں
سے جچی تھی۔

وہ چونک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں دودھو تھے۔
تمکنت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے آئی تھی۔
اظہر میں اتنی ہمت کہیں۔

اسے دفعتاً یہ احساس ہوا وہ اس کے سامنے ایک
پل بھی کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس کا خود پر اختیار کھو گیا۔ وہ
جھکے سے دوڑا تو ہو کر گیا تھا۔

تمکنت بھی کھڑی بھی نہ رہ سکی تھی۔ وہ بیٹھ گئی
تھی۔

"کوثر ٹھیک کہہ رہی ہے میں چاہتا ہوں۔ میں

ساری زندگی تم سے معافی مانگوں اور تم مجھے معاف
کرو۔ لیکن میرے ساتھ چلو تمکنت مہم۔ مہم۔ مہم۔
تمہیں لینے آیا ہوں۔ آگیا ہوں۔ ساری عمر میرا ج
جٹانا کچھ کے لگانا۔ لیکن میرے ساتھ رہنا۔

میں خود کو سزا یافتہ دیکھنا چاہتا ہوں
تمکنت۔ "وہ رو پڑا تھا۔ اتنا اونچا لمبا مرد۔ جو چھوٹا
چھوٹی باتوں سے ہنساتا تھا۔ لطف اٹھاتا تھا۔ اسے ہنسا
دیکھنا دل کو خوشی دیتا تھا۔

اور اسی دل دار کو روٹا دیکھا؟؟؟
اس نے اس کے بند ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ
دیے۔

وہ اس کے بغیر بہت روئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ
بہت ہنسی تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ رونے میں آج
شانہ بہ شانہ ہوتی۔

دونوں کی پیشانیاں ایک دوسرے سے جڑی
تھیں۔ ہاتھوں پر گرتے آنسو ناقابل شناخت تھے۔

وہ ایرپورٹ پر کھڑے تھے۔ عمرے کی ادائیگی کے
لیے سعودیہ عرب جانا تھا۔ عید میں ابھی چار یا پانچ دن
باقی تھے۔ انہیں سی آف کرنے آنے والوں میں کوثر
کنیز اور چھوٹی باجی شامل تھیں۔ تمکنت کی آپا اور
بھائی صاحب بچے بھی ہمراہ تھے۔

فلائٹ حسب معمول لیٹ تھی۔ اظہر کا چہرہ کسی
قدر اترا ہوا تھا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں سے بہت محبت
کرتا تھا اور ان کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ مگر آج

وہ جان چکا تھا کہ وہ لوگ نہیں آئیں گے۔ مگر
طیارے کے باقی مسافروں کی نسبت وہ اس انتظار سے
مطمئن تھا۔ اس کی نگاہیں ہر آنے والے کو کھوجتی
تھیں اور جب مایوس پلتی تھیں تو وہ تمکنت کا چوڑیوں
بھرا ہاتھ مزید مضبوطی سے پکڑ لیتا تھا۔

گلاس وال کے پیچھے والے چہرے پر اسے افضل

سعید کا گمان ہوا تھا۔ احد اور اسد اور شاید اکمل۔ وہ
پلکیں جھپک کر یقین کرنا چاہتا تھا۔ گھٹنا فاصلہ یقین کو
جلا بخش رہا تھا۔ ہاں یا نہیں۔

دل اور نظریں ہاں کی جانب مائل تھیں۔ وہ
تصدیق کے لیے تمکنت کی جانب مڑا اس کی بھی یہی
کیفیت تھی۔

اور ایسی ہی ایک تصدیق افضل سعید نے دون
پہلے اکمل سعید سے چاہی تھی اور سیاہ پڑا پڑا مسلا ٹوٹا
دل۔ نئی سننا چاہتا تھا۔

افضل سعید کا دل تیرہ سالوں سے صرف خون کے
ہواؤ کا زریعہ تھا۔ اس میں جذبات احساسات۔ محبت
خیال یاد گمان کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔
وہ اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھے اور اگر سمجھتے تو
حیران ہو جاتے مگر وہ نفی کے منتظر تھے۔

یہ رمضان کے مہینے کا ایک نسبتاً خاموش اور
کاروبار کے حوالے سے ڈھیلا دن تھا۔ لوگ در سے
آتے نماز ظہر کے لیے اٹھتے اور عصر کے لیے گھڑی
دیکھتے ہوئے مغرب کو کھوجتے۔ یہ شدید گرمی اور ایمان
والوں کے امتحان والے روزے تھے۔

افضل سعید اظہر سعید کے معاملے کو لے کر گرم صم
سے تھے اور آج بالکل وقتر آنے کا ارادہ نہیں رکھتے
تھے مگر آج یہاں روزہ کھلوانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔
شام کو کھلی دعوت تھی اور دن میں انہیں بند آنکھوں
اور روال ہاتھوں سے خیرات باشتی تھی۔

کچھ لوگوں کو خود رقوم دینے کے بعد وہ کچھ نقاہت
محسوس کرنے لگے تو اپنے اے سی آفس میں جا بیٹھے۔
اکمل اسد اور احد موجود تھے۔ وہ کسی کھاتے کو چیک
کرنے گئے تھے وہاں لائن لگا کر کھڑے تمام لوگ
فاسر ہو گئے تھے۔

افضل سعید نے ارادہ باندھا کہ وہ بھائی اور بیٹوں کو
اتنی شدید گرمی سے اندر بلا لیں۔ افطاری کے وقت
دیکھیں پیچھے ہی جانا تھیں۔ اسد اور احد اندر آگئے تھے۔
اکمل میز کی درازوں کو لاک لگاتا ہوا کیش بکس اور دیگر
چمکنا سمیٹ رہا تھا۔ وہ اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا

تھا۔ افضل سعید نے اشارہ کیا کہ وہ جلد اندر آجائے۔
مگر ذرا سامنے نکال کر دیکھا وہ کوئی عورت تھی۔ سیاہ
تنگ پائنجیوں کی شلوار سفید قمیص جو دھل دھل کر
اپنا پرنٹ کھو چکی تھی۔ سیاہ دوپٹا چہرے اور گرد سینہ کو
چھپائے ہوئے تھا۔ اس کے بعل میں سستا سا پچاس
پچھتر روپے والا پرس تھا۔

اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ آنکھیں نمایاں تھیں جن
کے سروں پر جھریاں سی تھیں مگر وہ کوئی بوڑھی عورت
نہیں تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا جو ڈھالی تین
برس کا ہو گا۔

بچہ بسکٹ رنگ کی رنگین لائٹوں والی نیکر
بشرٹ میں تھا۔ اس سوٹ کی مالیت بھی سو ڈیڑھ سو سے
زیادہ نہیں تھی اور کثرت دھلائی سے وہ اپنی ملائمت
کھو چکا تھا۔

بچہ ہاں کے کندھے پر اونگھ رہا تھا۔
اکمل کی نگاہ اٹھی۔ عورت کی آنکھوں میں
تذبذب تھا۔ آگے بڑھے یا مڑ جائے۔ اکمل اپنی دکان
بڑھا چکا تھا۔ اکمل نے آنکھیں چند ہی کیوں اتفاق
سے وہ کل ہی اس عورت کو اپنی گاڑی کے پاس ٹھک
کر رکنا دیکھ چکا تھا۔

کاروباری مرکز میں مردوں کا زور تھا۔ یہاں چائے
کی پتی یا اخروٹ اور پادام بیچنے والی عورتیں نشن پر
کہیں بھی بیٹھ کر بیچا کرتی تھیں اور اگر بوہنی نہ ہو تو کسی
بھی سینٹھ سے لجا کر گڑا کر شام کی روٹی کے لیے کچھ
پیسے پکڑ لیا کرتیں۔

یہاں جسم فروش عورتیں بھی نظر آجایا کرتی
تھیں۔ گھروں سے دور ٹرک ڈرائیور اور کلینرز ان کے
گاہک ہوتے۔ مگر اکمل کے لیے یہ عورت نئی تھی۔
کچھ بیچ بھی نہیں رہی تھی اور اگر بکنے آئی ہوتی تو
اوٹھتا بچہ لے کر۔؟

اکمل دراز کے لاک سے چابی کھینچ رہا تھا۔ اس نے
چابی دوبارہ لگالی۔ اندر صرف دو لفافے بچے تھے اس
نے ایک اٹھایا پھر کچھ سوچ کر دوسرا بھی اٹھالیا۔
عورت لفافے پکڑ کر لجاجت سے شکریہ کہنے یا

دعا میں دینے کے بجائے لفافے کھولنے کھڑی ہو گئی۔ اندر کی رقم ٹھیک تھی مگر اس کی ضرورت سے شاید بہت کم۔

وہ دفعتاً "کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ نقاب اتارنے بنا ہی نہ پونچھ رہی تھی۔ اکمل استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔

"ہم۔۔۔ پانی!" رمضان کے مہینے میں یہ انتہائی احمقانہ بد تمیزی ڈیمانڈ تھی۔ اکمل نے روم فریج سے بوتل نکالی اور گلاس اس کی جانب پر بھایا۔

اس نے بنار کے ایک ہی سانس میں پانی اتار لیا وہ دوسرا گلاس اپنے بچے کے لیے چاہتی تھی۔ اس نے پیسے اپنے پرس میں ٹھونس لیے تھے۔

اکمل کا اچنبھا دوچند ہو گیا۔ یہ عورت اب جاتی کیوں نہیں۔۔۔ سارے کام تو ہو گئے تھے۔

وہ اپنی ایڑی کو جوتی سے کھسکا کر فرش پر مسل رہی تھی۔

"یہ میرا بیٹا ہے سب سے چھوٹا۔۔۔" اس نے بچے کا دیکھا چہرہ گھبرا کر اکمل کے سامنے کیا۔

"بنار ہے۔۔۔ یہ دیکھو۔" اس نے بچے کی شرٹ پیٹ سے اٹھائی پیٹ حد سے زیادہ پھولا ہوا تھا۔

"اوہو۔۔۔!" اکمل نے سر ہلایا۔ اسے یقیناً زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ "کل۔۔۔ کل آٹا۔۔۔ میں اور دے دوں گا۔ ابھی اتنا ہی کیش تھا۔" وہ تیزی سے بولا اور جلد از جلد اندر جانا چاہتا تھا۔ اسے روزہ لگ رہا تھا۔ اسے کرسی گھسیٹ کر کھٹا دیکھ کر عورت نے جوتی چپڑ میں فٹ کی اور پرس کو کندھے پہ جمالیا۔ وہ لوٹنے لگی تھی۔

"سنو۔۔۔ اکمل!" اپنے نام کی بے تکلفانہ استحقاق بھری آواز پر وہ کرنٹ کھائے انداز میں پلٹا تھا۔

"اپنے۔۔۔ اپنے بھائی سے کہنا۔ اتنی دنیا کو خیر۔۔۔ خیرات صدقہ زکوٰۃ دیتا ہے۔ میرے۔۔۔ کچھ مسئلے ہی حل ہو جائیں اگر وہ کچھ مدد کر دے۔ فطرانہ۔ یا زکوٰۃ وغیرہ۔۔۔ تین بیٹیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑا لڑکا بھی ہے۔ مہنگائی کا تو نہیں ہوتا ہے نا۔ اس کے

ابو کا پان کا کھوکھا ہے۔ مگر اس کو منہ کا کینبر ہو گیا۔ اس لیے۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ اس کا نام کیسے جا تھی۔

چلو نام جاننا اہم نہیں۔ جلی حروف میں لکھا تھا۔۔۔ کے باہر۔

افضل سعید اکمل سعید۔۔۔ مگر وہ اسے کیسے مخاطب کر رہی تھی۔

"تت۔۔۔ تم۔۔۔ آپ کون؟" ایک حتمی احساس اس کے سر پر ڈنڈے کی طرح برساتا تھا۔ وہ پرس وغیرہ درست کرتے ہوئے نقاب کو کس چکی تھی۔

اکمل نے سر سے پیر تک اسے بغور دیکھا۔ بوٹا سا قد۔۔۔ پیروں کی جوتی اور بے حس تاثر والی۔ تو کیا ہوا جیسا احساس بتاتی آنکھیں۔

کس کی تھیں ایسی آنکھیں؟

کیسی آنکھیں۔۔۔ لا پروا۔ خود میں مگن۔ بس اپنی کہنے والی۔

"کیوں کھڑے ہو اکمل۔ فارغ نہیں ہوئے؟"

افضل سعید باہر آگئے۔

"ہو گیا۔" اس کا سر خود بخود ہل گیا۔

"جاؤ بی بی! کل آنا۔ آج بس اتنے ہی تھے۔"

اس عورت سے مخاطب ہوئے مگر سارا دھیان اکمل کی طرف تھا۔

"پھر آجاؤں کل۔۔۔ کچھ کرو گے میرے لیے۔ تم"

اس نے بچے کو شانے پر بدلا اور سرسری نگاہ سے افضل سعید کو دیکھا تھا۔

"آپ چلیے بھائی۔ میں آیا۔" اکمل ایک ٹرانس میں تھا۔

افضل نے ایک نگاہ غلط انداز سے اندر جاتے جانے اس عورت کے سراپے کو دیکھا تھا۔ کچھ تھا۔ کچھ چونکا نے والا۔

وہ بے ساختہ شیشے کی دیوار سے چپک گئے۔ وہ باہر دیکھ سکتے تھے۔ مگر باہر والا انہیں نہیں۔

"وہ دونوں۔۔۔ جو ابھی تمہارے ساتھ تھے۔ میرے بیٹے تھے ناں؟" اس کا لہجہ بالکل بے تاثر تھا۔ جیسے کسی اجنبی کا تذکرہ یونہی نکل آئے۔ "باپ پر نہیں گئے ناں۔؟"

وہ مسکرائی تھی۔

اکمل کے پاس جواب نہیں تھا۔ نوالہ چباتے ہوئے زبان چبالی جائے تو کیا ہوتا ہے۔ اکمل کے ساتھ ہو رہا تھا اور وہی جانتا تھا۔

زمین، آسمان، سورج، چاند، رنگ، روشنی اندھیرا۔ ایک ریل سی تھی جو نظروں میں گھوم گئی۔

"کل آؤں پھر میں۔۔۔ سچی بڑی مجبور ہوں میں۔"

وہ آج بھی بس اپنی کہتی تھی۔ اکمل کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ وہ معمول کی طرح سر ہلا گیا۔ عورت نے شیشے کے بند دروازے کو پل بھر دیکھا پھر وہ دروازے سے نکل گئی۔

افضل سعید کے گرد پھونکا سحر ٹوٹ گیا تو وہ دھاڑ سے دروازہ کھولتے باہر نکل آئے۔ اکمل جوں کا توں تھا۔ وہ اس راستے پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا جہاں وہ مڑی تھی۔

"کک۔۔۔ کون تھی۔۔۔ یہ اکمل؟" انہیں سو فیصدی درست جواب معلوم تھا مگر اثبات میں ہلتا سر۔

"بھابھابھی۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ الف۔۔۔ الف تھی۔۔۔ کہہ رہی تھی۔" اس بار افضل سعید نے اپنی زبان چبالی تھی۔

"کس لیے یہ سب ڈراما۔۔۔ وہ الجھ کر اکمل کی حرکات دیکھ رہے تھے۔ تم بھی سب کچھ بھول گئے اکمل تم بھی تو۔۔۔ یہیں موجود تھے۔"

ان کے لہجے کا تعجب اور آنکھوں کی حیرانی۔ اکمل کے چلتے ہاتھوں کو روکنے سے قاصر تھی۔ وہ بہت سارے بڑے ٹوٹ ایک لفافے میں ڈال بند کرنے والا تھا۔

اکمل کے ہاتھ تھم گئے۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں تو افضل سعید کے اوپر کمرے کی چھت گر گئی۔ وہ آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔

افضل سعید اپنی حیرانی، غصہ، خوف سب بھول کر اب اکمل کے لیے پریشان ہوا تھے۔

اکمل نے فون پر منشی کو پیغام دیا تھا۔ "کالی چادر والی ایک عورت آئے تو انہیں فوراً اطلاع دے۔ اس کی گود میں ایک بچہ ہوگا۔ میں نے اسے کچھ دیتا ہے۔"

افضل سعید کی سماعتوں کے لیے یہ صور جیسی آواز تھی۔

افضل سعید اپنی نشست سے اٹھ کر اکمل کی کرسی کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں کل اس کرسی پر الفت۔۔۔ بھابھابھی بیٹھی تھیں۔" افضل سعید نے نام پر پہلو بدلا۔ وہ ہمہ تن گوش تھے۔ وہ اکمل کا مسئلہ جاننا چاہتے تھے۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو افسانہ کالی میٹلیا

کانیا ایڈیشن قیمت - 750/- روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

گھانا خواتین

قیمت - 250/- روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - 800/- روپے کا مٹی آڈر ارسال فرمائیں۔

منعوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

”نہیں۔ کل میرے سامنے میرا اعمال نامہ تھا۔“ ایک بار ظلم ہم سب کے ساتھ ہوا تھا۔ نا انصافی تماشا بے عزتی، ذلت اور ہم نے انگوٹھ کو یہی سب لوثایا۔ جب اظہر نے ایک سراسر بے قصور کو ظلم کے بدلے زیادہ ظلم سے نوازا دیا۔ اس کی آنکھیں تو کھل گئیں۔ دیر ہی سے۔

اور کل دوپہر ایک اور چہرہ۔ جس نے میری ہستی کو تہہ وبالا کر دیا۔

یہ جو میں ساری باتیں کر رہا ہوں ناں۔ یہ میں نے کسی کتاب میں کبھی نہیں پڑھیں۔ مجھے ان کا مطلب بھی نہیں معلوم یہ تو بس زبان سے ادا ہو رہی ہیں۔

کل۔ کل میری آنکھوں نے اللہ کے انصاف کو دیکھ لیا اور آج میرے منہ میں اس کے الفاظ ہیں۔ مجھے خود پر یقین نہیں آ رہا۔ میرے پاس تو کوئی نیکی نہیں۔ گناہ ہی گناہ۔ لوگ چلے کاٹتے ہیں۔ وظیفے کرتے ہیں اور سجدے۔ پھر بھی اللہ کو نہیں پاسکتے اور میں نے اللہ کو سمجھ لیا۔ اس نے کلائی آنکھوں پر رگڑ لی۔

اور دل کبھی نہیں پھرتے اگر اللہ پھیرنا چاہے۔ بڑے بڑے آفاقی جہلے دل کی دیوار سے ٹکرا کر دھڑ دھڑ کرتے ہیں۔

اگر دل پتھر کا ہو لیکن دل موم سے ڈھالا گیا تھا۔

اکمل نے تو نجانے کس کیفیت کے زیر اثر کہا تھا اور عمل کیا تھا۔ لیکن افضل سعید نے کل تیلوار والی اس عورت کو تھکے قدموں سے موڑ مڑتے دیکھا تھا۔

وہ روز حشر اس معاملے کو لازمی اٹھانے والے تھے، اپنی محبت کے بدل کی بے زاری عزت کے جواب میں ملنے والی ذلت۔

لیکن اللہ نے کل دوپہر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا تھا۔

سزاوار سزا لیا گیا تھا۔

”جس دن قرآن خوانا تھی۔ تم دونوں نے اکمل

کے ساتھ باہر خیرات دی تھی۔“ اسد اور احد کو وہ دن یاد تھا۔ اس میں ایسا خاص وہ باپ سے کبھی نگاہ ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔ ”اکمل نے آخر میں ایک عورت کو۔ دو لفظ دے دیے تھے۔ ”وہ قصداً رکے۔“

وہ دونوں اس قصہ کے سیاق و سباق سے ناواقف تھے۔ اسد اور احد نے دزیرہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ہلکی سی نگاہ اٹھا کر باپ کو۔

ان کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔ مگر آنکھوں میں ادھیڑ بن کا تاثر تھا۔ ان کے بیٹے نہیں جانتے تھے افضل سعید اپنی زندگی کا ناقابل یقین فیصلہ سنالے والے ہیں اپنے حوالے سے اور ان کے حوالے سے۔

”اس نے نقاب کر رکھا تھا۔ تم لوگ چہرہ نہیں دیکھ سکتے ہو گے؟ اور شاید۔“ وہ کھوسے گئے دیکھ بھی نہ تو پہچان نہ پاتے۔ ”دونوں نے نا سمجھی کے عالم باپ دیکھا۔“

”تم دونوں اچھے بچے ہو۔“ ان دونوں کی حیرت بردھتی جا رہی تھی

”آج کل کے زمانے کے بچوں سے بہت مختلف میں بہت ڈرا رہا کہ کیسے تربیت کر سکوں گا۔ کوئی نا ہو جائے۔ مگر اللہ کی مہربانی اور انعام۔“

اپنی آواز کے بھرا جانے کا ان ہی کو معلوم ہوا۔ ”بہر حال! کم ٹو دی پوائنٹ۔ کلج کے بعد نہ لوگوں کا دفتر آنا، کام سیکھنا مستقبل کی پیش بندی ہے تاکہ وقت ضائع نہ ہو اور بری صحبت سے بچے رہو۔ لیکن بہر حال تم لوگ محنت کرتے ہو تو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ میں اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ تم لوگوں کو حسب ضرورت دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ ہیں تم لوگوں ہی کے پیسے۔“ وہ رک گئے۔

اسد اور احد کے سر سے یہ ساری تمہید گزر رہی تھی۔ ان کے باپ نے اتنی طویل گفتگو اور وہ بھی الٹ لائینی پہلے تو کبھی نہیں کی تھی۔

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ابو۔ مجھے ہمیں نہیں سمجھ آ رہا۔ آپ پلیز۔“ وہ پیروٹ چھوڑ کر کرسی کے اگلے حصے پر جھک آئے وہ اپنے بیٹوں کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

”میں یہ چاہتا ہوں اسد سعید اور احد سعید۔ تم دونوں اپنی ماں کو فائنٹسلی سپورٹ کرو۔“

میں اس معاملے میں مشورے یا حکم دینے جیسی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ماں اور بچے کے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہوتا، کبھی بھی۔“

افضل سعید کی آواز پر سکون ندی سے مشابہ تھی۔ ”مگر میں تم لوگوں کو اطلاع دے سکتا ہوں۔ اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور۔ اور جبکہ تم دے بھی سکتے ہو تو۔ اس سے ملنا تعلق رکھنا آنا جانا تمہاری اپنی صوابدید پر ہے لیکن بس ایک ہی حکم یا شرط کہہ لو تمہاری اس موجودہ زندگی پر اس تعلق کو اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ کھڑے ہو گئے تمہارا فرض ہے کہ تم اس کی دیکھ رکھ کر دے۔ کرنی چاہیے بھی بٹنی سے معلومات لے لیتا، وہ مجھ پر کالونی کے علاقے میں کہیں رہتی ہے۔

مگر میری واحد شرط کو گم سے باندھ لیتا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ تم ہو۔“

اسد اور احد کے فق چہرے کچھ سمجھ نہیں پارے تھے۔ سالوں پہلے ان کے سینے میں گوشت پوست کے دل کی جگہ پتھر کے دل ٹرانس پلانٹ کر دیے گئے تھے۔ اور پتھر جذبہ کب رکھتا ہے۔

مگر دل جب ایک بار دھڑکنا شروع کر دے تو دھیرے دھیرے ہر جذبے سے آشنا ہو جاتا ہے۔ دیر ہی سے سکی۔

دھڑکن زندگی ہے اور زندگی کے سو پہلو۔ اپنی باری آنے پر سب سامنے آ جاتے ہیں۔

ایک احساس ندامت کسی مل سکون لینے نہیں

دے رہا تھا۔ مگر وہ خود اوہ اوہر مصروف رکھ کر ہر ناپسندیدہ چیز کو بھول جانا چاہتے تھے۔

دل کے کسی کونے میں کعبی خوشی نہیں ابھری تھی اسے ذلیل و خوار دیکھ کر وہ نشان عبرت بن کر آئی تھی۔

وہ بظاہر الفت کو بھول چکے تھے مگر دل کے اندر یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ وہ ایسی کیوں تھی۔ ضدی ہٹ دھرم اپنے آپ سے، صرف اور صرف اپنے آپ سے پیار کرنے والی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی ضد اور انا کے ہاتھوں دوسروں کو تو کیا نقصان پہنچا میں گے خود خسارے میں پڑ جاتے ہیں۔

وہ ایسی کیوں تھی۔ جب وہ بہت محبت اور لاڈ کے ساتھ ان کے ساتھ تھی۔ تب وہ سوچتے تھے اور کبھی کبھار لاڈ سے پوچھا بھی کرتے تھے۔

”میں تو بھی ایسی ہی ہوں۔“ وہ خریلے انداز سے منہ بنا کر شانے اچکا کاتی۔

وہ منتوں مراؤں کے بعد مانگی جانے والی اولاد تھی۔ مگر کیا ماں باپ کی تمام دعائیں بس اس کی دنیا میں آنے تک کے لیے تھیں۔ دنیا کی اچھائی اور آخرت کی بھلائی کے لیے کیا کبھی کوئی ہاتھ نہیں اٹھے تھے۔

وہ کس بے حس مٹی سے ڈھالی گئی تھی۔ اسے کبھی غلطی سے اولاد یاد نہ آئی یا اسے افضل سعید سے واقعی نفرت تھی۔ وہ کیسی ماں تھی۔ لیکن وہ اکمل کے سامنے اچھی ماں بن کر آئی تھی اس نے اپنے بچے کی بیماری کا کس فکر مندی سے بتایا تھا۔

اس نے کہا تھا۔ ”شوہر ملے گا تو بچے بھی مل جائیں گے۔“ اس کا دعوا سچا تھا۔

لیکن شوہر اوہ بچے تو پہلے بھی تھے اور کیا وہ واقعی افضل سعید کو اتنا زیادہ ناپسند کرتی تھی۔ وہ کیا تھی؟ کیسی تھی؟ کیوں تھی؟ اس کے ہر رویے نے ہر دفعہ افضل کو حیران و پریشان کیا تھا اور وہ کیسے آگئی تھی؟ یہ بے شری تھی یا ہٹ دھرمی۔ لاپرواہی بے نیازی۔ کیا تھا۔

افضل سعید اس ٹین کی چھت کو اور چھت فراہم



کرنے والے کو دونوں کو دیکھ آئے تھے۔ کیا تھا اس شخص میں۔ اس نے عدت گزارنے کے دو ماہ بعد خود ہی اس شخص سے عقد کر لیا تھا۔

وہ ایسی کیوں تھی۔ کوئی نفسیات دان ہوتا تو شاید تحلیل نفسی سے بتاتا۔ اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی۔

وہ ہٹ دھرم تھی ضدی۔ کیا افضل سعید اس قدر ناپسندیدہ تھے کہ وہ تمام عیش و آرام کو ٹھوکر مار چلی گئی۔ اس نے ان کے منہ پر جو تمارا تھا اور آج زمانے کی جوتیوں میں پڑی تھی۔

اس نے کبھی پلٹ کر اپنے ماں باپ کو بھی نہ دیکھا۔ اور آج کیسے ان ہی لوگوں سے مدد کی امید لیے آگئی تھی۔

کیا وہ جانتی تھی افضل سعید اسے کبھی انکار نہیں کر سکیں گے۔ وہ ان سب کے بارے میں کتنا اندر تک جانتی تھی۔ اس نے انہیں دیکھ کر اپنا نقاب نہیں گرایا تھا۔ ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں۔ وہ آنکھیں ملانے کے قابل نہیں تھی یا انہیں اس قابل نہیں سمجھتی تھی۔ وہ کیا تھی۔

اتنی ہی مغرور، بے حس وہ کسی بھی احسان کو اپنے اوپر احسان نہیں مانتی تھی۔ جو کچھ پہلے کیے گئے اس کی جوتی سے اور جو وہ لینا چاہتی تھی۔ دیتے ہو تو وہ نہیں تو نہ سہی۔ کسی اور سے تو مل ہی جائے گا۔

اکمل اور افضل نے تو اس واقعے سے عبرت حاصل کی تھی۔ توبہ کا ارادہ۔ شکر کے سجدے۔ کیا الفت نے بھی ایسی کوئی ایک کیفیت محسوس کی تھی؟

اگر کی تھی تو مقام شکر۔ اور اگر نہیں تو اس کا مطلب اللہ بھی اس سے خفا تھا۔

اظہر سعید کا گمان صحیح تھا۔ یہ افضل اور اکمل تھے۔ ان کے چہرے سیاٹ تھے۔ تمکنت نے چند ان کی آنکھوں میں کسی بھی جذبے کی تلاش کی اور جب ناکام ہوئی تو غیر محسوس طریقے سے اظہر کے چھپ سی گئی۔ اس کے ہاتھ کی تختی اظہر کو اپنے بازو بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دونوں ان دونوں کے سروں پر پہنچ گئے تھے۔ ”یہ کچھ بولتے کیوں نہیں۔“ تمکنت نے ڈرتے ڈرتے شانے کی اوٹ سے چہرہ نکالا افضل سعید اسی کو کھوج رہے تھے۔

وہ ایک دم آگے بڑھے۔ کیا وہ اسے نوچ کر اظہر سے دور کر دیں گے۔ تمکنت کے ناخن گوشت میں دھس گئے۔

لیکن اگلایل حیرانی کا تھا۔ افضل سعید نے اظہر کو بازو سے دیوچ کر اپنے سینے سے لگایا تو وہ جو پہلے ہی اظہر کے وجود میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ٹھسٹی ہوئی ان کے بازو کے گھیرے میں چلی گئی۔ افضل سعید نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر تھپتھپایا تھا۔

ایک ناقابل یقین احساس سے گھر کر اس نے ذرا سر اٹھا کر ان کا چہرہ کھوجنا چاہا۔ وہاں نرمی، سکون اور خوشی تھی اور آنکھوں میں جھلسا ہٹ سی۔ وہ کیوں بھلا۔؟

”دل موم کا دیا ہوتا ہے جل جل کر آنکھوں کے رستے پکھلتا ہے پھر ایسی روشنی۔ دنیا کو سجا دیتی ہے اور آخرت کو سنوار۔“



دو ٹکڑی

چار ماہ بعد انہوں نے عید پر آنے کی وجہ سے تعلقے میں کھلی کچہری لگائی۔
لوگ ان سے عید ملنے لگے۔ اپنے مسائل بتانے درخواستیں دینے لگے۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے، مسکراہٹ کو زبردستی ہونٹوں پر لائے۔ لوگوں سے مختلف کاموں کی درخواستیں اور سی ویز وصول کر کے اپنے میکر میٹری کو دیتے رہے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر طوطا چشم سیاست دان سیاست کی بولی ”حاضر حاضر“ کی رٹ لگاتا رہا۔ شام پڑے اپنے شہر کے بنگلے پر واپس آئے۔ اپنی ماں کے پاس ایک اور عرض گزار دیکھ کر

دو ٹکڑے کے لوگوں کو ذرا شعور نہیں، دروازہ بیوی کو میری برادری میں بٹھانے آیا ہے۔ کہیں جو پھٹ پڑے تو ساری گاڑی کا ستیا ناس۔“ اس کے منہ سے مدہوشی کے مشروب وجود سے اقتدار کی بے حسی کے جھکے اٹھنے لگے۔
غواہی خدمت گاروں نے ہمیشہ کی سرد مہری اور ڈھ رکھی ہے۔ کوئی احساس نہیں جو ان برف کی ریلوں کو پکھلا سکے۔

کے قابل کب تھے جس ان کو تو صرف ایک ایکشن کے دن ہی یاد کیا جاسکتا تھا۔

”سائیں! میری بیوی کو بچہ ہونے والا ہے۔ اسپتال صرف آدھے گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ کہیں کوئی گاڑی نہیں مل رہی۔“ اس نے کہتے ہوئے عاجزی سے ہاتھ باندھے۔ آپ عنایت کیجئے! اگر تھوڑی دیر کے لیے اپنی کوئی گاڑی دے دیں۔ تو میں اپنی بیوی کو اسپتال پہنچا سکوں۔“

نامیدی کی کیفیت میں اس نے آس بھری نگاہ سے گاڑیوں کی لمبی لائن کو دیکھتے ہوئے عرض کیا۔

اس کی بات سنتے ہی چہرے کے تناؤ میں اضافہ ہو گیا۔ پیشانی پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔ لب بھینچ کر چوکیدار کو غصے سے دیکھا۔

چوکیدار ان کی آنکھوں سے پیغام وصول کرتے ہی فوراً ”مستعد ہوا۔ اسے شانے سے پکڑا۔

”بے چل! برا آیا گاڑی لینے والا۔ شکل دیکھی ہے اپنی برادری میں بیٹھنے والی ہے؟“

”سائیں! خدا کے لیے رحم کریں۔ میری بیوی تڑپ تڑپ کر مرجائے گی۔ کسی چھوٹی سی گاڑی کا انتظام کر دیں۔“ انہوں نے سنی ان سنی کر کے اندر کی جانب قدم بڑھائے۔

”سائیں۔ سائیں۔ میں آپ کا وور۔ وور۔“
چوکیدار اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ دوسرا آنکھوں سے نگلی التجا نے اندر تک اس کا پیچھا کیا۔

رات آدھی سے زیادہ بیتی جاتی تھی۔ ہوانے خنکی کی چادر چہار سو پھیلا دی۔

بوجہ سردی موئے تن کھڑے ہوتے رہے۔ وہ علاقہ سے مسلسل جیتنے والے اسمبلی ممبر ڈیفنس کے ایک فلیٹ سے شراب اور شباب سے خمار آلود ہو کے اپنے بنگلے پر آئے۔

”سائیں! سائیں!“ ٹھٹھرتی سردی میں صرف شلوار، قمیص میں ملبوس مفلوک الحال اس کے پیچھے آیا۔

وہ ناگواری سے پلٹے۔
”سائیں! یہ آپ کی گاڑی کے پیچھے بھاگتا ہوا اندر داخل ہو گیا ہے۔“ اسے روکنے کے لیے پیچھے سے دوڑ کر آگے والے چوکیدار نے اپنے ناکرہ جرم کی وضاحت دی۔

”سائیں! میری بیوی مرجائے گی۔“
”کون ہو تم؟“ وزیر موصوف کی اکڑی پر تنفر گردن میں جنبش ہوئی۔

”سائیں! سائیں! آپ کا وور۔ ہمیشہ آپ کو ووٹ دیتا ہوں۔“ مفلوک الحال نے صدمے کی کیفیت میں اسے دیکھا۔ ”ابھی۔ ابھی پچھلے الیکشن میں بھی تو آپ ہی کو دیا ہے۔“ آواز جیسے اس اجنبیت پر فنا ہونے کو تھی۔

بڑے آدمی نے بھنویں سکیر کر اس اچھوت کو دیکھا۔ وہ اسے یاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھلا یا درکھنے



ابھی بے تحاشا غصہ آیا۔
ابھی ابھی تو بوری بندان دیکھی در خواستوں می ویز
کو دریا برد کرنے کا حکم دے کر آئے تھے۔
”بیٹا! یہ صبح سے بیٹھی ہوئی ہے۔ اپنی بیٹی کی
نوکری کے لیے آئی ہے۔“

وہ خاتون اسے دیکھ کر مڑب سی کھڑی ہو گئی۔
”سائیں۔ میری بیٹی نے ایم ایڈ میں فرسٹ
پوزیشن لی ہے۔ اسے کہیں ٹیچر لگادیں۔“
اس نے بڑی امید سے سی دی اسے تھمائی۔ انہوں
نے ماں کے سامنے ناچاری سی وی وصول کی ورنہ دل تو
چاہ رہا تھا کہ گالیاں بولے کر گھر سے نکال دیں۔
اور وہ جو سارا دن ان کی ماں کو اپنی غمت میں بھی بیٹی
کو پیٹ کاٹ کے، کروشیہ کاڑھ کے سلائی کر کے
پڑھانے کے قصے سناتی رہی تھی، خوشی خوشی رخصت
ہوئی کہ وزیر موصوف نے سی وی خود اس سے لی ہے
تو اب نوکری ضرور دیں گے۔

وہ سہلاتے سی وی لے کر اپنے کمرے میں آئے
ڈسٹ بن میں سی وی پھینک کے ٹائی کی
گرہ ڈھیل کی۔

”تھک گئے؟“ ان کی بیوی جو آئے دن پیرس
ممنڈن ڈی جائیداد خریدنے اور نئے اکاؤنٹ کھلوانے
جاتی رہتی تھی۔ جو ملکی معروف کمپنیوں اور بینکوں میں
شیئر ز خریدنے کی رسیا تھی نے اپنے کیونکس پر
پھونک مارتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ دو ٹکے کے لوگوں سے مغز ماری کرتے
سخت تھکاؤٹ و بوریٹ ہوئی۔ ہر کوئی کہتا ہے نوکری
وے دو۔ نوکریاں تو جامن کی طرح درختوں پر اگتی ہیں
ناں کہ سب کو تھماؤں۔ جاہل لوگوں کو کون
سمجھائے۔“

وہ نفرت سے بولے۔
”شاید وہ سمجھتے ہیں کہ آپ ان کے دوٹوں سے وزیر
بنے ہیں۔“ ان کی بیوی ہنسی۔

”دوسرے! دوٹوں سے وزیر بننا ہوں۔ ارے سب میرے
کا کھیل ہے۔ ان کے پاس ہو تو یہ جاہل گنوار لوگ بھی

الیکشن کا کھیل کھیلنے لگیں۔“ وزیر موصوف مونچھ
تلے استہزائیہ مسکرائے۔
غریب کا نصیب بھی گرمی جیسا ہی ہوتا ہے۔
کبھی خود ٹھنڈا ہوتا ہے نہ غریب کو ہونے دیتا ہے۔

کمدا ریمار ہو گیا تھا اور گنے کی فصل کو کھا دینا تو
لہذا سائیں سے ملنا ضروری تھا۔

خزاں رسیدہ درخت کے لنگڑے لو لے سائے میں
صبح سے ان کا ہاری بیٹھا اوٹھتا رہا۔ بے حسی کے بے
جھڑ جھڑ کر اس کے گردناپتے رہے نہ کسی نے کھانے
کو پوچھا نہ چائے کو۔ ان کی ماں نے باہر لان میں
ازلوں سے سر جھکائے بیٹھے اس ہاری کو دیکھا۔

”کیسویں صدی میں بھی طوق غلامی گردن میں
ڈالے یہ ابھی تک بیٹھا ہوا ہے۔“ وہ سوچتے سوچتے
ڈانٹنگ ٹیبل پر آ گئیں۔

”بیٹا! تمہارا ہاری (مزارعہ) تمہارے انتظار میں
بیٹھے بیٹھے سوکھ گیا ہے۔“

”اماں! ان لوگوں کو تو بالکل شعور نہیں کہ صبح میں
کسی کے ہاں نہیں جانا چاہیے۔ اب آپ خود ہی
سوچئے! میں ان دو ٹکے کے لوگوں کی خاطر اپنا سکھ
چین آرام خراب کر کے سویرے اٹھوں گا؟ ایڈٹ
جاہل بد تمیز لوگ۔“

”تمہاری ہی زمین کے لیے تم سے کھاؤ طلب
کرنے آیا ہے۔“ ان کی ماں کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج
در آیا۔

”اوہ! چار بج گئے مجھے ضروری میٹنگ میں جانا
ہے۔“ وہ غلت میں اٹھے ان کے سیکریٹری نے گاڑی
کا دروازہ کھولا۔

ہاری دوڑتا آیا۔ ”قبلہ سائیں۔ فصل سوکھ جائے
گی۔ اگر بروقت کھاؤ نہ ملی تو۔“

وہ ازلوں سے سر جھکائے ہاتھ باندھے عرض کر رہا
تھا۔ آج بھی کر رہا تھا۔ فصل سوکھ جاتی تو بھی بے قصور
ہوتے مصو وادہ ہی گروانا جاتا۔

ممبر اسمبلی نے ایک اچھتی سی نظر اس صدیوں
سے استہزاء غلام انسان پر ڈالی۔ بات کا جواب دینا
خلاف شان سمجھا۔ سیکریٹری سے مخاطب ہوئے۔
”تم جا کر زمین دیکھ کر جائزہ لے آؤ۔ زمین کو کتنی
کھا چاہیے۔ مل بنا کر بھیج دو۔“

گاڑی زن سے بیگلے سے باہر نکل گئی۔ وہ کلمہ شکر ادا
کر کے اس جنت نما جہنم سے باہر نکل آیا۔

”پتا نہیں کیوں ہمارے مقدروں پر ہمیشہ پت جھڑکا
موسم طاری رہتا ہے۔ گھنی چھاؤں ملتی ہی نہیں۔“

پیار کا موسم جو بن پر تھا۔ ہر طرف درختوں نے نئی
شادابی، تازگی اوڑھ رکھی تھی۔ امید کی نئی کونپلیں نمو
پذیر ہونے لگیں۔ اقتدار کی کھوکھلی جڑوں پر دوٹوں
کے بے آگے کا موسم آگیا۔

اسمبلی ممبر نے اپنے امریکا لٹ بیٹے کو عوامی لباس
میں ملبوس دیکھا تو خوشی سے باپچھیں کانٹوں کی لودوں کو
چھونے لگیں۔

برٹا تاریخی دن تھا آج کا۔ ان کی چوتھی نسل اقتدار
میں شامل ہو رہی تھی۔ ان کے دادا انگریز سرکار کے
زمانے میں پیرو کار باپ ہمیشہ سے کبھی کیبنٹ کا وزیر
کبھی سینئر تو بھی اسمبلی ممبر رہا۔

پھر اقتدار ان کی طرف منتقل ہوا۔ وہ تیس سالوں
سے ان واؤ بیچ کے ماہر کھلاڑی اب اپنے بیٹے کو
بلدیاتی الیکشن میں لارہے تھے۔ تاکہ ضلعی ناظم بن کر
مستقبل میں وزیر بننے کی تیاری کر لے۔ صدیوں پر مبنی
شہنشاہیت ملک کے عوام پر مسلط تھی۔

ان کے باڈی گارڈ نے پراڈ کا دروازہ کھولا۔
دونوں باپ بیٹے نے بلدیاتی الیکشن کی
کیمپین (مہم) شروع کر دی۔

چائے پانی کھانا سب میسر تھا۔ جو بھی آفس میں آتا
اس پر عزت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

دونوں باپ بیٹا خندہ پیشانی سے لوگوں کا استقبال
کرتے۔ سالوں سے وعدوں کی ایک لمبی زنجیر میں

ولا سوں کی اور کڑیاں ملا کر اس کی طوالت بڑھائی جارہی
تھی۔ طوالت ہر الیکشن میں بڑھتی چلی آرہی تھی۔
آہستہ آہستہ سارے لوگ اس زنجیر کے طول
و عرض میں زنجیر پا ہوتے گئے۔

ہزار دوٹوں کی بہار ختم ہونے پر وہ زنجیر زنگ آلود
ہو جاتی۔ اس پر جھوٹ کی کائی جم جاتی۔

یہ موسم بہار یعنی الیکشن کا ایک ماہ ان غریبوں اور
دوٹوں کے آدمیوں کا بے حد خوبصورت گزرتا۔ بڑے
بڑے سردار، عمیر، پیرو وڈیرے، سابقہ وزیر ایم این

اے ایم پی ایز ان دوٹوں کے آدمیوں کے پاس آتے۔
مدتوں سے التوا میں بڑی تعزیتوں کا قرضہ چکایا جاتا

۔ شادیوں کے لفافے ملتے جب بچے پیدا ہو چکے
ہوتے۔ گلے شکوے کرتے۔ دوٹوں کے آدمیوں کو لینے

کی بساند کے باوجود، لگایا جاتا۔ ان کے آگے معتبر
ہاتھ باندھے جاتے۔ منانے کے جتن کیے جاتے۔

ایک اور باری لینے کے لیے بے وقوف بنایا جاتا۔
الیکشن ان اشرافیہ کے لیے اولپک کے کھیلوں کی

طرح محض ایک کھیل ہی تو تھا۔ جہاں ہر کوئی اقتدار
کے تمنے جیتنے کے لیے میسے کی بازی لگاتا۔ جو جیت جاتا

ہمس کی بلے بلے۔ جو ہار تا وہ کمر سہلاتا، شراب میں غم
غلط کرتا رہتا۔ حیات کا تمنہ سجانے والا ہر طرح سے

کمالیتا۔ ہارس ٹریڈنگ ہو یا وزیر و مشیر بنے یا نوکریاں
بیچے۔ ان عوام کے غم بیچنے والوں کے دور میں اگر اللہ

کے کرم سے قدرتی آفات آجائیں تو وہ اور بغلیں
بجائے کہ اب مفت کمال بنانے کا موقع آیا۔

چار ہزار کاخیمہ آٹھ ہزار میں خرید اجائے گا۔
درکار راشن کی فہرست میں آوہا سامان بڑھا کر لکھا

جائے گا۔ کھاؤ کی بوریاں کروٹوں میں بیچی جائیں گی۔
غرض سیاست دان کے عیش ہی عیش

ہو جاتے۔ دو کروڑ الیکشن میں لگا کر دو ارب کمالیتے سودا
منگنا تھے۔ بس شرط یہ تھی کہ چکنی چھری باتوں سے

صرف بے وقوف بنانا آتا ہو۔
الیکشن کی بہار عروج پر تھی۔ کیمپین ختم ہوئی۔
صبح دوٹوں کے سارے آدمی جمع ہو کر اپنی بد قسمتی پر

ٹھہرے لگانے والے تھے۔
کیونکہ خوش قسمتی درمیانے طبقے کے لوگوں اور
غریبوں کے لیے ناپید تھی۔ یہ جواوہ کھیلے جس کی جیب
نوٹوں سے بھری ہو۔

جودال آنے کے بھاؤ میں ہی پھنسا ہوا وہ تو صرف
ٹھہرے لگانا جانتے ہیں، اپنی غربت و بد قسمتی اور دوٹکے کی
شناخت پر۔

ایکشن کی آخری رات پابندی کے بعد چوری چھپے
انتخابی مہم چلائی جا رہی تھی۔

ہر دوٹکے کے آدمی کے پاس عزت مآب ایم این
ایم وزیر موصوف بذات خود چل کر جا رہے تھے۔
کسی کو اسکول بنوانے کا آسرا، کسی کو نوکری کا جھوٹا
دلاس، کسی گاؤں کو گیس دینے کا عارضی وعدہ۔

یہ سارے دم دلا سے اس موسم بہار کے لیے تھے۔
ان دوٹکے کے آدمیوں نے ووٹ دینے کا وعدہ کیا
تھا، مگر پھر بھی وزیر موصوف ساری رات چل چل کر
لوگوں کو نیند سے اٹھا کر تجدید وعدہ لیتے رہے۔

اور آسروں کی بوسیدہ پیوند زدہ کٹھڑی انہیں تھما
تے رہے۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ اس کٹھڑی سے
ہیرے نہیں پتھر نکلیں گے۔ مگر وہ اپنی انہی تقدیر کے
آگے مجبور تھے۔

دونوں طرف کے امیدوار طبقہ اشرافیہ سے تعلق
رکھتے تھے، جن کے لیے وہ لوگ شجر ممنوعہ ہی تھے۔

اس آخری رات ان دوٹکے کے لوگوں کی قیمت کئی
گنا بڑھ گئی تھی۔ اس رات اگر دام لگانے والے
کروڑوں کے دام لگاتے تب بھی دوٹکے کے آدمی
ستے پڑتے۔ وہ لوگ اپنی قیمت سے واقف نہیں
تھے۔

تب ہی دوٹکے کے رہ گئے تھے۔ ان کو آگئی نہ
تھی۔ جس اشرافیہ نے نظام بنایا، اس نے ان کو جاہل
رکھنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ سو ان لوگوں کے
دروازے پر کھڑے وزیر صاحب بندہ عاجز بنے منتیں
کرتے رہے۔

اور اس دن خواتین کے پولنگ اسٹیشن پر اپنی بے

روزگار ایم ایڈ بیٹی کے ساتھ آگیا اس نے ہر سارے
نشانوں پر لگا کر ان پر کالک مل دی تھی۔

یہ اشارہ تھا کہ کوئی امیدوار اہل نہیں، سب نااہل
تھے، جو ایکشن میں غریبوں کو اور مقروض کر کے مفلور
ہو جاتے اس نے اپنا غصہ نکالا۔ اپنی غربت اور کم
حیثیتی کا بدلہ چکا دیا۔ یہ باور کرا دیا کہ ہم اپنی حیثیت
پہچان جائیں۔ تو اس کم حیثیتی سے چھٹکارا مل جائے۔

غربت کے باوجود ڈگریاں لینے والوں کے پاس
سفارش و رشوت نہ ہو تو ڈگریاں بے کار ہو جاتی ہیں۔
اس کی بیٹی بھی سلائی کرنے لگی۔ اپنی محنت کی روزی
ہی کمائی سے تو ووٹ ان کو کیوں دیں۔ اس سے بہتر ہے
کہ خارج کر دیں۔ جب تک کوئی اچھا اہل امیدوار
انتخاب میں حصہ نہ لے۔

اور اس صبح جب ایک اور دوٹکے کا آدمی ووٹ دینے
کے لیے اٹھا تو اس کی نیند پوری نہ تھی۔ کیونکہ وزیر
صاحب اور ان کے کارندے باری باری اس سے وعدہ
لینے آرہے تھے۔

ایک دن کے یہ بھکاری سالوں تک غریب عوام کو
بھکاری بننا رکھیں گے۔

کوئی آپشن نہ تھا۔ کوئی آدھا چور، کوئی پورا چور کوئی
کالا چور، کوئی سفید چور۔ تھے تو سب ہی چور، ان کی
خوشیوں کے خوشحالی کے اسے درد نہ میں مبتلا اپنی
بیوی یا دآئی، جس نے تڑپ تڑپ کر موت کو گلے لگایا
تھا۔

اس کے اندر دھواں بھر گیا، لاوا پھٹ پڑا تو اس نے
بیلٹ پیرز پھاڑ کر اس کے پرزے بیلٹ بکس میں ڈال
دیے۔ اور ٹھہر، مہراپنے منہ پر لگا لیا۔

کیونکہ دوٹکے کے آدمی ہونے کے ثبوت دینے کا
موقع اس سے بہتر نہیں ملے گا۔

دونوں صورتوں میں منہ پر سیاہی ہی ملنی تھی تو کیوں
نہ جو کل ملنی تھی وہ آج ہی مل لی جائے۔



دیرگدیت کا

مسز افتخار کے پوتے کے عقیقہ کی تقریب زوروں
تھی۔ ان کے علاقے کی کم و بیش تمام خواتین اس
محفل میں شامل تھیں۔ فارحہ بھی اپنی ساس مسز
فرحت زہیری کے ساتھ موجود تھی۔ مسز افتخار نے

تارک لٹے

نشست اور طعام کا انتظام لان میں ہی کر رکھا تھا۔
فارحہ اور اس کی ساس کے لیے یہ بات اطمینان بخش
تھی کہ یہ کمس گید رنگ نہیں تھی۔

فارحہ کی ساس فرحت آپا کے نام سے جانی جاتی
تھیں۔ سلیقہ اور قرینہ بے مثال تھا۔ متمول اور
خوشحال تھیں مگر زبان چٹنی روٹی کے ذائقے سے بھی
آشنا تھی۔ خوش قسمتی سے بہو بھی ہم مزاج تھی۔ تمام
خواتین کھانے سے فارغ ہو کر گروپس کی شکل میں
کرسیوں پر براجمان سبز چائے کا لطف اٹھا رہی تھیں۔
ملک صاحب کی بیگم ہر دو منٹ بعد سرد آہ بھرتیں اور
اپنی نم ہوتی آنکھوں کو نشو سے ہلکا سا رگڑ لیتیں۔ وہ
بہت چپ چپ سی ہو گئی تھیں۔ حالانکہ بڑی ہنسور
طبیعت کی تھیں، آج کل ان کے گھریلو مسائل نے
ان کے سارے وقتے اور برجستہ جملے ماضی کی جھولی
میں پھینک دیے تھے۔ بہت کم ہی وہ کسی خوش
رنگ محفل میں نظر آتی تھیں۔ آج بھی فارحہ اور اس
کی ساس فرحت آپا کے بے حد اصرار پر وہ ان کے ہمراہ
چلی آئی تھیں۔ سات ماہ ہو گئے تھے ان کے شوہر ظہیر
ملک کی وفات کو مگر ابھی تک وہ خود کو سنبھال نہیں پائی
تھیں اور سنبھالتیں بھی کیسے؟ ملک صاحب گئے تو
اپنے ہمراہ بیگم کی من مانی اور راجدھانی بھی لے گئے۔
سارا ٹھہکا اور طنطنہ پانی کا بلبل ثابت ہوا۔ کل کی آئی
ہونے سر کا کفن میلا ہونے سے بھی پہلے ساس کو
کونے سے لگایا اور پورے گھر کا انتظام اپنے ہاتھ میں
لے لیا۔ میسے کی حریص تھی۔ ملک صاحب کے مرنے



کے بعد ان کا بیٹا کاروبار کو صحیح سے سنبھال نہ سکا۔
نتیجتاً ”گھانا پڑا اور پہلے سی خوشحالی نہ رہی تو ساس کے
ہاتھ سے روپے پیسے کا حساب کتاب بھی لے لیا۔
وہ عورت جو خاوند کی زندگی میں ملکہ تھی، بہو اور
بیٹے کے ہاتھوں پیسے پیسے کو محتاج ہو گئی۔ یہ وہی بیٹا اور
بہوتے بچن کے نازیہ دونوں میاں بیوی اٹھاتے نہیں
تھکتے تھے۔ کبھی چوڑی شاہنمگز کروائی جارہی تھیں۔
کبھی ملک صاحب ہو بیٹے کو شمالی علاقہ جات کی طرف
روانہ کر دیتے کہ ذرا فریش ہو آئیں۔ تب یہی بہو تھی
”می جان“ اسی جان“ کہتے زبان نہ سوکھتی تھی ”اب
اپنے بچوں کو سکھاتی تھی کہ ”صرف دادی کہتے منہ ٹوٹتا
ہے؟ دادی جان کہنے میں ہی پون گھنٹہ ضرور لگانا
ہے۔“ ”واہ رے“ وقت کی چک پھیریاں۔ کب
کس کو کس رخ پر پٹختی دے جائے، کبھی سوچ بھی
نہیں سکتے۔

یہ تو مسز ملک کا دم غنیمت تھا جو ان کی سستی تھیں اور
جو صلہ دیتی تھیں مگر طبیعت میں یاسیت گھر کر چکی
تھی۔ بہو سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ کوئی ذرا سی چٹکی بھی
لیتا تو دنیا کی تمام بہوؤں کے نیچے ادھیڑ دیتی تھیں۔ اپنے
ذاتی تجربے کی بنا پر وہ ہر بہو کو غلط ہی سمجھنے لگی
تھیں۔ دولت کی بھوکی، حریص اور نفس پرست۔ اب
مسز ملک کے دائیں طرف جو خاتون بیٹھی تھیں۔
انہیں اس علاقے میں شفت ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے
تھے۔ وہ اپنی بڑی بہو کا ذکر لے بیٹھیں جس کا سلوک
ان میاں بیوی اور بانی گھر والوں سے بہت اچھا تھا اور
سب اس کے کن گاتے تھے۔ مسز ملک نے ان کی
بات سن کر نخوت سے سر جھکا اور دھیماسا ہنس دیں،
پھر بولیں۔

”سہلی بہن! آپ کو ایک مشورہ دوں۔ اپنی بہو سے
اتنی امیدیں مت لگائیے گا۔ نہیں تو بڑی ہزیمت اٹھانا
پڑے گی آپ کو۔ ابھی تو سال بھی نہیں بیتا آپ کے
بیٹے کی شادی کو۔ ذرا قدم جم لینے دیجیے اس کے پھر
دیکھیے گا وہ آپ کے قدموں کے نیچے سے زمین کیسے

پٹختی ہے۔“
مسز ملک بھڑاس نکال کر ہانپے لگی تھیں جبکہ وہ
خاتون ہکا بکا ان کی شکل تک رہی تھیں۔ تب ہی
فرحت آیا نے جھٹ سے صورت حال سنبھالی۔
”صل میں سہلی بہن! برامت مانے گا۔ آج کل
مسز ملک کو ان کے گھریلو مسائل نے کچھ پریشان کر
رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ تلخ ہو جاتی ہیں، مگر نہ ان
کی بات کا مطلب وہ نہیں ہے جو۔“
”کیوں۔ کیوں وہ مطلب نہیں ہے فرحت آپا!“
مسز ملک نے درمیان سے ہی فرحت آپا کی بات اچک
لی۔

”یہ بہوؤں کی خوش مزاجیاں صرف چار دن کی
چاندنی کی طرح ہوتی ہیں۔ اچھا بننے کا ڈھونگ کرتی
ہیں۔ جب تک ساس سر پیسے کی چمک دکھاتے
رہیں تب تک ان کی آنکھیں سرریلوں کی جھوٹی
محبت سے خیرہ ہوئی رہتی ہیں۔ جیسے ہی پیسہ ختم، تماشا
ختم! پھر ساس سر ریٹ پہ بیٹھے جو کیدار سے بھی کم تر
لگنے لگتے ہیں۔ تب یاد رہتی ہے ان بہوؤں کو تو بس
شوہر اور اس کی جیب کہ کیسے شوہر کے پیسے کو اس کے
بوڑھے اور ”فارغ المال“ ماں باپ سے بچانا ہے۔“

بات کرتے کرتے مسز ملک رو دی تھیں۔ فرحت
آپا نے ان کا دکھ دل سے محسوس کیا تھا مگر وہ دلا سے کے
علاوہ اور کیا دے سکتی تھیں، جب کہ فارحہ کو قطعاً
مسز ملک کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا۔ انہوں نے سب
بہوؤں کو ایک ہی لائن میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ بھی بہو
تھی۔ اس کی ساس کا بھی دل برا ہو سکتا تھا یہ سب
باتیں سن کر۔ اس کی سرال بھی خوشحال تھی مگر وہ
نہیں سمجھتی تھی کہ ان کے گھر کا بہترین ماحول صرف
پیسے کی دین ہے۔ فارحہ اور اس کی ساس کے بہترین
تعلقات کی بنیاد میں اس کی خوش مزاجی کا بھی عمل
داخل تھا۔ یہ اس کی مستحکم سوچ تھی۔

فارحہ نے ماحول کی کشیدگی محسوس کرتے ہوئے
فرحت آپا کو گھر جانے کا اشارہ دیا تھا۔ وہ فی الوقت جلد

سے جلد اپنی ساس کو مسز ملک کی ”پہنچ“ سے دور کرنا
چاہتی تھی۔ اس ساری گفتگو کو اس نے مسز ملک کی نیم
جہالت سے منسوب کیا تھا۔ اپنی نظر میں اس کی ساس
اچھی ساس اور وہ خود بہترین بہو تھی۔



سارے دن کی چہل پھل اور گہما گہمی کے بعد سب
گھر والے فارغ اور پرسکون ہو کر لان میں بیٹھے تھے۔
فارحہ مزید اسی کافی بنالائی تھی۔ اس کے شوہر رضا اور
ساس کو اس وقت کافی پینے کی عادت تھی۔ سو وہ دونوں
ساس بہو بھی ان کے ساتھ کی خاطر کافی بہ اکتفا کرتی
تھیں حالانکہ دونوں چائے کی باز حد شوقین تھیں۔

ساس، سرور شوہر کو کافی دینے کے بعد فارحہ اپنا
مک لے کر کین کی کرسی پہ پاؤں چڑھا کر بیٹھ گئی۔
دائیں ہاتھ میں مک پکڑے اور بائیں سے اپنے
سیدھے پیر کا پنجہ دباتے ہوئے وہ آج کے دن کی گہما
گہمی کو تفصیلاً ”اپنی ساس کے ساتھ ڈسکس کرنے
لگی۔“

فرحت آپا اور ان کے شوہر جلال صاحب نے
بھرپور سربراہی دیا تھا اپنے بیٹے اور بہو کو۔ پچھلے سال
جب دونوں میاں بیوی رنج کرنے گئے تھے تو وہیں دونوں
نے نیت کی تھی کہ ان شاء اللہ اگلے سال فارحہ اور
رضا کو حج پہ بھیجیں گے کیونکہ جلال صاحب کو احساس
تھا کہ برہمپے میں کیے گئے اور جوانی میں کیے گئے حج
میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مقبول ہونا یا نہ ہونا یہ
رب کے ہاتھ ہے۔ مگر انسان کو کوشش ضرور کرنی
چاہیے کہ اگر وہ صاحب استطاعت ہے تو جوانی میں ہی
اس فرض سے سبکدوش ہو جائے اور جلال صاحب
نے اس سال بہو بیٹے کو حج پہ بھیجنے کا مکمل انتظام کر لیا
تھا۔

جلال صاحب ایک ملٹی نیشنل فرم میں بہترین
منصب پر تھے۔ برسوں دیر تھے اس نوکری کو۔ تجربہ
کار اور وضع دار انسان تھے۔ حق حلال کی کمائی نے

خوش حالی بھی دی تھی۔ جبکہ رضا ابھی تک جم نہیں
سکا تھا۔ بار بار نوکری تبدیل کرنے کی وجہ سے ساکھ پہ
بھی اثر پڑا تھا۔ جس کی وجہ سے بڑی مشکل سے بیس
ہزار ماہانہ تنخواہ یہ نوکری لگی تھی، وہ بھی جلال صاحب
کے توسط سے۔ تنخواہ زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی مگر
تین بچے ان کی پڑھائی اور دیگر اخراجات ہیں ہزار
میں ممکن نہیں تھے، سو پورے گھر کے ستر فیصد
اخراجات جلال صاحب کی ہی ذمہ داری تھے۔ گھر کے

بل راشن، بچوں کی فیسیں وغیرہ کب کیسے اور کہاں
سے پوری — ہوتی ہیں، فارحہ کو کبھی فکر نہیں
ہوئی تھی۔ اس کے لیے اس کے ساس سر چھپر
چھاؤں تھے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رضا کی جیب
اس کی اور بچوں کی بے جا فرمائشیں پوری کرنے کی
سکت نہیں رکھتی۔ لہذا اتنیوں بیٹے جب بھی فرمائشوں
کی پٹاری کھولتے، فارحہ انہیں دادا جی کے پاس بھگا
دیتی اور دادا جی جیب کا منہ کھول دیتے۔ وہ صرف اپنے
پوتوں کے لیے نہیں، اپنے نواسے، نواسیوں کے لیے
بھی دیا لیتے تھے اور آج جو خوشی فارحہ اور رضا کو انہوں
نے دی تھی اس کا تو تصور بھی محال تھا۔ سب کو خبر
تھی۔ دونوں ننہیں بھی اس سربراہی میں برابر کی
شریک تھیں۔ ویسے بھی فارحہ کی دونوں سے خوب ہنسی
تھی۔ فارحہ کو بچوں کی طرف سے جو ذرا سی پریشانی تھی
بھی وہ اس کی دونوں ننہوں نے یہ کہہ کر دور کر دی
تھی کہ وہ دونوں بہنیں باری باری بچوں کی دیکھ بھال کی
خاطر یہاں رہیں گی۔ پھر دادا، دادی تو تھے ہی۔ فارحہ کی
امی بھی بہت خوش تھیں۔ ان کی بیٹی کو اتنی چھوٹی عمر
میں حج کا بلاوا آیا تھا، یہ معمولی بات نہیں تھی۔ لوگوں
کی عمریں بیت جاتی ہیں۔ آس لیے قبر میں اتر جاتے
ہیں مگر حج کی سعادت نصیب نہیں ہو پاتی۔ سو فارحہ یہ تو
سجدہ شکر لازم تھا۔ کافی کا خالی مک ٹرے میں رکھنے کے
بعد اس نے اٹھنے کا ارادہ کیا تاکہ عشاء پڑھ سکے، ساتھ
میں شکرانے کے نوافل بھی پڑھنے تھے۔
رضا اٹھ کر اندر جا چکے تھے جبکہ فرحت آپا کا اس

وقت تک لان میں بیٹھنے کا پروگرام تھا جب تک کہ جلال صاحب لان میں اپنی روزمرہ کی ہلکی پھلکی چل قدمی سے فارغ نہ ہو جاتے۔ یہ دونوں میاں بیوی کا روز کا معمول تھا۔ جلال صاحب لان میں چکر کاٹتے اور فرحت آپا کی نظریں ان کے قدموں کے چکر کاٹتیں۔

فارحہ بڑے تھامے ابھی برآمدے کی سیڑھیوں تک ہی پہنچی تھی کہ اسے اپنے پیچھے زوردار دھمک کے ساتھ فرحت آپا کی چیخ بھی سنائی دی۔ سرخ موڑنے سے پہلے فارحہ کے دماغ میں پہلا خوف اسی بات کا سرسرایا تھا کہ کوئی چور ڈاکو دیوار بھانڈ کر اندر آگیا ہے مگر مڑ کر دیکھنے پر اس کی خود کی چیخ نکل گئی تھی۔ جلال صاحب گھاس پہ گھرے بری طرح جھٹکے کھارے تھے۔ فرحت آپا بوکھلائی سی ان پہ جھکی چیخ رہی تھیں۔ یکدم صورتحال بدل گئی تھی۔ چند منٹ پہلے سب خوش باش اپنی کرسیوں پر براجمان تھے۔

فارحہ نے فوراً "خود پہ قابو پایا اور معاملہ منی سے کام لیتے ہوئے بدحواس ہونے کے بجائے رضا کو بلانے اندر بھاگی۔ جتنی دیر میں رضا اس کی آواز سنتا کمرے سے باہر نکلا وہ میل سے گاڑی کی چابیاں اتار چکی تھی۔ رضا کو چابیاں پکڑا کر مختصراً "جلال صاحب کے بارے میں بتا کر باہر بھاگا اور خود کمرے میں رضا کا بڑا لینے بھاگی۔

اگلے پندرہ منٹ میں جلال صاحب قریب ترین پرائیویٹ اسپتال میں آئی سی یو میں داخل تھے۔ انہیں فالج کا شدید دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹرز نے اگلے چوبیس گھنٹے خطرناک قرار دیے تھے۔ فارحہ نے نندوں کو اطلاع بھیجوا دی۔ خاندان بھر میں جس نے سنا بھاگا چلا آیا۔ پل میں پانسا ملٹ گیا تھا۔

فرحت آپا کی جان سولی پر تنگی تھی۔ رضا شدید پریشانی کے عالم میں ڈاکٹروں سے مشاورت میں مصروف۔ دونوں نندیں کبھی اسپتال ماں کے پاس ولا سے کے لیے تو کبھی گھر پہ اکیلی پریشانی سے یلکان ہوتی فارحہ کے پاس۔ عجب ہولناک صورتحال تھی۔

جلال صاحب ایسا ستون تھے جن پہ ان کے پورے گھر کی عمارت کھڑی تھی۔ بچوں کی جان بھی باپ میں تو بیوی کی توکل متاع ہی جلال صاحب تھے۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں جو کبھی بھی زندگی کے کسی موڑ پر بچوں پہ انحصار نہیں کرتی تھیں بلکہ اپنی ہر ضرورت ہریات ہر دکھ سکھ کا سناھی شوہر کو سمجھتی تھیں۔

ان کا روم روم خاوند کے لیے دعا گو تھا۔ شاید ان کی ہی طلب اتنی شدید تھی کہ اٹھارہ گھنٹے بعد جلال صاحب خطرے سے باہر نکل آئے۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کی جان تو بچ گئی تھی مگر دایاں حصہ بری طرح اثر انداز ہوا تھا۔ بولنے کی طاقت تقریباً ختم ہو گئی مگر سب کے لیے ان کا بچ جانا ہی نعمت تھا۔ اللہ نے جلال صاحب کی نہیں بلکہ سب گھروالوں کی سانسیں برہادی تھیں۔ رضا نے ایک اچھے اور فرماں بردار بیٹے کی طرح رات دن ایک کر دیے تھے بیٹیوں نے جس قدر ممکن تھا اسپتال اور گھر کی ذمہ داریوں میں ماں اور بھابھی کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ فرحت آپا کو فارحہ کی بھی فکر تھی۔ جس پہ پورے گھر کی ذمہ داری یکدم آن پڑی۔ وہ تو ہر کام پوچھ پوچھ کے کرنے کی عادی تھی کہیں اب یوں تن نہا کر فارحہ نے نہایت سلیقے سے اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالا تھا۔

جلال صاحب بارہ دن اسپتال میں رہے تھے اور ان کے گھر شفٹ ہونے تک فارحہ پورے گھر کا انتظام سنبھال چکی تھی۔ فرحت آپا بہت خوش ہوئی تھیں یہ سب دیکھ کر مگر انہوں نے محسوس کیا تھا کہ ان کی بیٹیاں کچھ خاموش سی ہیں۔ جلال صاحب کی عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا تھا اور اتنے رش میں وہ اپنی بیٹیوں سے ٹھیک سے بات نہیں کر پاتیں اور پھر وہ دونوں۔ جلد ہی چلی بھی گئیں کھانا کھائے بغیر۔

رات آٹھ بجے تک بہت مصروفیت رہی۔ اس کے بعد جلال صاحب دواؤں کے زیر اثر سو گئے تھے اور فرحت آپا تھکی ہوئی سی لاؤنج میں چلی آئیں۔ جہاں

پہلے سے ہی رضا اور فارحہ موجود تھے۔ ماحول میں کچھ چھینچاؤ سا تھا۔ بچے بھی موجود نہیں تھے۔ حالانکہ صبح سے دواؤں کے کمرے میں بیٹھے تھے مگر عصر کے بعد سے نظر نہیں آئے تھے۔ فرحت آپا وہیں ایک صوفے پہ بیٹھ گئیں جبکہ فارحہ چائے لانے کا کمرہ کرکچن میں جا چکی تھی۔ یہ تو انہیں محسوس ہو چکا تھا کہ دونوں میں کوئی ٹکراؤ ہو رہی تھی مگر حیرت اس بات پہ تھی کہ ان کے آنے پہ خاموشی کیوں ہو گئی تھی جبکہ اب سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ جب بھی رضا اور فارحہ میں بحث ہوتی تو فارحہ لازمی ساس کو بیچ میں لا بٹھاتی تھی اور پھر ایک اچھی ساس کی طرح فرحت آپا بھی فارحہ کی ہمنوا بن جاتی تھیں۔

نامعلوم وہ کیسی تبدیلی تھی جو انہیں اپنے گھر کے ماحول میں محسوس ہو رہی تھی۔ ان سے رپا نہ گیا تو وہ رضا سے پوچھ بیٹھیں۔ جواباً "رضا فارحہ پر تلخ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"امی! دماغ خراب ہو گیا ہے فارحہ کا۔ وہی درست کر رہا تھا۔"

"ہوا کیا ہے آخر؟ کچھ بتا بھی تو چلے۔ صبح سے مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔" فرحت آپا حیران پریشان سی کہہ بیٹھیں۔

"کچھ نہیں امی! اس کے باپ کا بل استعمال ہوتا ہے نا اس گھر میں اس لیے آگ لگی ہوئی ہے اسے۔" "رضا۔!" فرحت آپا تو اس کے لہجے پہ ہی حیران تھیں۔ لفظوں پہ غور تو بعد میں کرتیں۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں امی! یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ اس گھر کی ایک ایک چیز میرے ابو جی کی کمائی کی ہے۔ اسے کوئی بھی کیسے بھی استعمال کرے۔ اس کو کیوں موت پڑ رہی ہے؟"

رضا یکدم آواز تیز کر بیٹھا تھا جس کے نتیجے میں کچن میں یک پٹا گیا تھا اور چند لمحوں بعد فارحہ لاؤنج میں موجود تھی۔

"میرے باپ کا مال نہ ہو میرے شوہر کا تو ہے۔"

کل کو میرے بچوں کا بھی ہو گا۔ بے دریغ کیوں لٹایا جائے۔" یہ لہک لہک کے بولنے والی فارحہ تھی۔ فرحت آپا کو یقین کرنا پڑا۔

"فارحہ بچی! ہوا کیا ہے بتاؤ بھی تو؟ یہ سب کچھ ہمارے بچوں کا ہی ہے، تمہارا بھی ہے۔ پر پتا تو چلے آخر ہم نے اپنے مال میں سے کیا بے دریغ لٹا دیا۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی فرحت آپا تھوڑی سی تلخ ہو گئی تھیں جبکہ ان کی بات سن کر فارحہ جواب دینے کے بجائے واپس کچن کی طرف مڑ گئی تھی۔ یہ بھی کھلی بدتمیزی تھی۔ فرحت آپا نے سوالیہ نظروں سے رضا کو دیکھا تو وہ بولا۔

"امی! آج صبح ابو جی کے گھر شفٹ ہونے کی خوشی

میں آپ نے جو ہزاروں روپے صدقہ کیے ہیں وہ روپے خیر کی طرح فارحہ کے دل میں گڑ گئے ہیں۔ مجھ سے ابھی یہاں بیٹھی یہی بک بک کر رہی تھی کہ ایک تو ابو جی کے علاج کے پیچھے لاکھوں لگ گئے۔ پرائیویٹ اسپتال کی فیس دواؤں کا خرچ اور پھر اتنے دن کی دیکھ رکھ میں ہی ہمارے جج کے لیے اکٹھے کیے روپے برابر ہو گئے گوپر سے صدقے کی مد میں بھی ہزاروں لٹانے لازم ہیں کیا۔ یہ زہر اگلا ہے اس نے۔" رضا نے ہاتھ میں پکڑا بیوشن ڈریا۔

"اب بھی کیا میں غلط ناراض ہو رہا ہوں بتائیں ذرا۔ مجھے تو اس وقت ہی سے فارحہ فارحہ نہیں لگ رہی جس رات میں ابو جی کو اسپتال ایڈمٹ کروا کے گھر آیا تھا اور چیک بک سے ایک بڑی رقم کا چیک کاٹا تھا۔ اسی لمحے فارحہ اپنے اصل روپ میں آگئی تھی۔ آخر ہمارے جج کے لیے یہ رقم ابو جی نے ہی جوڑی تھی نا! آج ان ہی کی جان بچانے کے کام آگئی تو اسے حیا نہ آئی منع کرتے۔ یعنی میں جج کر آتا مگر باپ کو کندھا دینے کے بعد۔!"

رضا بے دم سائیکم آنسو بہانے لگا۔ اسی اثناء میں فارحہ تن فن کرتی کچن کی لائٹیں بند کر کے کمرے میں جا چکی تھی اور فرحت آپا۔ ان کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ شوہر کی زندگی بچ جانے کی خوشی کریں یا اپنی ہوس کے بدلے کا ماتم۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر رضا کے پاس آ بیٹھیں اور اس کا سر اپنی گود میں دھر لیا۔ ماں کا لمس پاتے ہی وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

”ای۔ آپ کو نہیں پتا۔ ان چند دنوں میں سب کچھ بدل گیا۔“ وہ روتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”میں تو پھر اس کا شوہر ہوں۔ اس نے تو توبہ اور سیرا کا بھی کا لحاظ نہیں کیا۔ آپ کو لگتا ہے آپ کی دونوں بیٹیاں اسپتال کے ساتھ ساتھ آپ کے گھر کا بھی خیال رکھ رہی تھیں؟“

رضانے ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پتا نہیں بتایا تھا یا پوچھا تھا مگر فرحت آپا کا دل ہری طرح دھڑکا تھا۔ خوف سے!

”کیا مطلب رضا! تم کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہاری بہنوں نے میری غیر موجودگی میں فارحہ کی اور گھر کی خبر گیری نہیں کی۔ کیا میں تمہاری بات کو شکایت سمجھوں؟“ فرحت آپانے دکھ سے بیٹھے سے استفسار کیا۔

”نہیں امی۔ بالکل نہیں۔“ رضانے بے چینی سے ماں کے ہاتھ تھامے۔

”میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ۔۔۔ بلکہ امی مجھے معاف کر دیجئے۔ میں اچھا بیٹا نہیں ہوں۔ میں نے آپ کی اور ابو جی کی چند دن کی غیر موجودگی میں ہی آپ کی بیٹیوں سے میکے کا مان چھین لیا۔ فارحہ نے انہیں لفظوں کی ایسی مار ماری کہ وہ پہلے دن سے ہی جو گئیں تو واپس نہیں پلٹیں اور میں کچھ نہیں کر سکا۔ مجھے معاف کر دیں امی! فارحہ نے اتنی باتیں کر دیں اور میری بہنوں نے دانت سے دانت نہیں اٹھایا۔ فارحہ نے انہیں کہا کہ ابو کی تنہا داری پہ ہی بڑا خرچ ہو گیا ہے اب مہمان داری پہ بھی کریں۔ اور میں کچھ نہیں کر سکا امی! مجھے توبہ نے قسم دی تھی کہ آپ کو کچھ نہ بتاؤں۔ ابو جی کی بیماری نے پہلے ہی آپ کو اتنی

تکلیف میں رکھا، مزید پریشان کرنا ٹھیک نہیں۔ میں بے بس ہو گیا امی۔ میرے علم میں ہونے کے باوجود میری بہنیں اپنے پیچھے اٹھائے واپس چلی گئیں اور۔ اور۔ لیکن امی! ان دنوں میں میں نے اللہ سے اپنے ماں باپ کی زندگی کی ڈھیروں دعائیں مانگی تھیں کیونکہ امی! آپ کے اور ابو جی کے چند دن کے لیے منظر سے ہٹ جانے پر فارحہ نے میری بہنوں کا میکے آنا بند کر دیا تو اللہ نہ کرے آپ دونوں کو کچھ ہو جائے تو۔ تو امی! میں کیا کر سکوں گا۔؟“

رضابے ربط بولے گیا اور جی بھر کر ماں کی گود میں رو لیا مگر فرحت آپا کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ آگے کے حالات ان کی نظروں کے سامنے تھے۔ شوہر بیمار ہو گئے تھے اور یہ بیماری کتنے ماہ تک محیط تھی اللہ جانتا تھا مگر وہ یہ ضرور جانتی تھیں کہ جلال صاحب کے بیمار ہونے کا

مطلب گھر کی آمدنی اور خوش حالی میں واضح فرق تھا جس نے ہر چیز پر اثر انداز ہونا تھا اور کل کی آبی ہونے، سر کے پیسے، ان ہی کی بیماری پہ خرچ ہونے پہ داویلا مچا دیا تھا۔ آگے جا کر تو گھر کے اخراجات کا زیادہ بار رضا کی ہی پسلیوں کو سہنا تھا اور رضا اب ان کا بیٹا بعد میں تھا، فارحہ کا شوہر پہلے تھا اور فارحہ کی آواز کی گھن گرج تو وہ سن ہی چکی تھیں۔ بس اب انہیں یقین کرنا تھا کہ یہ لاؤڈ اسپیکر انہی کے گھر کا ہے جو عنقریب ان کی رسوائی کا اعلان گھر گھر نشر کرے گا۔ رضا کی طرح وہ بھی بے بس تھیں بالکل بے بس۔

دن بے مزا اور راتیں بے کیف ہو چکی تھیں۔ وقت کو جیسے کسی نے جکڑ رکھا تھا۔ لمحہ لمحہ کاٹنا عذاب تھا۔ سارا دن گھر میں ابو بولتے تھے یا دو بوڑھے پنچھیوں کے ہنکارے سنائی دیتے تھے اور وہ تھے جلال صاحب اور فرحت آپا! فارحہ تو روئین کے کام نمٹا کر جو کمرے میں گھسی تو بچوں کی اسکول سے واپسی پہ ہی باہر نکلتی کھانا کھلاتی اور بچوں سمیت دوبارہ کمرے میں غروب

ہو جاتی۔ ساس مسرے کیا کھایا کب بنایا۔ اس سے اسے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ صرف ڈیڑھ ماہ پہلے کی ہی تو بات تھی۔ سب کچھ کس قدر خوبصورت تھا۔ جلال صاحب کی نوک جھونک، فرحت آپا کی جھٹیں، فارحہ اور رضا کی نگرار، بچوں کی شرارتوں کی ہمار، کب دن سے رات ہوتی، پتا بھی نہ چلا تھا۔ ان تمام خوبصورت لمحوں اور خوشیوں کو جیسے نظر کا کینسر چٹ گیا تھا۔ بیماری نے جلال صاحب کو ناکارہ کیا اور سو رانی نے ساس کو۔ رانی ملازمہ نے حق نمک ادا کیا جو تنگی کے باوجود چھوڑ کر نہ گئی بلکہ اپنے چار جوڑے لے کر ادھر ہی دن رات کے لیے آ گئی۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں۔ بھائی کے در پر تھی۔ بانجھ تھی اور طلاق یافتہ بھی کسی کو پوچھنا بھی نہیں تھا، سو جلال صاحب اور فرحت آپا کی خدمت میں جت گئی۔

فرحت آپا کو بہت آرام ملا تھا سیکنہ کی چوبیس گھنٹے کی موجودگی سے۔ جب سے فارحہ نے دوبدو جنگ کا اعلان کر کے نا طبقہ بند کیا تھا یہ سیکنہ ہی تھی جس کی مدد سے وہ جلال صاحب کی بیماری سنبھال رہی تھیں۔

جلال صاحب کالی چڑچڑے ہو گئے تھے۔ بول نہیں سکتے تھے مگر ہر چیز دیکھ رہے تھے اور سمجھ بھی گئے تھے۔ اذیت آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارتی دکھتی تھی۔ کیا رعب و دبدبہ تھا ان کا۔ ساری عمر فرحت آپا، جلال صاحب کے غصے سے خوف کھاتی رہی تھیں۔ بچے بھی باپ کے غصے سے دبتے تھے۔ سب کی دیکھا دیکھی فارحہ نے بھی کبھی تیز آواز میں بات کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اب اسی ہوس کے گستاخانہ کلمات اپنے کانوں سے سنتے تھے اور بے بسی سے سر ہنکتے تھے۔ حالانکہ فرحت آپا کی بھرپور کوشش ہوتی کہ ان کے کانوں تک کوئی آواز نہ پہنچے مگر فارحہ ایسی کوئی کوشش نہیں کرتی تھی۔

شاید اس کی دن رات کی تھکیک اور طبعی تشنہ ہی تھی، جن کی وجہ سے جلال صاحب بیماری سے مایوس

ہونے کے بجائے قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے بہتری کی جانب گامزن تھے مگر اس کے باوجود ابھی انہیں بہت وقت لگنا تھا۔ پہلے صرف غول غل کی آواز نکالتے تھے جبکہ اب پورے فقرے کا ایک لفظ کم از کم منہ سے نکل جاتا تھا۔ اپنے تینوں بوتوں کو دیکھ کر زیادہ شدت سے رد عمل سامنے آتا تھا۔ گوکہ فارحہ نے ان کے داوا، دادی کے کمرے میں زیادہ گھنے یہ پابندی لگا رکھی تھی مگر سالوں جن بچوں نے داوا دادی کی محبت کا شہد کھایا تھا، انہی سے دور رہنا ان بچوں کے لیے زہر تھا۔ بچے بھی وہ جو گود کے نہیں، بالترتیب چار، سات اور نو سال کے تھے اور جلال صاحب کا بڑا پوتا تو ہو ہو ان ہی کا عکس تھا۔ صاف گو اور صاف دل۔ ہاں زبان کا ابھی سے ہی ذرا تیز تھا مگر قابو میں بھی کر لیا جاتا تھا۔ اسی کو سب سے پہلے اعتراض ہوا تھا ماں کی پابندیوں پر اور اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ چند دن تک تو باپ کی شام میں واپسی کا انتظار کرتا، جیسے ہی رضا گھر آ جاتا، دونوں بھائیوں کا ہاتھ پکڑتا اور دادا، دادی کے کمرے میں گھس جاتا۔ وہیں کھانا کھاتا، باپ کو بھی زیر دستی لے آتا اور رضا کے سامنے فارحہ کو مجبور کرنا کہ سب ہی کا کھانا دادا کے کمرے میں لے آئیں۔ ہم سب یہیں کھائیں گے۔ رضا بھی بیٹے کی ہاں میں ہاں ملائے جاتا کیونکہ وہ کم از کم اس بات سے ناواقف تھا کہ فارحہ نے بچوں تک یہ پابندی عام کر رکھی ہے۔

فارحہ شوہر کے سامنے بے بس سی بیٹے کو گھورتی کھانے کے لوازمات لینے چل دیتی۔ چند دن تو جبر کے زہر پتی رہی مگر پھر اس صورت حال سے بچنے کے لیے بچوں کو کھلی چھٹی دے دی کہ چاہے تو رات کو بھی دادا، دادی کے کمرے میں سوئیں مگر روزانہ رات کے کھانے کا ٹٹانا ڈالیں۔ وہ بچن سے کمرے کی مسلسل ریڈ نہیں کر سکتی۔ جواب میں اپنے ہی بیٹے نے شرارت سے آنکھیں منکارتے ہوئے کندھے اچکا دیے تھے اور وہ محض کھول کے رہ گئی تھی۔ اس کے بچوں کا رویہ اس کی توقع کے برعکس تھا۔

جلال صاحب کی بیماری کے دنوں میں ہی اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے تینوں بیٹے داواؤں سے کس قدر بے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ ساس مسر کو آرام سے کوٹنے پہ لگائے گی کیونکہ جب سے رضائے گھر کیلئے اخراجات پورے کرنے کی خاطر پارٹ ٹائم جاب شروع کی تھی وہ صبح کا گیارہ گھنٹہ پر آٹھ بجے گھر آنے لگا تھا۔ جلال صاحب کی بیماری نے اسے بے حد حساس اور ذمہ دار بنادیا تھا مگر چونکہ سارا دن کی روٹین سے لاعلم رہتا اس کی مجبوری تھی اور فارحہ جانتی تھی کہ اس کی ساس منہ سے دھواں بھی نہ اٹکے گی۔ وہ فساد سے کوسوں دور بھاگتی تھیں مگر اپنے بچوں کے لیے وہ ایسا نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ تینوں ”نفساوی“ تھے۔ باپ کو پوری رپورٹ دیتے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ رضا کا دل مزید اس سے دور ہو پہلے ہی حالات نے ان کے درمیان کافی فاصلے بنا دیے تھے۔ کچھ ذمہ داریوں کے بوجھ نے بھی اسے بے حد حساس بنادیا تھا۔ رمضان شروع ہونے میں کچھ ہی دن رہ گئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ رقم جوڑ سکے، تاکہ رمضان کو بالکل اسی طرح اہتمام سے مناسکے جیسے جلال صاحب اور فرحت آپا کا چلن تھا۔ سحری، افطاری کے اہتمام کے علاوہ عید کی تیاری کے لیے بھی بڑی رقم چاہیے تھی۔ بہنوں کی عیدیاں، بچوں کے کپڑے، جوڑے، ماں، باپ کے لیے تحفے اور فارحہ کے لوازمات۔

وہ تو ابھی سے ہی جھکنے لگا تھا۔ پتا نہیں جلال صاحب اور فرحت آپا ہمیشہ اتنا اہتمام کیسے کر لیتے تھے؟ وہ کبھی تھکے کیوں نہیں؟ ان کی پیشانیاں اتنی شفاف کیسے تھیں کہ ان کے بچوں کو کبھی بھی فکر، دکھ یا پریشانی کی ہلکی سی سلوٹ بھی نظر نہ آتی۔ اولاد صرف اولاد کے لیے والدین اتنی خاک پھاٹکتے ہیں اور یہی سوچ اسے ٹوٹنے نہیں دیتی تھی کہ اب وہ اپنے والدین کو بالکل ویسے ہی حالات لوٹانے کی کوشش کرے گا۔ جیسے انہوں نے صحت مندی کے دور میں اپنی اولاد کو مہیا کیے۔ رضا کی سوچوں نے ایک بالکل

مختلف کروٹ لے لیا تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ اب اس کے تین نہیں پانچ بچے ہیں اور بے شک اسے اپنی اولاد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری تھی۔ فارحہ سے بھی زیادہ۔



رمضان جس خاموشی سے آیا اتنی ہی خاموشی سے گزرتا جا رہا تھا۔ رمضان کا مخصوص شور شرابا اور جوش مفقود تھا۔ صرف دو انسانوں کی جہاں دیدہ آنکھیں رب کے حضور آنسوؤں کی لمبی لمبی تسبیحیں پڑھتی تھیں یا پھر پریشانیاں کثیر سجدوں کی بدولت پر نور رہتی تھیں۔ ادھر فارحہ تھی کہ اس کے لیے شادی کے دس سالوں میں پہلا رمضان تھا جو بے تحاشا تھکن اور ہڑنگ لے کر آیا تھا۔ اب سے پہلے تو فرحت آپا کی بدولت کتنے ہی کام تھے جو مل بانٹ کر ہو جاتے تھے۔ ڈھیروں لوازمات بھی تیار ہوتے تھے، پھر بھی عبادت کے لیے معقول وقت ہاتھ آتا تھا لیکن اس دفعہ تو فارحہ بمشکل نماز پڑھ پاتی اور پھر سے کچن کی ٹینشن۔

اب بھی سیکھنا کاسا تھا۔ مگر کام تھے کہ نشتے ہی نہ تھے۔ صبح سحری کے لیے اٹھتی تو پھر ٹیک لگانا نصیب نہ ہوتا۔ محض دو گھنٹے بعد ہی تو بچوں کو اسکول کے لیے اٹھانا ہوتا تھا اور یہ دو گھنٹے سیکھنے کے ساتھ کچن سمیٹتے کہاں جاتے، سمجھ سے بالا تھا۔ پہلے فرحت آپا نے یہ ذمہ داری اٹھا رکھی تھی کہ فجر پڑھ کر وہ کچھ دیر کی نیند لے کر اٹھ جاتی تھیں اور پھر بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر کے روانہ کر دیتیں۔ پھر سبکی تھیں، آرام سے ہینڈل کر لیتی تھیں۔ بچوں کے جانے کے بعد تلاوت کرنے بیٹھ جاتیں اور پھر فارحہ کے لیے آرام کا بھرپور وقت فراہم کرتی تھیں مگر اب روپوں میں کیا تاؤ آیا، رشتوں میں بھی کھچاؤ آگیا تھا۔ کوئی بھی سی گھڑی ہوئی تو ہلکا سا پچھتاوے کا احساس فارحہ کے دل میں جاگتا ضرور تھا مگر اب اپنا پیچھے مڑ کر دیکھنے نہیں دیتی تھی۔

رمضان المبارک کا دسرا عشرہ شروع ہوا تو رضا

نے تمام کوششیں بروئے کار لیا کر فرحت آپا کو عید کے لیے مناسب رقم فراہم کر دی تھی۔ ایک شام رضا گھر آیا تو ماں، باپ کے کمرے میں ہی بیٹھا رہا اور وہیں پہ فرحت آپا کے ہاتھ پہ پیسے دھر دیے۔ اس وقت فارحہ اور بچے بھی وہیں موجود تھے اور رضا جان بوجھ کر فارحہ کی ضد میں اپنے ماں، باپ سے زیادہ التفات دیتا تھا۔ دونوں کے درمیان سرد جنگ کی سی کیفیت ہنوز قائم تھی۔ اپنی طرف سے تو وہ فارحہ کو چوٹ لگاتا تھا مگر اس بات سے بے خبر کہ اگلے دن فارحہ اس کے دفتر جانے کے بعد اپنی چوٹ لگانے کے لیے مرہم کا بخولی انتظام کر لیتی تھی۔ فرحت آپا کو خوب ذلیل کر کے۔

جلال صاحب کی بیماری کے بعد سے جب رضائے پہلے ماہ کی تنخواہ ماں کے ہاتھ پہ دھری تھی۔ تب بھی فارحہ نے اگلی صبح شوہر کی غیر موجودگی میں وہ تماشا لگایا تھا کہ فرحت آپا نے آئندہ کے لیے قسم کھالی تھی۔ سو اس دفعہ اس رقم کو بھی صبح رضا کے جانے کے بعد خاموشی سے انہیں فارحہ کے حوالے کر دینا تھا۔ دلوں میں زہر بھر جائے تو رشتے نیلے بڑ جاتے ہیں۔ ان ساس، بہو کا رشتہ بھی نیلا بڑ چکا تھا۔ مگر فرحت آپا، بیٹے کا بھرم ٹوٹنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ رضا جذباتی تھا۔ اس کا مان ٹوٹتا تو وہ فارحہ سے اپنا رشتہ توڑ دیتا۔ نتیجہ جھگڑتے تین معصوم بچے، زندگی کا کیا تھا۔ اس نے تو گزر ہی جانا تھا۔ رات کے پیچھے دن بھاگا چلا آتا اور ایسے ہی کسی دن کے اوپر رات اترتی اور ان کی زندگی میں آخری ثابت ہوتی۔ زندگی کا کیا ہے۔



آج بائیسواں روزہ تھا۔ آخری عشرہ شروع ہوتے ہی ”جلال ہاؤس“ کی رونقیں دیکھنے والی ہوئی تھیں۔ عبادتیں زور پکڑ لیتیں۔ ساری ساری رات قرآن پڑھا جاتا۔ عید کی تیاریاں ایک ولولے کے ساتھ شروع ہو جاتیں۔ کس کو کیا دینا، دلانا ہے، یہ سب کچھ دونوں

ساس، بہو بخولی چٹاتی تھیں۔ ملازموں کے جوتے، کپڑے تک بجٹ میں شامل ہوتے مگر اس دفعہ چونکہ فرحت آپا تمام رقم فارحہ کے ہاتھ میں تھا چکی تھیں۔ سو کسی بھی بات میں دخل انداز ہونے سے گریز کر رہی تھیں اور فارحہ کا تو دل کر رہا تھا، دیواروں سے سر نکرائے، کیونکہ اس پر یہ آشکار ہو چکا تھا کہ وہ کوئی اچھی منتظم نہیں تھی۔ عید بجٹ میں سے کچھ رقم بے کار کے کاموں میں اڑ بھی چکی تھی اور بقیہ پیسوں میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔

دل تو چاہتا تھا کہ لمبی تن کے سو جائے اور جب اٹھے تو عید گزر چکی ہو۔ سب کچھ متاثر ہو گیا تھا۔ ساس پہ رہ کر تاؤ آتا کہ صرف جلال صاحب کی سیوا کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں رہ گیا تھا۔ سیکھ نہ تھی تو وہ ان کی چمچی۔ رضا اور بچے گھر میں جب تک موجود ہوتے داواؤں کا دل بھلاتے رہتے۔ انکی تو وہ خود پڑ گئی تھی۔ نندوں سے بے حد دوستی تھی، پر ان کا کانٹا خود ہی کھینچ نکالا تھا۔

جب سے جلال صاحب بیمار ہوئے تھے۔ دونوں نندیں گن کر بھی تین دفعہ آئی ہوں گی۔ وہ بھی انکی، بغیر خاوند اور بچوں کے، تاکہ شوہروں کے آگے میکے کا بھرم نہ جائے۔ بھابھی کے تیور انہیں خوف زدہ کرتے تھے کہ میکے کی کمزوری سسرال والوں کے ہاتھ نہ لگے۔ فارحہ کی زبان بند رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے منہ نہ لگا جائے۔ دونوں جب بھی آتیں، سیدھی ماں، باپ کے کمرے میں چلی جاتیں اور وہیں سے واپسی۔ فارحہ سے اگر سامنا ہو بھی جاتا تو سلام لے کر منہ پھیر لیتیں۔

جواب میں جانتی تھیں، فارحہ بی بی کچھ نہیں پھوٹیں گی۔ ہاں! ہتھیوں میں جان اٹکتی تھی۔ جب سے جلال صاحب بیمار ہوئے تھے اور فارحہ نے ساس، سسر کا حقہ پانی بند کیا تھا۔ تب ہی سے فارحہ کا اپنے میکے کی طرف جانا ذرا کم کم ہی تھا۔ جس کی بڑی وجہ اس کے میکے والوں کا رویہ تھا۔ جب سے فارحہ نے فخریہ

اپنی ماں اور بہنوں کو بتایا تھا کہ اس نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ کیسے ایک جھگڑے میں ساس کے پیروں سے اس کی سلطنت کھینچ نکالی ہے۔ گھر کے تمام اخراجات کو اپنے کنٹرول میں لیا ہے۔ تب ہی سے اس کی ماں اور بہنیں اس سے سخت ٹاللاں تھیں اور فارحہ ان سے خفا۔ لو بھلا! کیسی ماں، بہن تھیں جنہیں اپنی بیٹی کے اختیارات پر اعتراض تھا۔ امی کو دکھ تھا کہ فارحہ نے ان کی تربیت کو کھوکھلا دیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ فارحہ کی ساس اس کے ساتھ بے حد اچھی ہیں، کوئی جنگی ترشی نہیں۔ رضا پیار کرنے والا شوہر ہے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ آمدن کم تھی اور گھر کا زیادہ بار جلال صاحب کی تنخواہ پر ہے مگر اس کے باوجود فارحہ کو پھپھولا بننے تو انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ یہی گلہ بھائی بہنوں کو بھی تھا۔

وہ بہنیں جو خود منہ سے اپنے لیے فارحہ جیسی سسرال مانگتی تھیں۔ وہ کیسے فارحہ کے اس اقدام کو سراہیں؟ اب جو بھی تھا وہ ایک بہت بڑا قدم اٹھا چکی تھی اپنی زندگی کا۔ اسے انتظار تو کرتا تھا گرو بیٹھنے کا۔ پھر سب اسی کا تو ہوتا۔ وہ رضا اور بچے، آہ! کتنا پیارا لگتا ہے بولنے میں۔ مگر فی الحال وہ اپنے محاذ پر بالکل اکیلی تھی۔

سیکنہ کو بچن سے آوازیں دیتی اور سر کو دوپٹے سے لپیٹتی وہ پچھلی طرف بنے کمروں کو چل دی۔ آج سے شروع کرے گی تو کچھ دن تک صفائیوں کا کام ختم ہوگا نا! وہ دل میں دنوں کا حساب کرتی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔

دروازے کے سامنے دیوار پر فل سائز کھڑکیاں تھیں جن پر گہرے رنگ کے موٹے پردے بڑے تھے۔ آج وہ بڑے دنوں کے بعد اس طرف کے کمروں کی صفائی کرنے آئی تھی۔ شاید اتنے ہی دن بعد جتنے دن اسے سب سے لا تعلق ہوئے ہو گئے تھے۔ کمرے میں سیلن کی بو اور عجیب طرح کی ٹھنڈی تھی۔ حالانکہ سردیوں کا موسم تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر ان کے پیٹ کھول دیے۔

نرم گرم دھوپ کے سنہری جھونکوں نے ایک دم کمرے کی فضا کو بدل کر رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ اچانک اس کا دھیان دائیں طرف سے آنے والی آوازوں سے بٹ گیا۔ اس نے خود کو بچاتے ہوئے ذرا سا جھانک کر دیکھا تو کم و بیش دس فٹ کے فاصلے پر ایک جانا پہچانا منظر اس کی نظروں کو جلا گیا۔ کبھی ایسے مناظر کا وہ خود بھی حصہ تھی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی محفلیں وہ خود سجاتی، سنوارتی تھی۔

پچھلی طرف جلال صاحب نے پھل دار درخت لگا رکھے تھے۔ بڑے سارے مچن میں مزے دار سی دھوپ تیر رہی تھی۔ وہیں مچن کے بیچوں بیچ تخت پر جلال صاحب گاؤں تکیوں کے سارے نیم دراز تھے۔ جبکہ فرحت آیا بڑی مشاقت سے ان کی دائیں ہانڈی کا مساج کر رہی تھیں۔ جلال صاحب کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ نہ صرف چند قدم چل لیتے تھے بلکہ ٹوٹے لفظوں میں بات کا مفہوم سمجھانے کے قابل بھی ہو گئے تھے اور اس بات کا سہرا ان کے پوتوں کے سر تھا۔ جتنی لگن سے وہ جلال صاحب سے باتیں کرتے تھے اور کندھے دباتے ہوئے انہیں بلوانے کی کوشش کرتے تھے وہ قابل تحسین تھا۔ اپنے اسکول کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر ماں کے ناز باروے کو بیان کرتے ہوئے خود کو تمام معاملے سے بری ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

اس وقت بھی فارحہ صاف دیکھ اور سن سکتی تھی کہ اس کا بڑا بیٹا، کس طرح اپنے چھوٹے مگر مضبوط ہاتھوں سے دادا کے کندھے دباتے ہوئے پٹر پٹر کیے جا رہا تھا۔ جبکہ دونوں چھوٹے بیٹے دادا جی کی چھڑی کے لیے جھگڑ رہے تھے۔ دونوں کو لانا ٹھیک کے چلنے کا شوق چرایا تھا آج کل۔ فارحہ کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ دل پتا نہیں کیوں خالی خالی سا محسوس ہوا۔ شاید پچھتاوا۔

نہیں پچھتانا نہیں! اتنی آسانی سے سب حاصل کر کے چھوڑنا حماقت اور ذالمت ہے۔ اس نے خود

کو ڈپٹے ہوئے واپس مڑنے کا قصد کیا ہی تھا کہ اس کی سماعت سے اپنے بیٹے کے منہ سے نکلنے ایسے کلمات نکلے جنہوں نے اس کی ہستی کے پرچے اڑا کر دیے تھے۔ وہ لاکھ سے خاک ہو گئی۔

اس کا وہ بیٹا جسے وہ محض نو سال کا ایسا بچہ گردانتی تھی، جسے وہ جب اور جیسے چاہتی تھی اپنے من پسند سانچے میں ڈھال لیتی۔ تھوڑا سا دادا اس کی سوچوں پر ڈالتی اور دادا، دادی سے اس کے جذباتی لگاؤ میں دائیں پڑ جاتیں۔ اس کا وہی سیانا سپوت دادا جی کے کندھے دبایا ہوا دادی سے بولا تھا۔

”دادی جی! آپ نے وہ پیسے ماما کو واپس کیوں کیے جو آپ کو پاپا نے عید کے لیے دیے تھے؟“ وہ بھنویں اچکا تا دادی سے سوال کر رہا تھا۔ جبکہ عید کے نام پر فارحہ کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”بس میرا بچہ!“ فرحت آیا جلال صاحب کو موزے پہنا رہی تھیں۔ ”میں سارا دن تو تمہارے دادا جی کے ساتھ مصروف رہتی ہوں۔ کہاں سے اتنا ٹائم لانی کہ شاپنگ بھگتا تی پھرتی۔“ فرحت آیا نے نرمی سے بات نبھائی۔

”نہیں دادی جی! غلط بات، آپ بچوں سے جھوٹ مت بولیں۔“ وہ دادا جی کے کندھے چھوڑ تخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا، پھر بولا۔

”میں جانتا ہوں دادی جی! ماما آپ سے لڑتی ہیں اور پیسے بھی لڑائی کی وجہ سے آپ نے انہیں دیے ہیں۔ میں پاپا کو اسی دن بتا دیتا اگر مجھے ان کی مینشن کا خیال نہ ہوتا۔ وہ اکثر ساری رات جاگتے ہیں دادی جی! میں نے دیکھا ہے انہیں۔ مگر میں نے سوچ لیا ہے دادی جی! اگر ماما نے مجھے آپ سے اور دادا جی سے دور کرنے کی کوشش کی تو میں پاپا کو کہہ کر بورڈنگ میں چلا جاؤں گا۔ مگر ماما کے پاس بھی نہیں رہوں گا۔ پاپا کہتے ہیں یہ گھر دادا جی کا ہے، ہر چیز دادا جی کے پیسوں کی ہے۔ پھر بھی ماما نے سب کچھ آپ سے چھین لیا ہے۔ جب میں پاپا کی طرح ڈھیر سارا کمانے لگوں گا تو آپ کو اور دادا جی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ماما پاپا کے پاس یہ دونوں

رہیں گے۔“

اس نے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرف اشارہ کیا جو دادا کی چھڑی چھوڑ کر سائیکل دوڑانے میں مصروف تھے۔ فرحت آیا کا منہ حیرت سے کھلا تھا اور جلال صاحب کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ شاید دکھ کا یا پھر خوشی کا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ حیران پوتے کی باتیں سن رہے تھے۔ یقین کرنا دشوار تھا کہ اتنا محم وادار اک اپنے نو سالہ بچپن میں سمجھ گئے ہوئے ہے۔ ان کی کیفیت سے بے خبر وہ اپنی ہی کسے جا رہا تھا۔

”دادا جی! میں نے عید سے کچھ دن پہلے ہم تینوں بھائیوں کے منی باکس کھولنے ہیں۔ ان میں سے جتنے پیسے نکلے گئے وہ میں آپ کو دوں گا۔ آپ دونوں پھپھو کے ہاں عیدی لے جاتی ہیں۔ ہم پھپھو اور چھوٹی پھپھو کو عیدی دے کر آئیں گے۔“ اس نے اپنا ارادہ بتایا۔

”بہت غلط بات ہے بیٹا!“ فرحت آیا پوتے کو گھورتے ہوئے بولیں، جبکہ آنکھیں اس کی محبت نے نرم کر دی تھیں اور جلال صاحب بھی مستقل نخر سے مسکرائے جا رہے تھے۔

”ماں سے چھپ کر کوئی بھی کام نہیں کرتے۔ وہ ماما ہیں آپ کی۔ آپ سے پیار کرتی ہیں اور انہوں نے کچھ نہیں چھینا ہم سے۔ سب آپ ہی لوگوں کا تو ہے بیٹا! ہم تو بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اتنے پیسے سنبھال نہیں پاتے، اس لیے تمہاری ماما کو دے دیتے ہیں۔ ماں باپ کے لیے غلط نہیں سوچتے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے اور صاحب زادے! اپنے پیسے کو سنبھال کر رکھو۔ سمجھو! زیادہ ہو سیر مت بنو۔ آج مجھے پتا چل رہا ہے کہ میرے پوتے کے پیٹ میں داڑھی ہے۔“ ان کا کام تو سمجھانا تھا۔ یہ سب ان ہی کے بچے تھے۔ وہ ایک کو دوسرے کے خلاف کیسے ہوتا دیکھ سکتی تھیں۔

”اچھا جاؤ ذرا! بچن میں دیکھو کوئی ہے تو نہیں۔ میں ذرا تمہارے دادا جی کے لیے نیچنی بتالوں، جاؤ شاباش۔“ انہوں نے پوتے کو وہاں سے اٹھایا۔ مگر وہ جاتے جاتے بھی انہیں لقمہ دے گیا۔

”دیکھا! آپ ماما کے ہوتے ہوئے کچن میں نہیں جاتیں بہادر بنیں دادی جی! بہادر!“

فرحت آپا نے افسردگی سے سر جھکالیا۔ جبکہ کھڑکی سے ذرا ہٹ کے کھڑی فارحہ پتھر کی ہو چکی تھی۔ اس کے تمام اعضا جیسے جم سے گئے تھے۔ بے جان ہوتے ہاتھوں سے اس نے اپنے پیٹ کو جکڑا جس میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ وہ بتا نہیں کیسے اپنے کمرے تک آئی۔ اور بیڈ کے ساتھ کمر ٹیک کر نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ یہ کیا ہو گیا؟ چالاکی اور بے حسی کا اٹھتا متعفن دھواں اس کے بچوں کو اس سے بہت دور لے گیا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو ان سے تو دور نہ کر سکی، پر خود کو سب سے دور کر لیا، رضا سمیت۔

”نہیں! بالکل بھی نہیں! ایسا کیا ہو گیا جو رضا مجھ سے دور ہوں۔ چار دن کی سرد مہری کوئی ساری عمر پر محیط کیسے کر سکتا ہے؟ کچھ دن محض کچھ دن کی بات ہے۔ بس میں اپنے اور رضا کے تعلقات کو پرانی ڈگری لے آؤں گی اس نے ایک دفعہ پھر اپنے اندر کی آواز کو ٹپٹ کر امید کا دامن تھاما۔

اس کا ضمیر اس پہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اسے پاگل کہہ رہا تھا۔

”یاد رکھنا فارحہ بی بی! تمہارے ساس، سر تمہارا حال ہیں۔ اس حال میں تمہیں ہر حال میں جینا ہے۔ اپنے حال سے نباہ کر لو۔ تمہارا مستقبل، تمہارے بچے، تمہیں نباہ لیں گے۔ ورنہ سوچ لو! بول بورہی ہو، کانٹے تمہارے ریشے ریشے کو زخمی کر دیں گے۔ اپنے بچوں کو بچاؤ تمہارے بچے تمہارے تین قیمتی رتن۔ تمہارے ہاتھوں سے پھسل کر وقت کے صحرا میں گم ہو جائیں گے۔ اپنے بچوں کو بچاؤ۔ خود کو بچاؤ۔“

وہ پسینے پسینے ہو گئی تھی۔ کوئی کانٹوں بھری جھاڑی تھی جس کی مارنے اس کا پور پور چھلنی کر دیا تھا، ضمیر کا چابک شاید ایسا ہی زوردار ہوتا ہے۔

فارحہ نے تھک کر سر جھکالیا۔ اس کے چہرے پر گرتے آنسو اس کے ہارنے کی دلیل تھے۔ وہ ہار گئی

تھی۔ وہ اپنے بچوں کے ہاتھوں ہاری تھی۔ ساری دنیا اس سے چھوٹ جاتی، اسے پروا نہیں تھی۔ بروہ نیچے جن میں اس کی جان تھی۔ انہیں کس دل سے گنواؤں۔ اس کے کانوں میں اپنی ماں کے کہے بول گونج اٹھے۔

”ظالم مت بن فارحہ! اپنی ساس کا اکلوتا بیٹا اس سے دور کر کے یہ گمان مت کرنا کہ تم نے تین بیٹے پیدا کیے ہیں۔ ایک نہ رکھے گا، دوسرا نہ رکھے گا، تیسرا تو ہے ہی! کبھی گھبراؤں بیٹے بھی ایک ماں نہیں سنبھال پاتے۔ مت اپنے پرسکون آشیانے کو چنگاری دکھا۔“

ماں کی تنبیہ آج بھی اکثر اس کے حواسوں کو جھنجھاتی تھی۔

”آیا! تم ناشکری ہو۔ ہم تو اپنے لیے تمہارے جیسی سسرال کی دعا کرتے ہیں لیکن تم تو ٹھنڈے دودھ کو پھونک لیں مار رہی ہو۔“ اس کی بہنوں نے بھی اسے کتنا سمجھایا تھا۔ بتا نہیں وہ خود کو عقل کل کیوں سمجھ بیٹھی تھی۔

کیوں میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔ میں نے کیوں سسر ملک کی کسی بات سچ ثابت کر دی۔ سچ ہی تو کہا تھا انہوں نے۔ ”بہوتب تک خوش رہتی ہے جب تک گھر میں ریل پیل ہو۔ ذرا تنگی ہوئی نہیں، بہو کا ظرف تنگ پڑ جاتا ہے۔“ اور اس نے سوچا تھا کہ وہ ایسی بہو نہیں۔ دس سال جس سر کی کمائی سے بے تحاشا کھایا، اس کے آگے دس گھنٹے بھی زبان کا بھرم نہ رکھ سکی۔ اس کی آنکھوں کے آگے رہ نہ کر وہ منظر گھوم رہا تھا، جب اس نے اکڑ کر ہتھیلی فرحت آپا کے آگے کی تھی۔ جس میں رضا کے تھوڑی ویر پہلے تھمائے وہ نوٹ دے تھے جن کو وہ گھر کے خرچے کے لیے دے کر دفتر نکل گیا تھا اور اس صلح جو عورت نے پل بھی نہ لگایا تھا اور پورے وقار اور تمکنت سے اپنی گریہ سستی اس کی ہتھیلی پر دھر دی تھی۔

یہ وہی عورت تھی جو ہر تہوار پر جی بھر کر فارحہ پر خرچ کرتی تھی۔ صرف یہی نہیں، اس کے میکے میں بیٹھی اس کی چھوٹی بہنوں کو ہر عید، تہوار پر عیدی کے

نقد یا ڈھیر سا پھل فروٹ بھیجتا جیسے فرض تھا۔ تبھی فارحہ کو کہہ دیتیں اور وہ بہنوں کے جوڑے بنا لیتی۔ آج اسی عورت کی بیٹیوں اور اپنی منڈوں کے لیے اس کے پاس ٹکا نہیں تھا۔ وہ انہیں چائے کا ایک کپ پلانے کی روداد نہیں رہی تھی۔ اسے چنداں فکر نہیں تھی کہ اس کی ساس اپنی بیٹیوں کو عیدی کیسے بھجوائیں گی۔ کیا بھائی ہونے کے ناتے رضا کا فرض نہیں تھا کہ بہنوں کو کچھ دے؟ پر اس نے کسی کو کچھ کرنے کے قابل رہنے کب دیا تھا۔

عصر کی نماز پڑھ کر اس نے اپنے لیے دعا مانگی۔ رب سے معافی طلب کی اور حوصلہ جوڑتی باہر نکل آئی۔ بیٹیوں نے فرحت آپا کے کمرے میں جلال صاحب کے ساتھ ان ہی کے بستر میں گھسے سو رہے تھے۔ اسے ملاں سا ہوا کہ وہ اتنی دیر سے کمرے میں بند تھی تو کیا کسی نئے کپڑوں کی ہڑک نہیں ہوئی۔ کسی نے اس کی خبر لینے کی کوشش نہیں کی۔ ساس پر تو اس کے اپنے رویے نے بند لگا دیے تھے مگر نیچے؟ وہ دبے پاؤں کو ریڈور سے گزرتی باہر لان کی طرف نکل آئی۔ لان میں پتھی کری پر فرحت آپا کو دیکھ کر اسے ایک دفعہ پھر ڈھیروں روٹا آیا۔ کتنا سکون تھا ان کے چہرے پر، کس قدر جذب کے ساتھ وہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ کبھی وہ بھی ان کے ساتھ والی کرسی پر براجمان رمضان کی برکتیں سمیٹتی تھی۔ دونوں بیٹھے بیٹھے کتنے سارے ختم کرتی تھیں۔ پھر افطاری کی تیاری کے لیے کچن کی راہ لیتی تھیں۔

وہ دو قدم اور آگے بڑھی۔ اس نے آہستہ سے اپنے بازو اٹھائے اور نرمی سے فرحت آپا کی گردن کے گرد حائل کر دیے اور وہ بری طرح سسک اٹھی۔ فرحت آپا نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی پرسکون مسکراہٹ اور آنکھوں میں شکرانے کے آنسو چمک اٹھے۔ وہ دیکھے بغیر جانتی تھیں کہ ان کے گرد محبت سے لپٹے بازو فارحہ کے ہیں۔ وہ اس کے ہر ارادہ سے واقف تھیں۔ دس سال کا ساتھ تھا۔

بیٹیوں سے بڑھ کر چاہ کی تھی۔ ماں والا مان دیا تھا اور ماں اپنی اولاد کی ہر ادا کو پہچانتی ہے۔ وہ پشیمان تھی۔ انہیں خبر تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خانا بے معنی تھا اور ابھی پلوں کے نیچے بہت سا پانی تھا۔ بات گھر کی چار دیواری کے اندر ہی تھی۔

وہ محبت سے اس کے ہاتھ سہلائے جا رہی تھیں۔ انہوں نے قرآن پاک آگے پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔ جب وہ خوب رو چکی تو اسے پیار سے کھینچ کر اپنے سامنے کیا۔ فارحہ وہیں گھاس پر گھٹنے موڑ کر بیٹھ گئی اور سر فرحت آپا کی گود میں دھروا دیا۔ وہ ایک دفعہ پھر اپنی ساس کے ظرف کی وسعت کی قائل ہو گئی۔ انہوں نے فارحہ کا ہاتھ چوما اور کہا۔

”چلو اندر! رضا آتا ہو گا۔ افطار کا وقت قریب ہے۔ مل کر تیاری کرتے ہیں۔ میں اور تم تم اور میں۔“

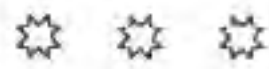
وہ یوں بولیں جیسے دو سہیلیاں آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔ فارحہ ان کے انداز پر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ارد گرد کھڑے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آتی میٹھی میٹھی ہوا نے رمضان کی برکتوں اور رحمتوں کی ٹھنڈی پھوار برسا دی۔

حالات کی کشتی جس تیزی سے الٹی تھی، اتنی ہی تیزی سے سیدھی ہو کر وقت کی موجوں پہ سبک رفتاری سے رواں دواں ہو گئی۔ برقت تدبیر کرنے سے بہت سا نقصان ہونے سے بچ گیا تھا۔ فارحہ نے دونوں منڈوں کو فون کر کے سٹائیسوس روزے کی افطاری کی دعوت دی تھی۔

جلال صاحب کے پاس بیٹھی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگایا اور رو دی۔ جلال صاحب جو کہ پہلے سے کافی صاف اور بہتر گفتگو کرنے لگے تھے۔ انہوں نے فارحہ کے سر پر ہاتھ دھر کر محض اتنا کہا۔

”بیٹا! مجھے نوکری پر تو لوٹنا تھا تم میرے صحیح ہونے کا انتظار تو کرتیں۔ ذرا سہی تو کرنا تھا۔“

اور فارحہ کی شرمندگی کے مارے رگیں کھینچ گئی تھیں۔ کیا وقت کبھی واپس نہیں آتا مگر حال میں رہتے ہوئے انسان بہتر مستقبل کشید کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے۔



ایک دفعہ پھر پرانا منظر تھا۔ وہی ہلا گلا، وہی رونقیں، ٹی وی لاؤنج کی سینٹرل ٹیبل پر رنگ برنگے خوب صورت کاندوں میں لپٹے بڑے بڑے پکٹ دھرے تھے۔ نیچے فرش پر پھلوں اور مٹھائیوں کی ٹوکریاں تھیں۔

آج انتیسواں روزہ تھا۔ امید تھی کہ چاند نظر آجائے گا۔ اگر کل عید ہو جاتی تو بہت سے کام ادھورے رہ جاتے تھے ابھی دونوں مندوں کو عیدی بھی پہنچانی تھی۔

دوپکٹ اس کے مکے پہنچنے تھے بچوں کی اور اپنی کچھ عید کی تیاری باقی تھی پھر واپس اگر صبح کے لیے لمبی چوڑی تیاری تھی۔ اس لیے اس وقت فرحت آیا اور فارحہ شدید مصروف تھیں۔ ڈائمنگ ٹیبل پر بچوں اور رضائے مل کر طوفان کھڑا کیا ہوا تھا۔ افطاری کی تیاری آج مصروفیت کی وجہ سے بروقت نہیں ہو سکی تھی اور روزہ کھل چکا تھا۔ سو فارحہ کا ایک پاؤں کچن میں اور ایک ڈائمنگ روم میں تھا۔ اوپر سے رضا اور بچوں کا ہنگامہ۔ کبھی کوئی چیز چاہیے ہوتی اور کبھی کوئی۔ کسی کو دودھ سوڈا چاہیے تھا۔ کسی کو کولڈ ڈرنک۔

فارحہ جانتی تھی کہ باپ بیٹے اسے جان کر نہیج کر رہے ہیں۔ پر وہ چڑ نہیں رہی تھی۔ کیونکہ اسے اپنے بچوں کی ماما، ماما کی پکار اور رضا کی فارحہ کی آوازیں کسی سریلے اور کیف اور گیت سے کم محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔

وہ ٹیبل پہ مطلوبہ چیزیں رکھ کر واپس کچن میں گئی اور ٹرے میں جلال صاحب کے لیے افطاری کا مزید کچھ

سلمان سجایا اور ان کے کمرے کا رخ کیا۔ جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے فرحت آیا، جلال صاحب کے لیے کھجوریں، چکن سوپ اور چاٹ کا باؤل لے کر گئی تھیں اور اب ان کے جلال صاحب سے الجھنے کی آوازیں دیوازے سے باہر کھڑی فارحہ کو بخولی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مسکراتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر چلی آئی، جہاں فرحت آیا، جلال صاحب کو سوپ پلائے کی کوشش میں تھیں۔ اور جلال صاحب فل ٹرے کے موڈ میں۔

وہ چھتری کے سہارے تھوڑا تھوڑا چلنے لگے تھے مگر پھر بھی فرحت آیا کے اصرار کے باوجود باہر ٹیبل پہ چل کر افطاری نہیں کرتے تھے۔

”وکیہ لو فارحہ! اپنے سر کو۔“ انہوں نے سائیڈ ٹیبل پہ ٹرے رکھتی فارحہ کو مخاطب کیا۔ ”اب اس عمر میں مجھے تو لگتا ہے جیسے میں نئے سرے سے بچہ پال رہی ہوں۔ نخرے ہی ختم نہیں ہوتے جناب کے۔“

فرحت آیا نے نرمی سے جلال صاحب کی داڑھی پہ لگے سوپ کو شوپیر سے صاف کیا۔

”کوئی بات نہیں ای! آپ کے پلے پلائے بیٹے کو بھی مجھے نئے سرے سے پالنا پڑ رہا ہے۔ آوازیں سن رہی ہیں آپ؟ اتنا آپ کے پوتے شور نہیں کرتے جتنا رضا۔“ فارحہ کے جواب پر جلال صاحب اور فرحت آیا کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ہنستی ہوئی فارحہ کی فرحت آیا نے دل ہی دل میں بلائیں لیں۔

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے فارحہ کی نظر کوریڈر سے دیکھتے لان پر پڑی، جہاں درخت جھوم جھوم کر آسمانوں سے اترتی انمول خوشیوں اور رحمتوں کا استقبال کر رہے تھے۔ فارحہ نے دل سے اپنے ”مستقبل“ کی ان خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کی اور آنکھوں سے شکر کے آنسو چنتی سامنے ڈائمنگ ٹیبل پہ بیٹھے اپنے ”حال“ کی طرف چل دی۔



سہ ماہ

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے، جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں روالا اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت نجی جنم مٹی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کا دن رات نوکری کی چلی میں تپے گزر رہا ہے۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت لی ان کی حراست میں ہے، جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگ بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت ٹیڑھ فرینڈ کی مریض ہے۔ جس کی شادی ابھی ہوئی تھیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

تینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے وانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت وانیال ملنسار اور مجتبی خاتون ہیں۔ ولی چولید اور ایینا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں ایینا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیبہ العباس طبعاً "سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے" جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔



پچھلی زاو تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہ تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے۔ سبیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہ تنوی کا منگیتر ہے وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہنگ آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی۔

ثروت دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر مکے چلی جاتی ہیں۔ انبیا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہ العباس ماوی کے رشتے وارتے اور یہ کہ ماوی کے باپ رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شبیہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایک سیڈنٹ ہوتا ہے تو بے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر بے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا بے بغیر چلا جاتا ہے جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی بے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہ کو بے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں، بس پر وہ بے ڈی کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔

انبیاء دل بڑا دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دین رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پر زون کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سنا تا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہنگ آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر مکے چلی جاتی ہیں۔ انبیا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہ العباس ماوی کے رشتے وارتے اور یہ کہ ماوی کے باپ رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو زہنی معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایبیمبسی حرکت میں آجائے گی۔ ثمینہ نے ماوی سے کہا کہ وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جاسکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہرہ سے شادی کر سکے۔ شہرہ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی۔ ماوی بالآخر ثمینہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھٹی اور دیگر لوگوں نے ماوی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور ثمینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ماوی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ماوی کا دشمن ہو گیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ماوی سے بات کرنے سے منع کر دیا۔ ماوی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھٹی سے اس کی شکایت کر دی۔ انہوں نے ماوی کے سامنے شبیہ العباس کو ڈانٹا۔

فیضان ملک میں واپس آگئے۔ وہ سیدھے ثمینہ کی انیکسی پنچے۔ انبیا نے انیکسی کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ مگر ثمینہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔

ماوی کو حویلی کے ایک حصے اور ملازمین کے رویے میں عجیب پر سرارت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ نسیم سے دوستی کر لی۔

وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے منتظر تھی جب ہی ایک صبح اسے شبیہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔

جنت بیگم کے ساتھ جلال بھی تھا۔ وہ ماوی کو حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تاہم اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے۔ جنت بیگم نے ماوی کو یہاں دیکھ کر مستقیم بھٹی پر بے حد غصہ کیا۔ جنت بیگم نے تنہائی میں ماوی سے حویلی آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کا سراغ لگانے اور جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہے۔ جنت بیگم نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے حرم کی شادی کے بعد حویلی سے باہر نکال دے گی۔

فیضان ماوی کی پراسرار گمشدگی سے پریشان ہیں۔ ثمینہ ان سے کہتی ہیں کہ ماوی پاکستان میں ہی ہے لیکن انبیا انہیں بتاتی ہے کہ ثمینہ نے اسے بتایا ہے وہ آئرلینڈ واپس چلی گئی۔

رات کے وقت جلال ماوی سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تو شبیہ نے اسے وہاں سے نکلنے ہوئے دیکھ لیا۔

شبیہ نے جلال سے باز پرس کی تو جلال نے اسے بتا دیا کہ وہ ماوی سے نکاح کر چکا ہے۔ جب وہ شبیہ کو یہ بات بتا رہا تھا تو تنوی نے سب کچھ سن لیا۔ اس نے خرم اور نمل کو بھی بتایا مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ فیضان کو پتا چل گیا کہ ماوی حویلی میں ہے۔ فیضان ثمینہ پر بے حد ناراض ہوئے۔

ماوی نے حویلی کی خاص ملازمہ تنسیم کو آمادہ کر لیا کہ وہ اسے حویلی کے تمام رازوں سے آگاہ کرے گی۔ حرم کی مہندی کی تقریب ہو رہی تھی۔ سب لوگ اس میں مصروف تھے جب تنسیم نے ماوی کو ملنے کا اشارہ کیا۔ ماوی حویلی کے عقبی حصے میں گئی تو وہاں اسے تنسیم کے بجائے ایک لاغر سا ڈھانچہ نما شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

وہ تنسیم کا باپ ہوتا ہے۔ تنسیم بتاتی ہے کہ جنت بی بی نے کئی سالوں سے اسے اس کال کو ٹھڑی میں بند کر رکھا ہے۔ برابر والے گاؤں کے چوہدری فیاض نے جنت بی بی کی زمینوں کا پانی بند کر دیا۔ یہ قضیہ نمٹانے کے لیے جنت بی بی رجب علی اور رب نواز کو بھیجتی ہے۔ وہاں طیش میں آکر رب نواز پستول نکال لیتا ہے۔ رجب علی منع کرتا ہے اور اس سے پستول چھینتا ہے۔ اس چھینا پھینچی میں گولی چل جاتی ہے اور چوہدری فیاض کا آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ رب نواز یہ الزام رجب علی پر لگاتا ہے مگر ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنت بی بی کے سامنے اقرار جرم کر لیتا ہے۔ جنت بی بی اسے زبان بند رکھنے کا حکم دیتی ہے اور دونوں کو بچا لیتی ہے، تاہم رجب کے سر ارحسان ڈال دیتی ہے۔ انبیاء و انیال حسن سے ماں کو واپس لانے کو کہتی ہے۔ وہ سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف ثروت بھی مصالحت

قسط ۲۶

ماوی نے ہری طرح ہڑبڑا کر دیکھا اور کچھ بول بھی نہ سکی۔ وہ جلال تھا اور اس نیم تاریک ویران راہ داری میں اس کے اتنا قریب تھا کہ ماوی کو اس کی سانسوں کا لمس تک اپنے چہرے پر محسوس ہوتا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ جلال اس کے انتہائی قریب تھا کہ ماوی ذرا سہلتی تو اس کے آواز سے اس کے موتی تک جلال کے چہرے کو چھو جاتے۔ ماوی نے ہوش میں آتے ہوئے اس کی گرفت سے آزاں ہونا چاہا، لیکن جلال کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ماوی کا دل اور لرزا۔

”جلال!۔۔۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔“

جلال نے سرعت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ”تنو اسی طرف آرہی ہے۔ کوئی آواز مت نکالنا۔ ورنہ اسے پتا چل جائے گا کہ ہم دونوں یہاں ہیں۔“ جلال نے آواز دبا کر کہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں مستقل ماوی کے چہرے پر جمی تھیں۔ ماوی کی آنکھیں گویا پچھی کی پچھی رہ گئیں۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کسی طرح جلال سے آزاں ہو کر بھاگ جائے، لیکن یہ بات سن کر اس کی مزاحمت دم توڑ گئی اور جلال۔۔۔ اس کی سماعت کو کہ راہ داری کے دبانے سے آتی اٹھتے گرتے قدموں کی آوازوں کی طرف لگی تھی۔ لیکن آنکھیں۔۔۔ آنکھیں ماوی کے ایک ایک نقش کو جذب کر لیتا چاہتی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں، اسی پل ماوی تڑپ کر اس سے دور ہو گئی۔

”ست۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”یہی میں تم سے پوچھنے والا تھا کہ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”مم۔۔۔ میں۔۔۔ وہ نیلے ہی بوکھلائی ہوئی تھی۔ اس بات پر اور گڑبڑا گئی۔

”میں ایک چوکی غلطی سے اس طرف آگئی تھی۔ مجھے ابھی حویلی کے راستوں کا ٹھیک سے علم نہیں ہے۔ تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف جاؤں۔“ اسے بروقت موثر بہانہ سوجھ گیا تھا۔

”جب تمہیں راستوں کا نہیں پتا تو اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم کسی کو ساتھ لے کر آئیں۔“ جلال نے کہا۔

”کم آن جلال! میں کوئی بچی تھوڑا ہی ہوں کہ ہر وقت کسی نہ کسی کی انگلی تھام کر پھوں۔“ اس نے بات ہنسی

میں ٹالنا چاہی۔ ”دیکھو میں نے اس وقت بھی تو درست راستہ ڈھونڈ ہی لیا تھا۔“

”ہاں۔۔۔ تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ ویسے بھی حویلی سے جان پہچان ابھی سے نہیں بڑھاؤ گی تو بعد میں وقت ہوگی۔ کیونکہ آنا تو تم نے یہیں ہے۔“

جلال نے مسکراتے ہوئے لطیف سے انداز میں کہا تھا۔ ماوی نے مسکرانے کی کوشش کی، لیکن ایک ہونق سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آکر ٹھہری۔

یہ نہیں کہ وہ جلال کی بات سمجھ نہ پائی تھی۔ بات سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے ہونق بن گئی تھی۔

”میں۔۔۔ میں جاتی ہوں۔ کوئی آنے جائے۔“

وہ ان سنی کرتے ہوئے ایک طرف سے نکل کر جانے لگی، لیکن ایک جھٹکے سے اسے رکنا پڑا، کیونکہ اس کا ہاتھ جلال کے ہاتھ میں تھا۔

جلال کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ تھی اور وہ بڑی چاہ سے ماوی کو دیکھ رہا تھا۔

اینا اعتماد بحال رکھنے کی انتہائی کوشش کے باوجود ماوی ہر اسماں نظر آتی۔

”کوئی کام ہے جلال؟“

جلال سے اس کی گھبراہٹ مخفی نہ رہی تھی، لیکن وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

”مجھے جانے دو جلال! کوئی آجائے گا۔“ ماوی نے بڑی دقت سے کہا تھا۔

”کیا میں نے تمہیں کبھی بتایا ہے کہ تم کتنی خوب صورت ہو؟“ جلال نے غیر محسوس انداز میں چند قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”میرا خیال ہے میں نے تو کبھی یہ بھی نہیں بتایا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“

ایک بار پھر وہ اس کے اتنا قریب آگیا تھا کہ فرار کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔ ماوی نے اپنے دل کو بے ہنگم انداز میں دھڑکتے ہوئے سنا تھا۔ اس نے صدق دل سے دعا کی کہ تنو یا کوئی اور اس طرف آ ہی جائے اور

یقیناً ”یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اسی پل کہیں کھٹکا سا ہوا تھا۔ جلال جو ایک ٹرائس کی کیفیت میں مبتلا اسے دیکھ رہا تھا سٹپٹا کر اس سے دور ہو گیا۔

ایک مشکل صورت حال سے بچ نکلنے کا یہ واحد موقع ہاتھ لگا تھا سو ماوی فی الفور وہاں سے کھسکی۔ جب تک جلال کو اسے روکنے کا خیال آیا، وہ بہت دور جا چکی تھی۔ جلال نے دیکھا۔ راہ داری کے آخری سرے پر گھبراہٹ کے مارے ماوی کے قدم اٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ اس کے لبوں پر جان دار مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔



”میں نے کہا تھا نا۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ولید ایسا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا جو ہمارے لیے شرمندگی کا باعث بنے۔“

ثروت سے اینبا کی بات اسی روز شام کو دوبارہ ہوئی تھی اور وہ خاصی مطمئن لگ رہی تھیں۔ اینبا تعجب میں مبتلا ہوئی۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں نے یہ کب کہا تھا کہ آپ ولید سے تصدیق کریں۔ می ابو غلط ایکٹیویٹیز

میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے خود سارا اسٹف اس کے کمرے میں دیکھا ہے۔“

”میری اس سے بات ہو گئی ہے انو! اس نے ایڈمٹ کیا ہے کہ وہ اسموکنگ کرتا رہا ہے۔ باقی سب چیزوں کے لیے وہ کہہ رہا تھا اس کے دوستوں کی ہیں جو وہ جلد ہی انہیں واپس کر دے گا۔ کہہ رہا تھا انوبلا وجہ پریشان ہو گئی۔

اگر پہلے مجھ سے بات کر لیتی تو آپ سے بات کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔“

”میری! وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ انہی نے روکھی ہو کر کہا۔ ”میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس نے میری بات نہیں سنی۔ الٹا مجھے دھمکانے لگا۔“

”نو! پلیز بیٹا! میرے لیے پہلے ہی بہت برا ہلعوز ہیں۔ انہیں بڑھاؤ مت۔“ ثروت نے عاجزی سے کہا۔ ”مگر تمہارا ولید سے کوئی جھگڑا ہوا ہے تو اسے آپس میں سلجھا لو۔ بات کو اتنا بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”میری! اس نے کہا چاہا۔“

”ولید نے مجھے بتایا ہے کہ چند روز پہلے تمہارا اور اس کا کوئی جھگڑا ہوا تھا جس کا بدلہ لینے کے لیے تم اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔“

”اور آپ نے اس کی بات پر یقین کر لیا؟“ اس نے صدمے کی کیفیت میں پوچھا۔

”یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے۔ میں تم دونوں کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔“

ثروت نے بے چارگی سے کہا اور اسے بھائیوں کے ساتھ سلوک سے رہنے کی تاکید کر کے فون بند کر دیا۔ انہی بہت دیر تک بے جان فون کو ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی تھی اور پھر تھک ہار کر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے خود کو حالات کے دھارے میں بہنے کے لیے جھوڑنا چاہیے۔



دوسری جانب معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے شبیہ نے تنوی کو پچھلی طرف جانے سے روکا تھا۔ وہ اسے جلال کا تعاقب کرتے تو دیکھ ہی چکا تھا اور اسے یقین تھا اگر تنوی جلال اور ماوی کو اکٹھے دیکھ لیتی تو اس نے حویلی میں شور مچانے سے ہرگز نہ چوکنا تھا۔ عورتوں کا ہاتھ یوں بھی عقل کی طرف سے تنگ ہوتا ہے اور تنوی کے پاس تو عقل نام کی کوئی چیز سرے سے تھی ہی نہیں۔

”کہاں بھاگتی پھر رہی ہو تم؟“

تنوی کے تیز تیز اٹھتے پڑتے قدم شبیہ کی آواز پر ٹھک کر رکے تھے۔

”وہ میں۔ میں تو۔“ حسب عادت وہ گڑبگڑا گئی۔

”اب اس بات کا کیا مطلب ہے؟“

”وہ تنسیم سے کچھ کام کہا تھا میں نے اسے پچھلی طرف جانے دیکھا تھا۔ اسی لیے اسے ڈھونڈنے جا رہی تھی۔“

”تم میں عقل نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟“ شبیہ نے حسب توقع ڈپٹ کر کہا۔

”دن کے وقت بھی بی جان تم لڑکیوں کو پچھلی طرف جانے نہیں دیتیں اور تم منہ اٹھا کر رات کو جا رہی ہو۔“

تنوی کا سر جھک گیا۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ جب بھی اس کا سامنا شبیہ سے ہو گا۔ اسے جھاڑی پڑے گی۔

”مجھے تنسیم سے کچھ کام تھا۔“ وہ منمنائی۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ جلال کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلی آئی ہے اور بے دھیانی میں بی جان کی تاکید بھی نظر انداز کر دی ہے۔ اس صورت میں اور بھی باتیں سننا پڑیں اور یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔

”ایسا کیا ضروری کام تھا جو دن کی روشنی میں اس سے نہیں کہا جاسکتا۔“ شبیہ نے ڈپٹ کر پوچھا۔

”وہ تھا نا کچھ کام۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔“ وہ ذرا سا چڑھ گئی۔ ”اچھی مصیبت ہے بھئی۔ ہر وقت کی انکوٹری جان ہی نہیں چھوڑتی۔“

شبیہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اسے تنوی کا انداز دلچسپ لگا تھا۔ غصہ تو خیر بناوٹی ہی تھا کہ وہ خائف ہو کر وہاں سے کھٹک جائے۔ اس نے خود سے اس کے تنے ہوئے خفا خفا سے چہرے کو دیکھا۔ پھر بے سبب ہنس دیا۔ تنوی ہمیشہ اسے چھوٹی سی بچی لگتی تھی۔ پتا نہیں بی جان نے کیا سوچ کر ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑ دیا تھا۔ درنہ شبیہ تو کبھی چاہ کر بھی اپنے اور اس کے مابین اس رشتے کی لطافت کو محسوس بھی نہیں کر سکا تھا۔

تنوی نے اس کے ہنسنے پر تعجب سے اسے دیکھا۔

”اچھا نکلو اب یہاں سے۔ اول تو مجھے یقین ہے اتنی رات گئے تنسیم نے اس طرف جانے کی حماقت نہیں کی ہوگی، لیکن میں دیکھتا ہوں اگر وہ پچھلی طرف ہوئی تو کہہ دوں گا تمہارا بہت ضروری کام سن لے۔ دوسری بات یہ کہ اگلی بار تم مجھے اس طرف نظر نہ آؤ۔“

شبیہ نے اسے ٹالتے ہوئے کہا اور تنوی جانتی تھی وہ اسے ٹال ہی رہا ہے تب ہی اس کی خفگی میں اضافہ ہوا۔

”میں نے تنسیم کو اس طرف جانے سے روک دیکھا ہے۔“ اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”بات مانتا کرو تنوی! وہ اس طرف نہیں گئی۔“

”میں نے دیکھا ہے شبیہ بھائی! آپ مانتے کیوں نہیں ہیں میری بات۔“ وہ رو دینے کو تھی۔ ”مجھے اس سے ذرا سا کام ہے بات کر لینے دیں۔“ شبیہ کھٹک سا گیا۔ اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر اس راستے کی طرف دیکھا جو مل کھاتا ہوا حویلی کے پیچھے حصے کی طرف لے جاتا تھا اور جہاں حویلی کے کئی راز دفن تھے۔

”تمہیں یقین ہے تم نے تنسیم کو اسی طرف جانے دیکھا ہے؟“

تنوی نے زور سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ میں تنسیم کو ابھی تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔“

”لیکن۔“ تنوی کی امیدوں پہ پانی پھر رہا تھا۔ اسے سخت مایوسی ہونے لگی جو اس کے چہرے سے بھی جھلکتی تھی۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جاؤ یہاں سے۔“ وہ اتنی زور سے بولا تھا کہ تنوی بری طرح خائف ہو کر وہاں سے بھاگی۔

شبیہ نے حویلی کے پچھواڑے کی طرف رخ کیا تھا۔



ماوی جیسے تیسے اپنے کمرے میں پہنچی پھر فنافٹ دروازہ بند کیا اور دروازے سے پشت لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کی پیشانی پر اب تک نمی چمک رہی تھی۔ یقیناً ”اپنی پوری زندگی میں وہ اس سے زیادہ کبھی نہیں گھبراتی ہوگی۔“

وہ نہ کر اسے جلال کے انداز یا آ رہے تھے اور اس کی سراسیمگی میں اضافہ کر رہے تھے۔

”یہ آپ نے مجھے کہاں پھنسا دیا می! اس نے رو ہا سی ہو کر بلند آواز میں شکوہ کیا تھا۔“

”نکاح کروا تے ہوئے کم سے کم آپ کو یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ جلال لاکھ بے ضرر دکھائی دیتا ہو، لیکن اس کے بھی کچھ فطری تقاضے ہوں گے جنہیں پورا کروانے کی آرزو وہ اپنی بیوی سے کرے گا۔ می نے نہیں سوچا تو مجھے سوچنا چاہیے تھا۔ یا اللہ! مجھے ہی خیال کیوں نہیں آیا۔“

وہ سخت پریشانی کا شکار تھی۔ یکایک اس کی پریشانی جھنجھلاہٹ اور غصے میں بدلنے لگی۔ اس نے کھڑے کھڑے

اپنے پیرمائی ہیلز سے آزاد کروائے۔ الماری سے اپنا سیل فون نکالا اور بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے سیل پر کئی مسڈ کالز اور میسجز آئے ہوئے تھے۔ جنہیں نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ٹیمپ کا نمبر ملانا شروع کیا۔ لیکن کئی بار کی کوشش کے باوجود بھی ٹیمپ اس کی کال ریسیو نہیں کر رہی تھیں۔ ماوی نے چڑ کر سیل ایک طرف پھینک دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

صورت حال تھی پریشان کن۔ کہتی تو کس سے مدد مانگنے جاتی تو کس کے پاس۔

اسی بل اس کا سیل فون وائبرٹ کرنے لگا۔ ماوی نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔ یہ سوچ کر کہ ٹیمپ نے ہی کال بیک کی ہوگی۔ لیکن کوئی غیر محفوظ شدہ نمبر تھا۔ پہلا دھیان فیضان کی طرف ہی گیا تھا۔ کیونکہ یہ نمبر تو صرف ٹیمپ کے پاس تھا جلال کے پاس۔ اگر کسی تیسرے نمبر سے کال آرہی تھی تو وہ فیضان ہی ہو سکتے تھے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ اب کیا کیا جائے آخر؟

پھر ایک نتیجے پر پہنچی اور کال ریسیو کیے بغیر فون واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”اس مسئلے کا صرف یہی حل ہے کہ جلد از جلد ثبوت حاصل کروں اور حویلی سے نکلنے کی کروں۔ جلال نے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو میں تو اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کر سکوں گی۔“

انتہائی پریشان کن حالت میں اس نے اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا تھا جو یقیناً ”عام حالات میں وہ کبھی بھی نہ کرتی۔ لیکن بہر حال بھی تو یہ بھی مایوس کن بات، سو وہ اور بھی دل برداشتہ ہو کر بیڈ پر گر کرنے کے انداز میں لیٹ گئی اور اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی اور حل تلاش کرنے لگی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ شبیہ کا پہلا ٹکراؤ جلال سے ہوا تھا۔

”تھو گئی ملاقات؟ مل گیا سکون؟“ اس نے حسب عادت طنز سے آغاز کیا تھا۔

”کہاں؟“ جلال نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے منہ لٹکا کر کہا۔ ”ماوی تو میری شکل دیکھتے ہی بھاگ گئی۔ میں تو ڈھنگ سے اسے دیکھ بھی نہیں پایا۔“

”شرم تو نہیں آرہی ہوگی ایسی بات کرتے؟“ شبیہ دانت پیس کر بولا۔

”اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ اپنی منکوحہ سے ملنے آیا تھا کسی غیر سے نہیں۔“ اس نے ہاتھ لہرا کر کہا تھا۔ ”منکوحہ سے کسی مذہب وقت میں اور مذہب جگہ پر بھی ملا جلا سکتا تھا۔ ابھی تمہارے پیچھے پیچھے تنوی پہنچ جاتی تو ملاقاتوں کا سارا شوق پورا ہو جاتا تھا۔“

”مجھے پتا تھا وہ اسی طرف آرہی ہے اس لیے میں نے ماوی کو کچھ دیر روک لیا تھا۔“

”اگر میں اسے نہ روکتا تو آپ کی تو اچھی ویرگستہ بن چکی ہوتی اب تک۔“

”یار! آئی جانے دیتے تنوی کو۔ کم سے کم وہ سب کو بتا تو دیتی۔ میں تو خود تنگ آچکا ہوں اس بات کو چھپاتے چھپاتے ایسا لگتا ہے نکاح نہیں کوئی غلطی کر بیٹھا ہوں۔“

”چھ بھلے میمنس ایل آوی تھے تم۔ اس لڑکی کی محبت نے تمہیں کیسا چغہ بنا دیا ہے کہ معاملے کی نزاکت کو سمجھ ہی نہیں رہے۔“

”چلو کم سے کم تم نے یہ تو مانا کہ میں میمنس ایل تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو تم یہ ماننے کو بھی تیار نہیں تھے۔“ جلال نے پھر اس کی بات نہی میں اڑائی تھی۔ شبیہ کو مزید ہنسنے لگ گئے۔

”تیرا کچھ نہیں ہو سکتا جلال! اس لڑکی کے ہاتھوں منہ کی کھائے گا۔ تب تجھے عقل آئے گی۔“

”اور ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں۔“

عین اس وقت جب شبیہ دوسری سمت میں جا رہا تھا۔ اس نے جلال کی متبسم آواز اور پر یقین لہجہ سنا تھا۔ شبیہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ ہاں لیکن اس نے دل ہی دل میں غیر ارادی طور پر جلال کی بات کے سچ ہونے کی دعا ضرور کی تھی۔ جیسا بھی تھا لیکن جلال کو وہ تکلیف میں بہر حال دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

تسلیم اسے سامنے پا کر ٹھنک کر رہی تھی۔ وہ اتنا اچانک سامنے آیا تھا کہ تسلیم اگلے حصے میں جانے کے لیے متبادل راستہ بھی اختیار نہیں کر سکتی تھی۔

”تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ شبیہ نے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔

”وہ جی میں۔۔۔ کھانا پہنچانے آئی تھی۔“ اس نے فوراً بات بدلائی۔

”ہوں۔“ شبیہ نے بغور اسے دیکھا۔ گویا جھوٹ سچ کا اندازہ لگانا چاہ رہا ہو۔

”کھانا پہنچانے کے لیے ماوی بی بی کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”جی؟“ وہ صاف گڑبڑا گئی۔ ”نہیں جی۔۔۔ وہ تو۔۔۔“

”تھو فکروں میں باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے مجھ سے۔“ شبیہ نے ڈپٹ کر کہا تھا۔ تب ہی ایک اور ملازمہ تسلیم کو تلاش کرتی اس طرف آنکلی۔

”تمہیں بڑی چوہدرائیں جی بلارہی ہیں۔“

تسلیم نے دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے اجازت طلب نظروں سے شبیہ کو دیکھا۔ شبیہ کو جھنجھلاہٹ تو ہوئی، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ انکو آڑی کو کسی اور وقت پر ٹال کر اسے جانے دیا جائے۔ سو اس نے یہی کیا۔

تسلیم خیر منائی رخصت ہوئی، لیکن شبیہ کے ذہن میں سوچ کی پرچھائیاں چھوڑ گئی تھی۔

ماوی کی پچھلی رات بہت بے چینی میں کٹی تھی، کہیں فجر کے وقت جا کر آنکھ لگی تو بڑی گہری نیند آئی۔ صبح اسے جگانے کے لیے تنوی کو آنا پڑا تھا۔

”میں نے سوچا پوچھ لوں طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ ورنہ آپ اتنی دیر سوتی تو نہیں ہیں۔“ تنوی نے بیچھینے ہوئے انداز میں کہا تھا، کیونکہ ماوی کی آنکھیں اوھوری نیند کی غمازی کر رہی تھیں۔

”ہاں! طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بس رات تھکاوٹ بہت ہو گئی تھی۔ شاید اسی لیے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔“ آنکھیں ملنے ہوئے اس نے بات سنبھالی تھی۔

”اچھا آپ فریش ہو کر آجائیں، ہم لوگوں نے آپ کے انتظار میں اب تک ناشتا بھی نہیں کیا۔“ تنوی نے جرح کا ارادہ کسی اور وقت پر ٹال کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم چلو۔ میں بس دس منٹ میں آرہی ہوں۔“

اس نے مسکرا کر کہا تو تنوی جواباً ”مسکراہٹ اچھا کر کرے سے باہر نکل گئی۔ ماوی کچھ دیر ایسے ہی سستی سے لیٹا رہی۔ رات کے تمام واقعات اپنے تمام تر سیاق و سباق کے ساتھ یاد آنے لگے تھے۔ تب اٹھ بیٹھی۔ یوں ہاتھ بائیں دھو کر بیٹھے رہنے یا پریشان ہونے سے تو کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ سو بہتر تھا کہ اٹھ کر ذرا حویلی والوں کی خبر

معلوم کر لی جاتی۔
چند منٹ بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر تولیے سے چہرہ تھپتھپاتی باہر نکلی تو اس کا سیل فون پورے حلق سے چیخ رہا تھا۔

”شکر ہے، تمہیں فون ریسیو کرنے کی فرصت مل گئی۔“ اس کی آواز سنتے ہی فیضان نے کہا تھا۔
”کیسے ہیں فیضان ماما؟“ اس نے فیضان کے انداز و سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے عام سے لہجے میں پوچھا۔

”یہ کیا حماقت کی ہے تم نے؟“ فیضان نے بھی اس کا سوال نظر انداز کیا۔
”مئی آپ کو ڈیٹیلز دیتا چکی ہیں اب مجھ سے کیا سننا چاہ رہے ہیں۔“ اس نے تولیہ ہڈ پر اچھالتے ہوئے کہا۔
”مجھے صرف اتنا بتا دو اس وقت تمہاری عقل کہاں تھی جب تم آپا کی بات مان کر حویلی جا رہی تھیں؟“
ماوی نے ایک گہری سانس بھری ذہن میں ان جملوں کو جو یہ بتا چلتے ہی کہ فیضان کو اس کے حویلی جانے کی خبر مل چکی ہے۔ اس نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بطور اسکرپٹ تیار کیے تھے، ترتیب دیا اور معتدل لہجے میں بولی۔
”آپ کے تمام اعتراضات درست۔ تمام خدشات بھی بجائے۔ لیکن حقیقت یہی ہے ماما! کہ مئی نے مجھے اتنا ایموشنل بلیک میل کر دیا تھا کہ میرے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔“

”جانے دو ماوی! تم کو آج تک کوئی ایموشنل بلیک میل کر سکا ہے بھلا؟“ فیضان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ ”یہ بات تم اس سے کہنا جو تمہیں جانتا نہ ہو۔ اس سارے میں تمہاری سو فیصد مرضی شامل تھی۔ تب ہی تم نے حویلی جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ثمنہ آپا نے رجب بھائی سے متعلقہ حقائق کس انداز میں تمہیں سنائے ہوں گے، لیکن تمہیں عقل سے کام لینا چاہیے تھا ماوی! شیر کی کچھار میں جا کر بیٹھ جانا اور یہ توقع کرنا کہ شیر آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، نری حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ تمہیں تو میں بہت عقل مند سمجھتا تھا۔“

ماوی نے ایک نظر گھور کر سیل فون کو دیکھا، جیسے وہاں فیضان کی تصویر آرہی ہو، لیکن ساتھ ہی اس نے دل میں اعتراف بھی کیا تھا کہ فیضان بہر حال اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔
”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مجھے کوئی بلیک میل نہیں کر سکتا۔ لیکن مئی کی بات دوسری ہے۔ وہ ”کوئی“ نہیں ہیں، میری ماں ہیں۔ پھر بات بھی میرے بابا کی تھی، سو مجھے ماننا ہی پڑا اور یہ بھی سچ ہے کہ میں مئی کی بات ٹال بھی دیتی۔ بشرطیکہ انہوں نے میرا انکار سن کر خود کشی کی کوشش نہ کی ہوئی۔“

”کیا۔؟“ فیضان کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ ”ثمنہ آپا نے خود کشی کی کوشش کی اور تم مجھے اب بتا رہی ہو؟“
”میں نے تو آپ کو باقی باتیں بھی پہلے نہیں بتائی تھیں، پھر اس اعتراض کا کیا جواز ہے۔“ اس نے گہری سانس بھر کر کہا تھا۔

”پھر بھی ماوی! تمہیں ہم میں سے کسی کو تو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔ مجھے نہیں بتایا تو فیاض بھائی کو بتائیں اور ان کو بھی نہیں تو شہروز سے، ڈسکس کیا ہوتا۔ پھر آپا کو پینڈل کرنا ہماری ذمہ داری ہوئی۔“
”میں نے تو کوشش کی تھی ماما! لیکن اس وقت حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ ہر بات مئی کے حق میں اور میرے خلاف جاتی تھی۔“

”تم اپنی کمزوری کو اب حالات کے کھاتے میں مت ڈالو۔“ فیضان نے سلگ کر کہا۔
”میں سچ کہہ رہی ہوں ماما! میں نے فیاض ماما سے بات کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن انہوں نے اس وقت یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیا کہ مئی نے زندگی میں بہت مشکلات دیکھی ہیں اور مجھے ان کی ہر بات ماننا چاہیے، جبکہ

شہروز۔“ روائی سے بولتے ہوئے وہ ایک سخت خاموش ہو گئی تھی۔
”ہاں اب کہہ دو کہ شہروز نے بھی ایسی ہی کوئی بات کہہ کر تمہیں خاموش کر دیا تھا۔“ فیضان نے اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر کہا تھا۔

ماوی بری طرح چڑ گئی۔
”جی نہیں۔ اس نے کچھ کہہ کر مجھے خاموش نہیں کروایا تھا۔ بس جب میں نے اسے کال کی تو فون اس کی گرل فرینڈ نے ریسیو کیا تھا اور شہروز نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ وہ کچھ روز پہلے شادی کر چکا ہے۔ اب مجھے آپ صرف اتنا بتادیں کہ اس کے بعد میرے پاس کیا جواز رہ جاتا تھا کہ میں اپنا اتنا پرستل معاملہ اس سے ڈسکس کرتی۔“ وہ ہر لفظ چاٹتا کراد کر رہی تھی۔

فیضان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ کہتے بھی کیا؟ انکشاف پہ انکشاف کے اس سلسلے نے جیسے انہیں گم سم ہی کر دیا تھا۔

”شہروز نے تم سے خود کہا کہ وہ شادی کر چکا ہے؟“ انہوں نے جیسے دل کی تسلی کے لیے پوچھا تھا۔
”نہیں۔ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔“ ماوی بری طرح تاؤ کھا کر بولی۔ ”اور ہتا نہیں میں آپ کو اتنی وضاحتیں کیوں دے رہی ہوں، جبکہ آپ کو میری کسی بات کا یقین ہی نہیں آ رہا۔“
”یہ بات نہیں ہے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ فیضان نے کہا۔ ”لیکن تمہاری ساری باتیں اتنی ناقابل یقین ہیں کہ میں چاہ کر بھی یقین نہیں کر پا رہا۔“

”ٹھیک ہے، پھر میں فون بند کر لی ہوں، جب آپ کو یقین آجائے تب بات کر لیں گے، ویسے بھی مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے اور سب لوگ ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔“

”میرا یہاں پریشانی سے برا حال ہے اور تمہیں اپنے ناشتے کی پڑی ہوئی ہے۔“
”تو اور کیا کروں؟ بھلا اس پریشانی کا کوئی فائدہ ہے؟“ وہ جلد ہی اپنی سابقہ ٹون میں لوٹ آئی تھی۔
”تم صرف یہ کرو کہ اپنا سامان سمیٹو اور فوراً“ سے پیشتر لاہور پہنچ جاؤ۔“ فیضان نے حکم دینا انداز میں کہا تھا۔
”ایم سو ری ماما! آپ کی بات اب نہیں مان سکتی۔ شیر کی کچھار میں آئی گئی ہوں تو اس کے منہ کا نوالہ چھینے بغیر واپس نہیں آؤں گی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”ڈانٹا لگ کر ذرا کم بول لو تو اچھا ہو گا۔“ فیضان نے کہا۔ ماوی ہنس دی۔
”تو آپ کا کیا خیال تھا ڈانٹا لگ کر صرف آپ بول سکتے ہیں؟“ اس کا انداز نیم سنجیدہ سا تھا۔ ”مطلب صرف یہ تھا کہ اب یہاں آئی گئی ہوں تو ثبوت لیے بغیر واپس نہیں آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے، تم نہیں آ رہی تو میں وہاں آتا ہوں۔“ فیضان نے حتمی انداز میں کہا۔
”اور اس سے کیا ہو گا؟“ ماوی نے پوچھا۔ ”کیا یہ لوگ ہمیں ثبوت جلد فراہم کر دیں گے؟ نہیں کبھی نہیں، لٹا بنا تیا کھیل بگڑ جائے گا۔ آپ میرے لیے مشکلات کھڑی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے؟“

”ان سب باتوں کے باوجود میں تمہیں وہاں اکیلے رہنے نہیں دے سکتا۔ اگر ان لوگوں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیا تو۔“
”میں جب یہاں آ رہی تھی تو میں نے بھی مئی سے یہی کہا تھا۔ آپ کو جو خدشات اب لاحق ہیں، مجھے اس وقت بھی تھے، لیکن ہوا کیا؟ یہی کہ مجھے یہاں آنا ہی پڑا۔ اپنی مرضی سے یا مئی کے فورس کرنے پر۔ یا شاید یہ بات میری قسمت میں لکھی ہوئی تھی۔ جو بھی ہو، مجھے آنا تو پڑا اور اب آئی گئی ہوں تو ہر بات سے بے پروا ہو کر وہ

کام کرنا چاہتی ہوں جس کے لیے یہاں آئی ہوں۔ مجھے کوشش کر لینے دیں ماما! ہو سکتا ہے میں کامیاب رہوں۔“
 ”محض مفروضوں کی بنیاد پر وہاں بیٹھے رہنا اور بھی بڑی حماقت ہوگی مادی!“ فیضان نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔
 ”نہیں! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، میرا خیال ہے مجھے کچھ ہی اور دن یہاں رکنا پڑے گا۔ جلد ہی مجھے ثبوت مل جائیں گے۔“

”میں آ رہا ہوں اور تمہاری کوئی بات بھی نہیں سنوں گا۔“ فیضان نے اس کی ساری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

”پلیز ماما! ٹرائی ٹوانڈر اسٹینڈ۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”زیادہ سے زیادہ بھی میں ایک یا دو دن میں حویلی میں ہوں گا۔ تم اپنا سامان پیک کر کے رکھو۔“
 فیضان نے اس کی اگلی بات سننے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ مادی نے بے زاری سے سیل فون بیڈ پر اچھال دیا۔ رات بھر میں وہ اسی نتیجہ پر پہنچی تھی کہ اسے جلد از جلد حویلی سے لکھنا چاہیے۔ فیضان سے بات کر کے اس کے ارادے میں سختگی آئی تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی فیضان نے اگر کہا ہے تو وہ پہنچ ہی جائیں گے اور اس سے پہلے کہ صورت حال بگڑتی یا معاملہ اس کے ہاتھ سے لکھتا اسے ثبوتوں تک رسائی حاصل کرنا تھی۔



فیضان نے ابھی فون بند کیا ہی تھا کہ ان کے آفیشل نمبر پر کال آنے لگی۔
 ”السلام علیکم توقیر بھائی! بڑے دن بعد مجھے یاد کیا۔“ انہوں نے حتی المقدور اپنا الجھ فریش رکھا تھا۔
 ”وعلیکم السلام۔ یار! میں نے تو پھر بھی تمہیں یاد کیا، تمہیں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی۔“ انہوں نے جواباً ”فورا“
 بتا دیا تو فیضان قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

”کیا کروں توقیر بھائی! اس کاروبار نے تو سراٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا، اتنی مصروفیت ہے کہ بس۔“
 ”چھا سنو۔ دانیال کے ساتھ آج کل تمہارے تعلقات کیسے چل رہے ہیں؟“ اچانک توقیر صاحب نے پوچھا۔

فیضان الجھے۔ سوال کچھ عجیب سا تھا۔
 ”کیا مطلب توقیر بھائی! یہ کیسا سوال کیا ہے میں کچھ سمجھا نہیں۔“
 ”مطلب یہ کہ تمہارا کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا، کاروباری معاملات میں سو طرح کے اتار چڑھاؤ آجاتے ہیں، اسی حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔“

”نہیں۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔“ فیضان نے سابقہ الجھن کے ساتھ جواب دیا تھا۔ ”بلکہ میرا خیال ہے بطور بزنس پارٹنرز ہمارے تعلقات تو مثالی ہیں۔“
 ”اگر ایسی بات ہے تو دانیال پارٹنرشپ ختم کرنے کی بات کیوں کر رہا ہے؟“ توقیر صاحب نے مزید الجھ کر جیسے خود کلامی کے انداز میں کہا تھا، بلکہ درحقیقت فیضان کے سر پر بم دے مارا تھا۔
 ”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”ہاں فیضان! میں نے اسی لیے تمہیں فون کیا ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے میری دانیال سے بات ہوئی ہے اور اس نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہارے ساتھ مزید کام نہیں کرنا چاہتا، اس لیے پارٹنرشپ کو ختم سمجھا جائے۔ میں نہیں انکارم کروں کہ جلد از جلد اس کی انیکسی خالی کر دو اور یہ کہ اس کا وکیل ایک دو روز میں تمہیں نوٹس بھی بھجوا دے۔“

گا۔ میں تو خود بہت حیران ہوا اس کی باتیں سن کر۔ اسی لیے تمہیں فوراً فون کیا کہ اصل معاملے کا پتا لگاؤں۔
 کاروبار کون سا معمولی بات ہے کہ جب دل کیا شروع کر لیا، جب دل چاہا ختم کر دیا۔“
 ”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ مانتا ہوں، میرا سرمایہ دانیال بھائی سے کم ہے، لیکن میری تو ساری جمع پونجی اس کاروبار میں لگ چکی ہے۔ میں کیسے اچانک پارٹنرشپ ختم کرنے کا محمل ہو سکتا ہوں۔“ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہیں۔ ”میں نہیں مانتا کہ دانیال بھائی نے ایسا کچھ کہا ہوگا۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“
 ”مجھے غلط فہمی ہرگز نہیں ہوئی۔“ توقیر صاحب نے تحمل سے کہا تھا۔ ”دانیال نے میرے سامنے اپنا ارادہ ہی ظاہر کیا ہے ہاں لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ تم کو انیکسی خالی کرنے کا کہہ دوں۔“
 ”میں کل چھ بجے تک ان کے پاس بیٹھا ایک پروجیکٹ ڈسکس کرتا رہا ہوں۔ اگر کوئی ایسا ارادہ تھا بھی تو انہوں نے مجھ سے اس وقت کیوں نہیں کہا؟“
 ”ہاں۔ یہ ایک اور حیرانی کی بات ہے۔“
 ”ضرور کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو رہی ہے توقیر بھائی!“
 ”میں دانیال سے دوبارہ بات کرتا ہوں۔“
 ”نہیں! آپ فون پر بات نہ کریں۔ میں آپ کو پک کر لیتا ہوں، ہم دونوں دانیال بھائی کے آفس جا کر بات کرتے ہیں۔ اچھا ہے کہ کوئی کنفیوژن نہ رہے۔“ فیضان نے کہا تھا۔
 ”ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

کچھ دیر بعد وہ دونوں دانیال حسن کے آفس پہنچ گئے تھے اور دانیال حسن نے انتہائی بد تمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔
 ”واٹ واہیل۔ آخر اس طرح کے رویے سے دانیال بھائی ثابت کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔“ فیضان یکدم طیش میں آگئے تھے۔
 ”مانتا ہوں میرے شیئرز پچیس فیصد ہیں، لیکن ان کے پاس بھی ایسا کوئی اختیار نہیں ہے کہ پارٹنرشپ کو اس طرح اچانک ختم کریں۔“ وہ پہلے ہی ماوی کی طرف سے پریشانی کا شکار تھے۔ اس افتاد پر بالکل ہی آوٹ ہونے لگے۔
 توقیر صاحب نے قدرے بوکھلا کر انہیں دیکھا۔ دانیال نے اگر کسی وجہ سے جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے تو ان کا خیال تھا۔ فیضان ضرور تحمل کا ثبوت دیں گے۔
 ”تم اپنا نمبر لوڑ مت کرو۔ میں دانیال سے بات کرتا ہوں۔“ توقیر صاحب نے جیب سے اپنا سیل فون نکال لیا۔
 ”کچھ فاصلے پر جا کر انہوں نے بات کی۔ تب ہی دانیال حسن کا پیون ان کا بلاوا لے چلا آیا۔“
 ”تم ذرا یہاں انتظار کرو فیضان! میں دانیال سے بات کرتا ہوں۔“
 فیضان نے جزیب ہو کر انہیں دیکھا۔ انتہائی سبکی محسوس ہو رہی تھی، لیکن بات ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ سونا چار اثبات میں سر ہلا دیا۔

ماوی حویلی کے مختلف حصوں میں تنیم کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ دو تین ملازمین سے بھی سرسری انداز میں پوچھ لیا مگر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو چکی تھی کہ ملنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ پھر عین اس وقت جب ماوی مایوس ہو چکی تھی تو تنیم پتا نہیں کہاں سے اچانک اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
 ”اچھا ہوا بی بی! آپ مجھے یہاں مل گئیں۔“ حسب معمول وہ جلدی میں تھی۔
 ”تم کہاں غائب ہو گئی تھیں تنیم! میں کیسے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔“ ماوی نے کہا۔
 ”اس بات کو چھوڑ دیں بی بی! کہ میں کہاں تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ چھوٹے چوہدری کو مجھ پر شک ہو گیا ہے کہ میں آپ کی مدد کر رہی ہوں۔“ اس کا محتاط لہجہ سراپیمگی کا غماز تھا۔
 ”کیا۔ لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟“ ماوی نے پریشانی سے پوچھا۔
 ”کل آپ کے جانے کے بعد جب میں تالا لگا رہی تھی تو وہ پچھلی طرف آئے تھے اور آپ کا بھی پوچھ رہے تھے وہ تو شکر ہے کہ اسی وقت کوثر مجھے بلانے آئی کہ بڑی چودھرائن نے بلوایا ہے اسی لیے بچت ہو گئی ورنہ میں تو بری پھنسی۔“ تنیم نے بتایا۔
 ”بلکہ پھنسی کیا۔ مجھے تو لگتا ہے میں پھنس چکی ہوں۔ کسی بھی وقت چوہدری جی پوچھ کچھ کے لیے بلوا سکتے ہیں۔“
 ”پھر اب کیا کیا جاسکتا ہے؟“ ماوی نے کسی قدر متفکر ہو کر پوچھا تھا۔
 ”دوبارہ تو شاید ہمیں بات کرنے کا بھی موقع نہ مل سکے، اس لیے میں آپ کے لیے یہ لے آئی ہوں۔“ تنیم نے دوپٹے کے پلو سے بندھا ایک بوسیدہ سالفاہ اس کی طرف بڑھا دیا۔
 ”یہ کیا ہے؟“ ماوی نے پوچھا۔
 ”میں بڑھی لکھی نہیں ہوں کہ صحیح بتا سکوں لیکن میرا اندازہ ہے کہ خط ہی ہوگا۔ اور مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ یہ کس نے کس کو لکھا ہے مگر میرا دل کہتا ہے کہ اس خط سے آپ کو اپنے بابا کے قاتل تک پہنچنے میں ضرور مدد ملے گی کیونکہ جب آپ کی امی اس حویلی سے جا رہی تھیں۔ ان دنوں میرے بابا بیمار تھے اور انہوں نے مجھے یہ لفافہ دے کر کہا تھا کہ آپ کی امی کو دے دوں۔ میں نے ان تک پہنچانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن انہیں جلدی میں حویلی سے جانا پڑا اور وہ خط نہ لے جا سکیں تب میرے بابا کو بہت افسوس ہوا تھا اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ میں یہ لفافہ سنبھال کے رکھوں اور اگر کبھی رجب چاچا سے وابستہ کسی انسان سے ملاقات ہو سکے تو اسے دے دوں۔ جب تک بابا کی بولنے کی صلاحیت کام کرتی رہی۔ وہ مجھے یہی تاکید کرتے رہے تھے۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ رات کو جب آپ پچھلی طرف آئی تھیں مجھے یہ اسی وقت آپ کو دے دینا چاہیے تھا۔ کم سے کم سر پر تلواریں نہ لگتی رہتی۔“

”کون سی تلواریں؟“ وہ جو لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ حیرانی سے بولی۔
 ”یہی کہ آپ تک پہنچنے سے پہلے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے تنیم! تمہارا شکریہ کہ تم نے میری اتنی مدد کی۔ خدا کرے مجھے اسی خط سے کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے تاکہ مزید کسی کی مدد نہ لینا پڑے۔“ ماوی نے قدرے بیزارگی سے کہا تھا۔
 ”آمین“ تنیم نے صدق دل سے کہا تھا پھر کچھ خیال آنے پر پوچھنے لگی۔ ”بی بی! اگر آپ کو ثبوت مل گئے تو کیا آپ فوراً واپس چلی جائیں گی؟“
 ”ہاں۔ بلکہ فوراً سے بھی پیشتر۔“ ماوی نے سرعت سے کہا۔ اس کا انداز صاف ظاہر کرتا تھا کہ وہ خود بھی حد

سے زیادہ بڑا ہے۔

”میں چلتی ہوں بی بی! ایسا نہ ہو کوئی مجھے آپ سے بات کرتا دیکھ لے اور کھٹک جائے۔“

ماوی نے اثبات میں سر ہلادیا اور وہ دونوں مخالف سمت میں مڑ گئیں۔ ماوی کی ساری توجہ اپنے ہاتھ میں دبے لفافے کی طرف تھی۔ کیسا اسرار پوشیدہ تھا اس لفافے میں کہ وہ چاہ کر بھی اس کی طرف سے دھیان ہٹا نہیں پا رہی تھی۔

وہ اپنی جھونک میں تھی کہ سامنے سے آتے جلال سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

مرد چائے کتنا بھی سیدھا یا معصوم کیوں نہ ہو۔ اسے ایسے ٹکراؤ بہت پسند آتے ہیں خصوصاً ”تب جب صنف

مخالف سے شرعی رشتہ بھی ہو تو ایسے ٹکراؤ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

”کہاں بھاگتی پھر رہی ہیں آپ محترمہ!“ جلال نے خوشگوار سے پوچھا۔

”کہیں بھی تو نہیں۔“ ماوی نے نادانستہ لفافے والا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

”میں بس مکمل کوڈھونڈ رہی تھی اس نے کہا تھا وہ مجھے سب کی پرانی تصویریں دکھائے گی۔“ اسے بروقت بہانہ

سوچ گیا۔

”ہوں۔“ جلال نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ ”نمل وغیرہ سے اچھی دوستی ہو گئی ہے تمہاری۔“

”آہ۔ ہاں۔“ ماوی نے ہونقوں کی طرح مسکرا کر کہا تھا اور کہتی بھی کیا۔

جلال بے سبب ہنس دیا پھر بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں حویلی میں کوئی پریشانی ہو تو مجھے بتانا۔“

”ہاں ضرور۔“ ماوی بھی دانستہ مسکرا کر بولی تھی اور ان دونوں نے ہی بیک وقت محسوس کیا تھا کہ بظاہر ان

دونوں کے درمیان کل ایک نازک سالجہ آکر گزر گیا تھا جس کی کوئی حیثیت بھی نہ تھی لیکن اس ایک لمحے کے

نفوش ان دونوں کے ذہنوں میں نہ صرف باقی تھے بلکہ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ شرمندہ بھی تھے اسی شرمندگی کے

مارے بے سبب گفتگو کیے جا رہے تھے۔

”وہ نمل آرہی ہے۔ میں چلتا ہوں۔“ معا جلال نے کہا تھا۔ ماوی بری طرح کھٹک گئی تھی۔ اس پر جیسے کسی

سوچ کا دروا ہوا تھا۔

”کل تم نے تنوی کے ڈر سے مجھے چھپا دیا۔ آج نمل کے ڈر سے بھاگ رہے ہو اس کے باوجود کہتے ہو کہ کوئی

پریشانی ہو تو تمہیں بتاؤں۔ تم تو مجھے بچ راستے میں چھوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہو جلال!“ اس کا لہجہ اچھا خاصا طنزیہ

تھا۔ جلال پر ڈھیروں پانی آگرا ہو جیسے۔ وہ تیزی سے چلا گیا تھا۔

ماوی نے اسی طنزیہ انداز میں سر جھٹکا۔

”اور می اس سے امید لگائے بیٹھی ہیں کہ مجھے مسئلہ درپیش ہو تو یہ میری مدد کرے گا۔ اونہ۔۔۔ بزدل۔“

”تمہارا ولید سے کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟“ واپس جاتے ہوئے توقیر صاحب نے فیضان سے پوچھا تھا۔ دانیال

حسن نے ان کے سمجھانے کے باوجود فیضان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔

”مجھے پتا ہے فیضان کو دیکھتے ہی میں اپنا غصہ کنٹرول نہیں کر پاؤں گا اور آفس میں میں کوئی سین کری ایرٹ نہیں کرنا

چاہتا اس لیے بہتر ہوگا تم فیضان سے کہوئی الحال یہاں سے چلا جائے۔ اسے جو بھی کہنا ہے وہ میں گھر میں سن لوں

مگر لیکن انکیسی اسے فارغ کرنا ہی ہوگی۔ اب اسے اپنے گھر میں میں ہر گز برداشت نہیں کر سکتا۔“

بہت سمجھانے کے بعد دانیال حسن کے انداز میں بس اتنی سی چٹک آئی تھی البتہ لہجہ ابھی بھی دو ٹوک اور غیر

مہم رہا تھا۔

فیضان اس پذیرائی پر الگ غصے میں تھے لیکن چونکہ توقیر صاحب کو انہوں نے ہمیشہ بڑے بھائیوں والا درجہ دیا

تھا سو ان کی بات ماننے ہوئے جب واپس آگئے تھے۔

وہ دونوں لفٹ سے نکل کر پارکنگ کی طرف جا رہے تھے کہ توقیر صاحب نے پوچھ لیا۔

گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے فیضان بری طرح چونکے۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ میرا ولید سے جھگڑا ہوا ہے؟ بلکہ میری تو اس سے

آخری ملاقات بھی بہت دن پہلے ہوئی تھی۔“ فیضان سوچ سوچ کر بول رہے تھے جیسے اس کی اور اپنی آخری

ملاقات یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”اچھا۔“ توقیر صاحب نے ٹھنڈا کما اور خاموش ہو گئے۔ فیضان نے گاڑی اشارت کر کے پارکنگ سے

نکالی پھر سیدھی سڑک پر ڈال دی۔ اس دوران وہ منتظر رہے کہ توقیر صاحب کچھ کہیں گے لیکن ان کی خاموشی کچھ

زیادہ ہی طوالت پکڑ گئی تھی جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہوں۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا تو قیر بھائی!“ فیضان نے ہی خاموشی کو توڑا تھا۔

”یار فیضان! میں سمجھ نہیں پا رہا کہ کس طرح بات کو ایکسپلین کروں۔“ توقیر صاحب نے معذوری ظاہر کی

فیضان اور بھی الجھ گئے۔

”آپ مجھے کانٹھیں کر رہے ہیں آخر ایسی کیا بات ہے۔؟“

”دراصل۔۔۔“ توقیر صاحب نے تمہید باندھنے کے ارادے سے گہری سانس لے کر بات کا آغاز کیا تھا۔

”ولید نے دانیال سے کہا ہے کہ تمہ۔۔۔ اس کے سارے کاروبار پر قبضہ کرنے کے لیے۔ انیہا کو ٹرپ کر رہے

ہو۔“

”کیا۔۔۔“ گاڑی ایک جھٹکا کھا کر رک گئی کیونکہ فیضان کا پاؤں بے ساختہ بریک پر جا پڑا تھا ورنہ سامنے والی

گاڑی سے ٹکراؤ یقینی تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہوئے ہیں

خوبصورت مردوں
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفٹ پیپر

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 225 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لپٹی جدون قیمت: 250 روپے

شکوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”سنبھل کر۔“ توقیر صاحب نے تیزی سے کہا۔ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا دونوں کو اس ٹرانس سے نکلنے میں چند منٹ لگے اس دوران پیچھے ٹریفک کی ایک لائن لگ چکی تھی۔

”پارٹنر شپ ختم کرنے کے لیے اس سے زیادہ گھٹیا بہانہ نہیں بنایا جاسکتا تھا۔“ گاڑی دوبارہ اشارت کرتے ہوئے فیضان نے دانت پیس کر کہا تھا۔

”تم ہانپو مت ہو فیضان! کو کہ میں جانتا ہوں یہ کہنا بھی فضول ہے۔ بات ہی ایسی ہے کہ کسی بھی شریف انسان کی برداشت جواب دے سکتی ہے۔“ توقیر صاحب نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

”میں ایسی گھٹیا بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ آخر دانیال حسن نے یا ولید نے کیا سوچ کر یہ بات کہی ہے۔ ایسی کون سی کجی نظر آئی ان لوگوں کو میرے کردار میں۔؟“

”میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں اسی لیے میں نے دانیال سے کہا کہ ولید کی بات سراسر جھوٹ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے تشویش ہوئی کہ آخر ولید نے ایسی فضول بات کی کیوں ہے۔ آخر اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔“

”اب یہ تو وہی ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں کیا آیا۔ مجھے تو یہ سارا خاندان ہی پاگل لگتا ہے۔“

فیضان نے غصے اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ توقیر صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے غصے کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

”میں نے دانیال کو بھی سمجھایا ہے۔ وہ رات میں تم سے بات کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔“

”مہربانی ان کی۔ بڑا احسان کیا میرے سر پر۔“

”تمہیں اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنا برا لگے گا لیکن بعض اوقات انسان کو ناپسندیدہ کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔“

توقیر صاحب نے گہری سانس بھر کر کہا تھا۔ فیضان کے خون میں جیسے شرارے دوڑ رہے تھے۔ بھلے ہی انہوں نے توقیر صاحب سے کچھ نہ کہا تھا لیکن بہر حال سارا معاملہ تو ان کی سمجھ میں آئی چکا تھا کہ انبیبا کی مہربانی نے کسی نہ کسی کو ان کی نیک نامی پر انگلی اٹھانے کا موقع فراہم کر ہی دیا تھا اور ان کا بس نہ چلتا تھا کہ انبیبا کی گردن ہی دبا دیں۔

”میں نے تم سے کہا تھا اپنے کپڑے استری کرنے کے لیے سلیمہ کو دے دو۔“

نمل نے کچھ خیال آنے پر ماوی سے کہا تھا۔ وہ اسے پرانی تصویروں کا البم دکھا رہی تھی اور تصویریں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ ماوی کی جان اس لقائے میں اچھی تھی جو اس کی الماری کے نچلے خانے میں حفاظت سے رکھا تھا اور جسے کھولنے کا موقع اسے اب تک نہ مل سکا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح کچھ دیر کمرے میں جا کر بیٹھنے کا موقع مل جائے لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی اسے واپس بٹھالیتا تھا۔ ناچار ماوی کو فرصت ملنے کا انتظار کرنا تھا اور اب وہ بڑے محل سے بیٹھی اس وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

بتوی نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح اسے ماوی سے اس کے جلال کے متعلق پوچھنے کا موقع مل جائے۔ ایک آدھ بار جب موقع ہاتھ آیا بھی تو سارے تجسس کے باوجود اسے مناسب لفظ نہ مل سکے تھے۔

”ماوی! تم آج جو سوٹ پہننے والی ہو وہ میں نے اب تک نہیں دیکھا۔“ معا بتوی کو ماوی کو سب کے درمیان سے اٹھانے کا ایک بہانہ سوچ رہی تھی۔

”اؤ۔ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔“ ماوی نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے جلدی سے کہا۔

”تمہیں یہاں سے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کوثر! جاؤ بی بی کے کمرے سے اس کا سوٹ لے آؤ“ تحریمہ بھا بھی نے کہا تھا۔

”نہیں بھا بھی! اسے پتا نہیں چلے گا کہ سوٹ کہاں ہے۔ میں خود نکال لاتی ہوں۔“ اس نے بے جلت اٹھتے ہوئے کہا تھا مبادا موقع ہاتھ سے نکل ہی نہ جائے۔

”میں بھی ساتھ آتی ہوں۔“ بتوی بھی اس کے پیچھے دوڑی تھی۔

وہ دونوں آگے پیچھے ماوی کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”تم بیٹھو۔ میں اپنا ڈریس لے کر آتی ہوں۔“

”رہنے دو ماوی! تمہارا ڈریس تو میں نے دیکھ رکھا ہے۔“

”اس۔۔۔“ ماوی بری طرح حیران ہوئی۔ ”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ۔۔۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ بتوی نے اس کی بات قطع کی تھی۔

”وہ تو میں نے اس لیے کہا تھا کہ تمہارے ساتھ کچھ دیر بیٹھنے کا موقع مل سکے۔ وراصل میں تم سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہاں پوچھو۔“

”نہیں! پہلے تم وعدہ کرو کہ میری کسی بات پر خفا نہیں ہوگی۔“

ماوی ہنس دی۔ ”ہاں بھئی۔ میں خفا نہیں ہوں گی۔ تم پوچھو جو پوچھنا ہے۔“

”وہ وراصل۔“ بتوی کو اس کا لہجہ خاصا حوصلہ افزا لگا تھا۔ ”میں نے شبیہ بھائی اور جلال بھائی کو بات کرتے ہوئے سنا تھا وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ تم جلال بھائی کی منکوحہ ہو۔“

”من۔۔۔ کو۔۔۔؟“ ماوی نے نا سمجھی سے دہرایا۔

”یعنی تم ان کی بیوی ہو۔ نکاح کیا ہے تم نے ان سے۔ میں یہی جانتا چاہ رہی ہوں کہ کیا یہ درست ہے یا مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے؟“ اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔

”جب خود سن ہی لیا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہوں؟ اپنے بھائیوں کی بات پر یقین نہیں ہے کیا؟“

”یہ بات نہیں ہے نمل اور حرم آپا میری بات پر یقین ہی نہیں کر رہیں وہ اتنے وثوق سے میری بات کو رو کرتی ہیں کہ میں خود کنفیو رہ جاتی ہوں کہ جو سنا وہ درست بھی تھا یا میری غلط فہمی تھی۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت سرورق
خوبصورت چمپائی
مضبوط جلد
آفٹ ہینچر

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جیبیں قیمت: 225 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

منکوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ماوی ہونے سے مسکرا دی۔

”ہاں تنوی جو تم نے سنا وہ درست ہے۔ لیکن وعدہ کرو اس بارے میں تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔“

”لیکن کیوں؟“ وہ جو پر جوش ہو کر چیخنا چاہتی تھی اپنی صبیحہ میں پڑ گئی۔

”دراصل میرے حویلی آنے سے پہلے ہی میں اور جلال نکاح کر چکے تھے اور ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ داری ہے یہ تو ہمیں تب پتا چلا جب یہاں حویلی میں ہمارا آنا سامنا ہوا تب ہی میں نے اور جلال نے ڈیسیائیڈ کیا تھا کہ جب تک جلال کو مناسب نہیں لگے گا اور حویلی کے تمام افراد مجھے یہاں کا ایک فرو نہیں سمجھ لیتے نکاح کے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے۔ اب اگر تم نے یہ بات دس کلوز کر دی تو ہم دونوں کے لیے بہت ٹینشن کری ایٹ ہو جائے گی۔ شاید وادی جان اس بات پر بری طرح ری ایکٹ کریں۔ امید ہے تم میری بات سمجھ گئی ہو گی۔“

”تم بے فکر رہو۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ تنوی نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا تھا اور اس کا چہرہ خوشی سے جیسے دمک رہا تھا۔

”لیکن میں بہت خوش ہوں۔ جلال بھائی بہت اچھے ہیں تم بہت لگی ہو ماوی!“

وہ چمکنے لگی تھی۔ اس کی باتیں زیادہ تر جلال کے گرد ہی گھوم رہی تھیں اور اس کا بس نہ چلتا تھا کہ ماوی کو اس کی خوش قسمتی کا یقین دلاوے۔ ماوی بھی پوری توجہ سے اور کبھی بے توجہی سے اس کی باتوں کے جواب دیتی رہی یہاں تک کہ بارات کے آنے کا وقت ہو گیا اور ملازمہ کو ان دونوں کو بلانے کے لیے آنا پڑا۔

ماوی بو جھل قدموں سے اس کے ساتھ چل دی تھی کیونکہ اس لفافے کو کھولنے کا موقع اسے تاحال نہ مل سکا تھا۔



سب لڑکیاں زور و شور سے تیار ہونے میں مصروف تھیں جب اسے اپنے کمرے میں آنے کا موقع میسر آ ہی گیا۔ خود وہ وقت سے بہت پہلے تیار ہو چکی تھی آج اس نے سرخ رنگ کی سیدھی لمبی قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دارپا جامہ پہنا تھا۔ سرخ دہشتہ گردن سے لگاتھا۔ دوپٹے اور قمیص پر بہت باریک سلور کام ہوا تھا۔ میک اپ میں تو اسے مہارت حاصل تھی جبکہ سلکی بالوں کو اس نے ڈھیلے سے جوڑے میں باندھ دیا تھا جو اس کی لمبی گردن پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا کچھ ٹیئیں دانستہ چہرے کے اطراف میں پڑی رہنے دی تھیں۔ اپنے بدلی حسن کے ساتھ اس خالفتا ”دلی حلیے میں وہ بہت سویرا اور اشانلش لگ رہی تھی۔

کمرے میں آتے ہی اس نے بعجلت الماری کھولی اور احتیاط سے لفافہ نکال کر اسے چاک کیا۔ حسب توقع اندر بوسیدہ کاغذ پر خط ہی تحریر کیا گیا تھا۔

وہ خط لیے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی اور جلدی جلدی تحریر پر نظریں دوڑانے لگی۔

بلاشبہ اس کے بابا کی لکھائی شاندار تھی۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ متن سمجھ پاتی عقب سے کسی نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کا وہ بوسیدہ ٹکڑا اچک لیا تھا۔ ماوی سرعت سے پٹی۔ وہ جنت بیگم تھیں اور کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے اسے استہزائیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

ماوی کو اپنے پیروں سے جان نکلتی محسوس ہوئی ثبوت تک پہنچنے کا یہ موقع بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں۔ حیا اور ریحیل۔ ریحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں بنین پھپھو کے بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ بنین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تایا فرقان کے بیٹے وادری مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم میل سے رابطہ کرتی ہے وہاں۔ مجرا احمد اس کی شکایت پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔ وادری کی شادی میں سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کی غرض سے تعارف کرواتے ہیں۔ وہ ولید کے والے دن حیا سے بیہوشی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی حیا کی عزت بچاتا ہے۔ ڈولی اور اس کا دوست پنگی حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتے رہتے ہیں۔ حیا یورپی یونین کی طرف سے ملنے والے اسکالرشپ پر اپنی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے کے ساتھ ترکی جاتی ہے۔ اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں اور ابو ظہبی ایر پورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ ترک لڑکی ہالے ان کو ہر جگہ گائیڈ کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق مسز عبد اللہ حیا اور ڈی جے کی دعوت کرتی ہیں۔ وہاں حیا کو پاشا کے متعلق پتا چلتا ہے۔ حیا جہان کے گھر جاتی ہے۔ جہان سرد مزاجی سے ملتا ہے، تاہم بنین پھپھو بہت محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو سفید پھول ملتے ہیں۔ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان کو حیا کے ساتھ

مکمل ناول



اپنے نکاح کا علم ہے۔ اپنے باپ کے غدار ہونے پر اسے شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات خسب معمول حیا کو ملنے والے سفید پھولوں کے ساتھ کاغذ پر حیا کے دوست مقتسم کو لیموں کا رس لگا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو پیش پہنچاتا ہے تو وہاں ”اے آر پی“ لکھا ہوتا ہے۔ حیا جہان اور ڈی جے جزیرہ بیوک ادا کی سیر پر جاتے ہیں۔ وہاں ایک بنگلے پر اے آر پی لکھا ہوتا ہے۔ ایک بچہ حیا کا پرس چھین کر اسی بنگلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ حیا اس کے پیچھے پیچھے اس بنگلے میں داخل ہو جاتی ہے جہاں اس کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی شو میں پاشا نے پہلی بار حیا کو دکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ سفید پھول بھیجے تھے اور مجرا احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو بنائی تھی۔ مجرا احمد کرنل گیلانی کا بیٹا ہے جسے جہان کے ابا پھنسا کر ترکی چلے گئے تھے۔ پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی حیا کے راستے میں نہیں آئے گا اور اسے اس کا بچہ دے کر جانے دیتی ہے۔ حیا پاشا سے جہان کے ریسٹورنٹ کے لیے مدد مانگتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے جہان کے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت پچھتاتی ہے۔ ترکی میں ڈی جے مر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ حیا اور جہان بھی پاکستان آ جاتے ہیں۔ جہان سے حیا کی والدہ کے علاوہ تمام لوگ سردھری سے ملتے ہیں، تاہم آخر میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

موش کی شادی والے دن بنگی حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا کٹڑی کا ڈبہ دیتا ہے جو ایک پہلی سے کھلے گا اور جب تک وہ کھولے گی ڈولی اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ وہ چھپ چھپ کو ڈھولنے کی حیا بہت کوشش کرتی ہے جہان سے بھی کہتی ہے پھر ترکی لے جاتی ہے۔ ڈبہ کھولنے کے لیے حیا مقتسم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڑیوٹانی مفکر ہر اقلیطس کے کسی فلسفے میں پوشیدہ ہے۔ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کوئی اے اغوا کر لیتا ہے۔ وہاں ایک روسی حیا کے سر پر گرم گرم ویکس ڈالتا ہے اور گرم سلاخوں سے اس کے بازو پر who لکھ دیتا ہے۔ حیا عثمان شہیر کے بیٹے سفیر کو فون کرتی ہے۔ وہ پاشا کو اطلاع دیتا ہے اور حیا وہاں سے پاشا کے بنگلے پر پہنچ جاتی ہے جہاں عائشے اور بہارے اس کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مختلف پسیلوں پر رکھے گئے کوڑو والے وہ ڈبے عائشے اور بہارے بناتی ہیں۔ حیا کے اغوا سے سب بے خبر ہیں سوائے مجرا احمد کے۔ مجرا احمد حیا کو بتا دیتا ہے کہ وہی بنگی ہے اور ڈبے پر پسیلیاں بھی وہی لکھتا ہے۔ جہان حیا سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور روحیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ روحیل سے تصدیق کرتی ہے۔ وہ اقرار کر لیتا ہے کہ جہان کو گولی لگی تھی اور اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ ارم کی ممکن ہو جاتی ہے۔ عائشے اور بہارے کی غیر موجودگی میں حیا پاشا کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے۔ اسی وقت پاشا کا فون آتا ہے اور اس کے کمرے میں جانے پر حیا کو ڈانٹتا ہے۔

قسط ۷

”میرا۔۔۔ سمندر۔۔۔ نمکین پانی۔“

عائشے نے مسکرا کر ان کو دیکھتے ہوئے چہرہ اپنے سیپ کے ایک طرف رکھا۔

”ہاں تو بہارے! وہ کیا چیز ہے جو پانی کے اندر ایک صندوق میں ریت کے ذرے سے بنتی ہے؟“

”جی۔۔۔ حیا۔۔۔ وہ مٹی کے ذرے سے بنتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور اس کا صندوق جب قتل کیا جاتا ہے تو۔۔۔“

چہرا گھونپ کر قتل۔۔۔ وہ جوش سے بے ربط جملے بولتی عائشے کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جو ایک چاندی سے چمکتے سیپ میں چہرا چلا رہی تھی۔ سیپ کا خول چٹا۔ عائشے نے کتاب کی طرح سے اسے کھولا۔ اندر دم توڑتے جانور۔ ایک سفید موتی جگمگا رہا تھا۔

”موتی۔۔۔ پرل۔۔۔ پورے پانچ حروف۔۔۔“ بہارے خوشی سے چلائی اور پھر جلدی جلدی ڈبے کے کوڑیوٹانی

سلائیڈز اوپر نیچے کرنے لگی۔ وہ اب اس پر Pearl لکھ رہی تھی۔

حیا اور عائشے بے اختیار اپنا کام چھوڑ کر آگے ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ جیسے ہی بہارے آخری حرف ”پرل“ سامنے لائی ملک کی آواز کے ساتھ باکس کے سائیڈ سے دراز باہر کو کھلی۔ حیا کی توقع کے برعکس وہ باکس اوپری ڈسکن کے بجائے سائیڈ کی دراز سے کھلتا تھا۔

دراز میں سیاہ مخملیں کپڑا بچھا تھا اور اس پر ایک نازک سائیکلس رکھا تھا۔ نیکلس دراصل ہلیٹنم کی زنجیر تھی۔ جس پر ہر دو کڑیاں چھوڑ کر ننھے ننھے ہیرے لٹک رہے تھے۔ زنجیر کے بالکل وسط میں ہیرے کے بجائے تین کڑیاں لٹکتی تھیں۔ جن کے آخر سرے پر ایک سفید موتی پرویا ہوا تھا۔

وہ تینوں مبہوت سی اس پیش قیمت جگمگاتے ہوئے نیکلس کو دیکھ رہی تھیں۔

”بہارے! یہ تو وہی موتی ہے جو تمہاری سیپ سے نکلا تھا۔ جو تم نے عبدالرحمن کو دے دیا تھا۔“ عائشے ششدر سی اس موتی کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”ہاں یہ تو وہی ہے۔ عبدالرحمن نے وہ مجھے گفت کر دیا۔“

”اور وہ بھی اتنے خوب صورت انداز میں۔“ حیا بس اتنا ہی کہہ سکی۔ اسے اس تحفے اور اس تحفے کو دینے کے انداز نے بہت متاثر کیا تھا۔

بہارے نے اپنی منھنی انگلیوں سے نیکلس اٹھایا اور گردن سے لگایا۔ پھر چہرہ اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔

”یہ کیسا لگ رہا ہے؟“ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

”بہت پارا۔“

”عبدالرحمن نے مجھے کتنا پارا گفت دیا ہے۔ اللہ اللہ مجھے یقین ہی نہیں آرہا۔“ وہ اپنے پرس سے آئینہ نکال کر اب ہر زاویے سے اس کو اپنی گردن سے لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔

”تم عبدالرحمن کو ضرور تھینک پو کرنا۔“

”اللہ! اللہ!“ بہارے کی خوشی بیان سے باہر تھی۔ ”حیا! میں تم سے بھی خوب صورت لگ رہی ہوں، ہے نا۔“

”ہاں! تم مجھ سے بھی خوب صورت لگ رہی ہو۔“ وہ مسکرا کر اسے تسلی دیتی سیپ کے خول اٹھانے لگی۔ ابھی اسے پوری مالا پائی تھی۔

”حیا! تم میری تصویر کھینچو۔ میں اسے سر پہ کراؤں کی طرح پہنتی ہوں۔ کیونکہ میں پرس ہوں۔“ وہ نیکلس اپنے سر پہ تاج کی طرح پہنے اٹھ کر ساحل پہ جا کھڑی ہوئی۔ اس نے وہ تحفہ دو ڈھائی ماہ بعد کھولا تھا۔ سو آج اس کا دن تھا۔

”دھیان سے بہارے! ہوا تیز ہے۔“ سمندر کی طرف پشت کیے کھڑی بہارے نے عائشے کی بات نہیں سنی تھی۔ حیا نے موبائل نکال کر کیمرا آن کیا۔

پھر موبائل چہرے کے سامنے لا کر بہارے کو فوکس کیا۔

”پرس! اب تم ذرا مسکراؤ۔“

بہارے بڑے معصوم انداز میں مسکرا دی۔ اسے بے اختیار بیوک ادا کے بازار میں سڑک کے وسط میں کھڑی بہارے یاد آئی۔ جس کے گرد سیاحوں کا جمعگھٹا لگا تھا۔ ریڈ کاربٹ شو پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ساتھ پانی بھی۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کسی کی کچھ بھی سمجھ میں آتا، بہارے کے سر سے نیکلس اڑتا ہوا پانی میں جا گرا۔ وہ بوکھلا کر پٹی اور پھر اس کی چیخیں ہر سوبند ہوئیں۔

حیا تیزی سے اٹھی۔ گود میں رکھی لڑی گر گئی۔ سمیوں کے خول بکھر گئے۔ وہ بھاگ کر پانی میں آئی۔ بہارے چیختی ہوئی پانی میں ہاتھ مارتی اپنا نیکلس تلاش کر رہی تھی۔ جو لہر اس کا نیکلس پھین کر لے گئی تھی۔ وہ واپرا، جارہی تھی۔ حیا ننگے پیر بھاگتی ہوئی لہر

کے پیچھے گئی۔ مگر پانی جیت گیا، لہریٹ گئی۔ ہار پانی میں گم ہو گیا۔ ہمارے نور، نور سے روتے ہوئے جی رہی تھی۔

”میرا نیکلس۔ حیا۔ میرا نیکلس۔“ عائشہ پیچھے سے اسے بازوؤں میں لیے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ کسی بے آب مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے خود کو چھڑا رہی تھی۔

”حیا۔ آگے مت جاؤ۔ پانی گہرا ہے۔ وہ گم جائے گا۔“ عائشہ اسے آوازیں دے رہی تھی۔ مگر وہ سب کچھ بھلائے بیوک او کی شہزادی کا تاج ڈھونڈ رہی تھی۔ ساحل کی گیلی ریت، پانی، سمندر، وہ پانی میں ہاتھ مارتی پوری طرح بھگ چکی تھی، مگر نیکلس کیس نہیں تھا۔ اس نے تھک کر اپنے عقب میں دیکھا، جہاں عائشہ بمشکل آنسو روکے، تڑپتی، بلکتی ہمارے کو پکڑے کھڑی تھی۔

”عائشہ! میرا نیکلس۔ عائشہ! مجھے نیکلس واپس لا دو۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونی عائشہ کے بازو خود سے ہٹانے کی سعی کر رہی تھی۔

نیکلس وہاں کیس بھی نہیں تھا۔ اسے نمکین گہرائی واپس اپنے اندر لے گئی تھی۔ ہمارے کی زندگی کا پہلا اور واحد موتی اس سے کھو گیا تھا۔

”ہمارے! میں نے بہت ڈھونڈا مگر دیکھو، جو اللہ کی مرضی۔“ وہ واپس آئی اور اپنے گیلے ہاتھوں میں ہمارے کے ہاتھ تھام کر کہا۔ ہمارے کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ گردن اوڑھ کر ہار پانی چلی جا رہی تھی۔

”مجھے نیکلس واپس لا دو۔ کوئی مجھے نیکلس واپس لا دو۔“ وہ انگریزی اور پھر ترکی میں ایک ہی بات دہرائی بلک بلک کر رہی تھی۔

حیا کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا پڑ گیا۔ اسے لگا وہ خود بھی ابھی رو دے گی۔ وہ بمشکل لب بھینچ کر ضبط کیے ہوئے تھی۔ پا کر کھودینے کا دکھ وہ پہچانتی تھی۔ جب اس کا جگر برید ہاؤس ٹوٹا تھا۔ جب استقلال اسٹریٹ کی اس شاہ میں ڈی جے سر پکڑ کر گر گئی

تھی پا کر کھودینے سے بڑا کرب کوئی نہیں ہوتا۔ اس شام وہ دونوں بمشکل ہمارے کو سنبھالتی، گھر واپس لائی تھیں اور اب لوگ روم میں بڑے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ یوں کہ ہمارے درمیان میں تھی اور اسے حیا نے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی اور کھڑکیوں کے پار اندھیرا اتر آیا تھا۔ آتش دان میں مصنوعی لکڑیاں بھڑک رہی تھیں۔ ہمارے اسی طرح بوئے جا رہی تھی۔ اس کے پاس آنسوؤں کا مرمر تھا جو ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

”ہمارے! میں تمہیں اور نیکلس لا دوں گی۔“ وہ اپنے اپنے ساتھ لگائے بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مگر وہ ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ نفی میں سر ہلاتی روئے جا رہی تھی۔

”بالکل اس جیسا لا دوں گی۔ پرامس!“

”مگر وہ عبد الرحمن کا گفٹ نہیں ہو گا۔“

”عبد الرحمن تمہیں خود ویسا ہی نیکلس گفٹ کرے گا۔ میں اسے کہوں گی۔“

”مگر اس میں میرا موتی نہیں ہو گا۔ عائشہ۔“

”وہ روتے روتے اپنی ماں کو یاد کرتی، تو مجھے عائشہ کو پکارتی۔ عائشہ سر گھٹنوں پر رکھے مغموں سی بیٹھی تھی۔“

”تمہارا جب دوبارہ موتی نکلے گا تو میں اسے نیکلس میں پرو دوں گی۔“ مگر ہمارے اس کی کوئی بات نہیں مان رہی تھی۔ اس کے لیے اس نیکلس کا متبادل کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر شے کا متبادل نہیں ہوا کرتا۔

”ہمارے! اب بس کرو۔“ جب وہ سر پٹخ کر مزید بلند آواز میں رونے لگی تو عائشہ نے برہمی سے ڈانٹا۔ ”وہ کب سے تمہیں منارہی ہے اور تم ہو کہ بد تمیزی کیے جا رہی ہو؟“

جواباً ”ہمارے نے غصے اور پانی سے بھری آنکھوں سے عائشہ کو دیکھا۔“

”تم میں ہو عائشہ۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ عبد الرحمن مجھے گفٹ دے۔“

”ہا؟“ عائشہ ہکا بکا رہ گئی۔ ”میں۔ میں ایسی ہوں؟ تمہیں پتا ہے ہم کیا کہہ رہی ہو؟“

”ہاں تم میں ہو۔“ وہ آگے بڑھ کر اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں سے عائشہ کے گھٹنے۔ کئے مارنے لگی۔ حیا نے پیچھے سے اسے بازوؤں میں گیتے ہوئے ہٹایا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ عائشہ رو ہانسی ہو گئی۔

”تم۔ تم لڑ رہی تھیں عبد الرحمن سے۔ وہ اسی لیے انڈیا چلا گیا ہے، کیونکہ تم اس سے لڑ رہی تھیں۔ تم نے اسے تھپڑ بھی مارا تھا اور تم نے اس سے کہا تھا کہ وہ ہمارے گل سے بے تکلف نہ ہوا کرے۔ وہ تمہاری وجہ سے یہاں سے گیا ہے۔ میں نے خود دیکھا تھا سوراخ سے۔“

عائشہ کا چہرہ یک دم سرخ پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بہت سے زخم ابھرے۔

”سنو ہمارے!“ وہ آگے بڑھی اور ایک دم بے حد جارحانہ انداز سے ہمارے کے کندھے دلوچ کر اس کا چہرہ سامنے کیا۔

”عبد الرحمن ہمارا نہیں ہے اور وہ جلد یا بدیر ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جائے گا۔“

”تم گندی ہو تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

”میں جھوٹ نہیں بولتی، میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ اب میری بات غور سے سنو۔“ اس نے غصے سے ہمارے کو جھٹکا دیا۔ ”عبد الرحمن مر گیا ہے ہمارے لیے۔“ ایک جھٹکے سے اس نے ہمارے کے کندھے چھوڑے اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اوپر چلی گئی۔

ہمارے کے آنسو ایک دم سے رک گئے۔ وہ بالکل ساکت و جامد ہو چکی تھی۔ لب آپس میں پیوست کیے، وہ گویا سانس روکے بیٹھی تھی۔

”ہمارے!“ اس نے تاسف سے اسے پکارا۔ وہ ایک دم اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ان کے مشترکہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا اور ہمارے بیڈ پر چت لیٹی نظر آرہی تھی۔ ابھی اسے چھینٹنا مناسب نہیں تھا۔ سو وہ عائشہ کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

عائشہ چھت پہ تھی۔ وہ ٹیرس کی ریلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے پیچھے کھلا سیاہ آسمان تھا اور نیچے جدی کے اونچے پولر کی مدھم بتیاں۔ اندھیرے میں بھی وہ اس کے سیاہ اسکارف میں دکتے چہرے پہ لڑھکتے آنسو دیکھ سکتی تھی۔ اسے بے اختیار ڈی جے یاد آئی، جب وہ ان سے ناراض ہو کر اسٹڈی میں چلی گئی تھی۔

”عائشہ!“ وہ دکھی دل سے کہتی اس کے ساتھ آ بیٹھی اور ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما۔ عائشہ نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ وہ بس اپنے گھٹنوں کو دیکھتی بے آواز روئے گئی۔

”عائشہ! یوں مت روؤ۔ وہ بچی ہے۔ اس نے یوں ہی کہہ دی وہ بات۔ مجھے پتا ہے ہم کسی سے نہیں لڑ سکتیں۔“

”ہمارے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں واقعی عبد الرحمن سے لڑی تھی۔ مگر صرف اس وقت جب میں بہت پریشان تھی۔ لیکن وہ میری وجہ سے واپس نہیں گیا۔ وہ ہماری وجہ سے کچھ نہیں کرتا۔ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ لیکن میں کیا کرتی؟ مجھ سے آنے کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔“

”کیا ہوا آنے کو؟“ عائشہ نے بھگی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا تمہیں عبد الرحمن نے بتایا ہے کہ اس کا ایک بھائی بھی ہے؟“

”نہیں!“ وہ بری طرح سے چونکی۔

”میں اور ہمارے اپنے والدین کے ساتھ اناطولیہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک سال پہلے ہمارے والدین کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تو ہماری سب سے قریبی عزنہ، یعنی ہماری دادی (آنے) ہمیں

ادھر لے آئیں۔ یہ گھر آنے کا اپنا نہیں تھا۔ یہ گھر آنے کے شوہر کے بھائی کی ملکیت تھا۔ بعد میں یہ نسل در نسل چلتا میرے باپ اور پھر مجھ تک آیا۔ آنے کے دونوں بیٹوں نے اس سے اپنا حصہ نہیں لیا۔ سو آنے نے قانونی کارروائی کے بعد اسے میرے نام کر دیا۔ جب ہم یہاں آئے تھے تب یہاں صرف آنے اور عبدالرحمن رہتے تھے مگر مجھے یاد تھا کہ آنے کا ایک اور بیٹا بھی تھا۔ تب آنے نے بہت دیکھ سے بتایا کہ ان کا وہ سرا بیٹا ہمارے آنے سے چند ماہ قبل گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیوں کیسے عبدالرحمن لا علم تھا۔ مگر آج سے تین ماہ قبل مجھے کسی نے بتایا کہ وہ عبدالرحمن کے آفس میں جاتے دیکھا گیا ہے اور یہ کہ وہاں سے کسی جھگڑے کی آواز آرہی تھی۔ تب میں عبدالرحمن سے بہت لڑی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بھائی کدھر ہے۔ مگر اس نے ہم سب سے جھوٹ بولا۔ آنے کو تو ابھی تک نہیں معلوم کہ عبدالرحمن اس کے بارے میں جانتا ہے۔

”مگر اس کا بھائی کہاں گیا؟“

”یہی تو میں نے عبدالرحمن سے پوچھا تھا۔ مگر وہ کسی بات کا ٹھیک جواب دے تب نا۔ وہ کہتا ہے اس نے اپنے بھائی کو نہیں نکالا وہ خود سب کچھ چھوڑ کر گیا ہے۔ پہلے تو ان دونوں کی بہت دوستی تھی۔ عبدالرحمن پانی کی طرح اس پہ پیسہ بہایا کرتا تھا۔ پھر ایک دم سے وہ کیوں سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ آنے اس کو بہت یاد کرتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے ان کے لیے کچھ کروں۔“

”تم نے دیکھا ہوا ہے ان کے دوسرے بیٹے کو؟“

”جب میں گیارہ سال کی تھی تب آخری بار اسے اپنے سامنے دیکھا تھا۔ پتا نہیں وہ اب کہاں ہو گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ استنبول میں ہی ہے۔ مگر ہوٹل گرینڈ میں عمومی تاثیر یہی ہے کہ وہ یونان چلا گیا اور وہاں پہ ہوٹل گرینڈ کی چین میں کام کر رہا ہے۔ مگر

یقین مانو یونان میں ہمارے ہوٹل کی کوئی شاخ نہیں ہے۔“ وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ مگر اس کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

”عائشہ! تم اور ہمارے عبدالرحمن کی اتنی تعریفیں کرتے ہو میں نے تم سے کبھی یہ نہیں کہا۔ مگر آج مجھے یہ کہنے دو کہ وہ استنبول میں خاصا بدنام ہے۔ لوگ اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔“

”میرا دل ان باتوں کو نہیں مانتا۔ لوگ مجھے بھی آکر یہ باتیں کہہ دیتے ہیں مگر میں جانتی ہوں کہ وہ بہت اچھا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ واقعی بہت اچھا ہے۔ بس اس نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت غلط کیا ہے۔“ وہ عائشہ کی بات نہیں سن رہی تھی۔ اس کا دل غ اسی ایک نکتے پہ مرکوز ہو گیا تھا۔ عبدالرحمن پاشا کا ایک کشیدہ بھائی۔ کوئی بھی شخص یوں ہی اتنا برا بزنس چھوڑ کر نہیں جاتا۔ کوئی تو بات تھی۔ بالآخر اسے عبدالرحمن کی ایک کمزوری مل گئی تھی۔

”اب آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔“

”حیا۔ حیا۔“ صبح وہ عائشہ کے زور زور سے چلانے پہ ہڑبکا کر اٹھی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پریشانی سے عائشہ کو دیکھا۔ جس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”ہمارے گھر۔ نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ ساری میری غلطی ہے۔ میں نے کل اسے ڈانٹا تھا۔“ عائشہ بس رو دینے کو تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے بستر سے نکلی تھی۔

باہر کھڑے گارڈ نے بتایا کہ اس نے ہمارے کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔

”وہ پچھلے دروازے سے نکلی ہوگی۔ اس گھر میں ایک پچھلا دروازہ بھی ہے۔ عبدالرحمن کی عینایات۔ وہ ہر شے میں بیک ڈور رکھتا ہے۔“ عائشہ سختی سے

برہناتی اس کے ساتھ باہر نکلی۔

”عائشہ! مجھے پتا ہے وہ کدھر ہوگی۔“ اسے یقین تھا کہ وہ سمندر پہ گئی ہوگی۔

جب وہ اس ویران ساحل پہ پہنچی تو وہ انہیں دور سے ہی نظر آئی۔ وہ وہیں اس پتھر پہ بیٹھی تھی جہاں وہ تینوں کل چٹائی ڈالے بیٹھی تھیں۔ اس کے ہتھکڑیاں بال ہوا سے اڑ رہے تھے اور وہ خالی خالی نگاہوں سے سامنے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیپ اور دوسرے میں چھرا تھا۔

”ہمارے! عائشہ! مشکل آنسو روکتی بھاگتی ہوئی ہمارے کے گلے لگ گئی۔“ تم ایسے کیوں آگئیں؟ میں اتنی پریشان ہو گئی تھی۔“

ہمارے نے ویران سی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر ہاتھ میں پکڑی سیپ عائشہ کے سامنے کی۔

”عائشہ! میرا سیپ پھر خالی نکلا۔“ اس نے بہت دکھ سے سیپ کھول کر دکھائی۔

”تم میرے سارے موتی لے لیتا میں انہیں اب بازار میں نہیں بیچوں گی تم حیا کے تینوں موتی بھی لے لیتا جو اس کے کرن کے نکلے تھے۔ مگر اب تم روو گی نہیں۔“

”نہیں عائشہ! ہمارے نے نفی میں سر ہلایا۔“

”میرا موتی کھو گیا ہے وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔“

حیا ہمارے کے سامنے دوڑا تو ہو کر بیٹھی اور اس کے گیلے ہاتھ تمام کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگی۔

”خیزس وقتی ہوتی ہیں ٹوٹ جاتی ہیں بکھر جاتی ہیں۔ رویے دائمی ہوتے ہیں۔ صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی۔ جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور آج تم نے ایک کھوئے ہوئے موتی سے ہار مان لی؟“

ہمارے نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ جیسے کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

”اپنے دکھ میں دوسرے کا دل نہیں دکھاتے ہمارے! میں تمہیں بالکل ویسا ہی نیکلس لادوں گی پر اس!“

اور پھر شام میں اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے اس نے عائشہ سے کہا کہ جب عبدالرحمن کا فون آئے وہ اسے بتائے سو جب اس کا فون آیا تو عائشہ نے کارڈلیس اسے تھما دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

”السلام علیکم! وہ بہت دھیمی آواز میں بولی تھی۔“

”و علیکم السلام۔ خیریت؟“ وہ جیسے بہت حیران ہوا تھا۔

”جی۔ وہ مجھے کچھ کام تھا۔“ اسے یاد تھا کہ آخری دفعہ اس نے جب عبدالرحمن کو کام کہا تھا تو اس کا نتیجہ بہت بھانک نکلا تھا۔ مگر اب وہ اسے ایک اور موقع دے رہی تھی۔

”کہیے۔ آپ کو ہم سے بات کرنے کا خیال صرف کام کے وقت ہی آتا ہے مگر کہیے۔“

دل تو اس کا چاہا کہ فون دیوار پہ دے مارے مگر برداشت کر گئی اور ساری بات کہہ سنائی۔ آخر میں بولی۔

”آپ مجھے اس شاپ کا نام بتا سکتے ہیں جہاں سے آپ نے وہ نیکلس لیا تھا؟“

”وہ میرا گفٹ تھا۔ سو مجھے ہی دوبارہ لینا چاہیے لیکن چونکہ میں ابھی ملک سے باہر ہوں تو میرا بندہ اس شاپ کے واؤچرز آپ کو دے جائے گا۔ آپ جو اہر کی اس شاپ سے وہ نیکلس خرید کر ہمارے کو دے دیجیے گا۔ السلام علیکم۔“

بے لچک اور خشک انداز میں کہہ کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ حیا نے ایک متنفر نگاہ کارڈلیس پہ ڈالی اور تہہ کیا کہ آئندہ وہ کبھی اس شخص سے دوبارہ بات کرنے کی زحمت نہیں کرے گی۔

اس کا خیال بہت جلد غلط ثابت ہونے والا تھا۔

ہوٹل گریڈ کا ملازم واؤچر لے کر آیا۔ مگر تب جب وہ تینوں استنبول جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ عائشہ کو بینک میں کوئی کام تھا۔ سو وہ اور ہمارے اس کے ہمراہ چل رہی تھیں۔ جیانیے واؤچر لے کر کمرے میں رکھے۔ مگر فیری کے لیے روانہ ہوتے وقت وہ انہیں اٹھانا بھول گئی۔ سو استنبول آکر وہ جواہر نہیں گئی۔ نیکلس پھر کبھی خرید لے گی، کیونکہ اس میں پروتا تو ہمارے کاموتی ہی تھا جو جانے کب نکلے، مگر سیاحتی کے ڈورم میں جا کر وہ اپنا پزل باکس ضرور اٹھا لائی تھی۔ وہ صبح کی کلاسز کا ٹائم تھا اور ڈورم خالی پڑا تھا۔ سونہ وہ کسی سے خود ملی نہ ہی کسی سے سامنا ہوا۔

پزل باکس اور چند ضروری چیزیں لے کر جب وہ باہر آئی تو عائشہ کے کاموں میں اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ استقلال اسٹیٹ جاسکتی۔ وہ دوپہر تک ہی واپس آگئے۔ اپنا پزل باکس اس نے احتیاط سے الماری میں کپڑوں کے نیچے رکھا۔ اب اس نے جلد از جلد اسے کھولنا تھا۔

رات وہ عائشہ اور ہمارے کے سونے کے بعد پزل باکس نکال کر وہ قدیموں میں چلتی باہر آئی۔ اس کا رخ بچن کی طرف تھا۔

کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑے اس نے کوڈ بار کی سلائیڈز اوپر نیچے کرنا شروع کیں۔ پہلے اس نے Ayeshe لکھا، مگر باکس جامد رہا۔ اسے یہی توقع تھی۔ یقیناً "باکس لیتے ہی خریدار نے پاس ورڈ بدل دیا ہوگا۔ پھر اس نے yangin لکھا جو "آگ" کو ترکی میں کہتے ہیں۔ باکس جوں کا توں رہا۔ اسے یہی امید تھی۔ اب اسے وہ کرنا تھا جس کی طرف ہراقلیطس کا قول اشارہ کر رہا تھا۔ آگ، اصلی والی آگ۔

اس نے ماچس اٹھائی، اور تیلی سلگا کر باکس کے قریب لائی، مگر آنچ لکڑی کو سیاہ کرنے لگی اور شعلہ تیلی کو کھاکر اس کی انگلی تک پہنچنے لگا تو اس نے جھنجھلا کر تیلی چھینکی۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہی، پھر باکس کیے باہر آئی۔

لوٹک روم کا آتش دان سرد پڑا تھا۔ اس نے تاب پھیر کر آگ لگائی تو مصنوعی لکڑیوں والا بیڑ جل اٹھا۔ باکس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس جگہ کے قریب لائی جہاں صرف دیکتے انگارے تھے۔ شعلے نہ تھے۔ بیڑ کی تپش اس کی انگلیوں کو چھونے لگی۔ وہ ضبط کر کے باکس پکڑے بیٹھی رہی۔ بار بار نگاہوں کے سامنے وہ تکلیف دہ رات ابھرتی۔ الاؤ کھولتا مائع، وہ بکری سلاخیں۔ اس نے سر جھٹک کر توجہ پزل باکس کی طرز مرکوز کی۔ اس نے اسے ذرا ترچھا پکڑ رکھا تھا۔ یوں کہ اس کی دو اطراف انگاروں کے سامنے تھیں۔ جو طرف ذرا زیادہ سامنے تھی۔ اس پہ حروف ابھرنے شروع ہو گئے تھے۔

حروف۔ بلکہ الفاظ۔ فقرے۔ اس نے حیرت سے باکس کی اس سائیڈ کو دیکھا جس کا رنگ تپش کے ساتھ سیاہ ہو رہا تھا اور اوپر سنہری سے الفاظ ابھر رہے تھے۔ وہ شاید لاشعوری طور پر کسی چھ حروف لفظ کی توقع کر رہی تھی، مگر یہاں تو۔ جیانیے باکس آگ سے ہٹا کر دیکھا۔ اس پہ لکھے دو فقرے واضح تھے۔ وہ کوئی نظم، شعر تھا۔

Marked on Homers doubts
A Stick with twin sprouts
(ہومر کے شبہات پہ نشان زدہ ایک چھڑی جس کی دونوں کیس ہوتی ہیں۔)

وہ ابھی ان الفاظ پہ ٹھیک سے الجھ بھی نہ سکی کہ اس کی نگاہ اس سیاہ ہوتی طرف سے متصل طرف پہ پڑی۔ جو ذرا سی تپش اس جگہ کو ملی تھی، اس نے وہاں چند ادھورے حروف ظاہر کیے تھے۔ جیانیے وہ طرف آگ کے سامنے کی۔ ادھورے الفاظ مکمل ہو کر ایک شعر میں ڈھل گئے۔

Around the emerald crusified
And the Freedom Petrified
(مصلوب زدہ زمرہ اور ٹھہری ہوئی آزادی کے گرد۔)

کسی احساس کے تحت اس نے تیسری متصل دیوار

کو آنچ دکھائی۔ باکس کی تیسری طرف بھی کسی جادوئی اثر کی طرح سیاہ پڑنے لگی اور اوپر جیسے کوئی ان دیکھا قلم سنہری روشنائی سے لکھنے لگا۔

Snapped there a bloody pine
Split there some tears divine
(ادھر خون میں ڈوبا صنوبر چٹخا تھا اور آفاقی آنسو بکھرتے تھے۔)

اب کوڈ بار سے متصل دو دیواریں اور تیسری جو کوڈ بار کے بالکل متوازی تھی، حروف سے بھری جا چکی تھیں۔ باقی اوپر ڈھکن کی سطح جہاں ہراقلیطس کا قول لکھا تھا، اب بھی گئی تھی یا پھر خالی طرف۔ اس نے دونوں کو آنچ دکھائی، مگر کچھ نہ ہوا۔ اب صرف کوڈ بار والی طرف بچی تھی۔ جیانیے احتیاط سے اس کو انگاروں کے قریب گیا۔ جیسے جیسے تپش لکڑی کو چھوتی گئی کوڈ بار کے چھ چوکھٹوں کے اوپر ایک شعر ابھر گیا۔

A Love lost in symbolic smell
Under which the lines dwelt
(ماستی خوشبو میں ایک پیار کھو گیا جس کے نیچے بریں رہتی ہیں۔)

پزل باکس کا آخری شعر۔ آٹھ مصرعوں کی نظم مکمل ہو گئی تھی۔ اب یہ نظم کس طرف اشارہ کر رہی تھی۔ یہ اس کو ابھی سوچنا تھا۔

پہلی بار اسے بری طرح سے معصوم کی کمی محسوس ہوئی تھی۔



ہمارے پھول چننے کے لیے مٹی تھی اور اب نیچے درختوں میں ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ نیکلس کا غم اب تک اسے بھول بھال چکا تھا۔ وہ عائشہ کے ساتھ ایک درخت تلے چٹائی پہ بیٹھی اس کی بدایت کے مطابق ہاتھ میں پکڑے لکڑی کے ٹکڑے کو تراش رہی تھی، سہ پہر کی نرم سی دھوپ، سرخ صنوبر کے درختوں سے چھن چھن کر ان پہ گر رہی تھی۔

ایک پزل باکس بنانے کے لیے پانچ سو سات (507) لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے درکار ہوتے تھے۔ خاصا محنت طلب کام تھا۔ عائشہ نے اناطولہ کے ایک گاؤں میں کسی معمر چینی کاری گر سے یہ فن سیکھا تھا۔

”تمہیں واؤچر ز منگوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ عبدالرحمن کی تو قیمتی تحائف دینے کی عادت ہے۔ یوں ہی ہمارے کی عادتیں بگڑتی جائیں گی۔“

اس کی بات پہ جیانیے میراٹھایا۔ اس نے ڈھیلی چوٹی باندھ کر آگے کو ڈال رکھی تھی اور چند لمحوں کے اندر اس کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔

”میں تو اپنی طرف سے دینا چاہتی تھی۔ مگر اس نے میری پوری بات ہی نہیں سنی۔ اب لے ہی آیا ہے تو واپس کیا کرنا۔“ وہ سر جھٹکا کر رندا لکڑی کے ٹکڑے پہ آگے پیچھے رگڑنے لگی۔ لکڑی کے باریک رول شرہ چس سے نیچے گر رہے تھے۔

”اور ہاں ہمارے نے تمہارے لیے کچھ خریدا تھا۔ اسے لگا اس نے تم سے اس دن بہت بد تمیزی کر دی تھی۔“

”چھا؟ کیا خریدا ہے؟“ وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی۔

”ایک ریشی اسکارف ہے۔“

”مگر میں تو سر پہ اسکارف نہیں لیتی۔“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر پچھتائی، کسی کے تحفے کے لیے ایسے تو نہیں کہنا چاہیے۔

”کوئی بات نہیں، ہم گردن میں لے لیتا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرا کر دوبارہ رندا لکڑی پہ رگڑنے لگی۔

”تمہیں پتا ہے عائشہ! جب میں چھوٹی تھی تا دس گیارہ سال کی تب مجھے اسکارف پہننے کا بہت شوق تھا۔ میرے ابا اور تاپا فرقان دونوں مجھے اکثر سر ڈھانپنے کو کہا کرتے تھے۔ انہیں ایسے بہت اچھا لگتا تھا۔ میری اماں بھی چاہتی تھیں کہ میں سر ڈھکا کروں، تاکہ میرے چہرے پہ نور آجائے اور میں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب

ہو جاؤں انہوں نے مجھے قرآن حفظ کرنے کے لیے ایک اسلامک اسکول میں بھی داخل کرایا، مگر میں وہاں سے تیسرے روز ہی بھاگ آئی۔ تب میرا اسکارف پہننے کا بہت دل چاہتا تھا۔
”تو کیوں نہیں لیا؟“

جواباً ”جیانے دھیرے سے شانے اچکائے۔“
”مجھے آہستہ آہستہ سمجھ آگئی کہ میرا فیس کٹ ایسا ہے کہ میں اسکارف میں اچھی نہیں لگوں گی۔“ وہ کہہ کر سر جھکائے کام کرنے لگی۔ عائشہ اسی طرح ہاتھ روکے اس کو دیکھ رہی تھی۔
”کس کو؟“

”ہاں؟“ اس نے نا سمجھی سے سر اٹھا کر عائشہ کو دیکھا۔

”تم کس کو اسکارف میں اچھی نہیں لگوں گی؟“
”لوگوں کو۔“

”اور؟“
”اور کمرے کو۔ مثلاً“ تصویروں میں۔“
”اور؟“

”اور خود کو۔“
”اور اللہ تعالیٰ کو؟“ عائشہ دھیرے سے مسکرائی۔
اس کی سبز آنکھیں نرم دھوپ میں سنہری لگ رہی تھیں۔ ”ہو سکتا ہے تم اللہ تعالیٰ کو اسکارف میں بہت اچھی لگتی ہو۔“ وہ ایک دم بالکل سن ہوئی عائشہ کو دیکھے گئی۔

”تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا جیا! کہ میں ہر وقت اسکارف کیوں پہنتی ہوں۔“ عائشہ سر جھکائے لکڑی کے ٹکڑے کا کنارہ تراشتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”میں تمہیں بتاؤں، میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں وہ خوب صورت ملبوسات پہنوں جو بیوک ادا میں استنبول یا اٹلی اور اسپین کی لڑکیاں پہن کر آتی ہیں۔ بالکل جیسے ماڈلز پہنتی ہیں اور جب وہ اونچی ہیل کے ساتھ ریمپ پہ چلتی آرہی ہوتی ہیں تو ایک دنیا ان کو مسحور ہو کر دیکھ رہی ہوتی ہے۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں بھی ایسے اسارٹ اور ٹرینڈی ڈیزائنڈ لباس پہن کر

جب سڑک پہ چلوں تو لوگ مسحور و متاثر ہو کر مجھے دیکھیں۔ لیکن۔۔۔“ وہ سانس لینے کو رکی، حیا بنا پلک جھپکے، سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

”لیکن۔۔۔ پھر مجھے ایک خیال آتا ہے۔ یہ خیال کہ ایک دن میں مر جاؤں گی، جیسے تمہاری دوست مر گئی تھی اور میں اس مٹی میں چلی جاؤں گی، جس کے اوپر میں چلتی ہوں۔ پھر ایک دن سورج مغرب سے نکلے گا اور زمین کا جانور زمین سے نکل کر لوگوں سے باتیں کرے گا اور لال آندھی ہر سو چلے گی۔ اس دن مجھے بھی سب کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ تم نے بھی اوپیکس کے وہ اسٹیڈیمز دیکھے ہیں جن میں بڑی بڑی اسکرینز نصب ہوتی ہیں؟ میں خود کو ایک ایسے ہی اسٹیڈیم میں دیکھتی ہوں۔ میدان کے عین وسط میں کھڑے۔ اسکرین پہ میرا چہرہ ہوتا ہے اور پورا میدان لوگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ سب مجھے ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں اور میں اکیلی وہاں کھڑی ہوتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں جیا! اگر اس وقت میرے رب نے مجھ سے پوچھ لیا کہ انا طویلہ کی عائشہ گل، اب بتاؤ تم نے کیا کیا؟ یہ بالی، یہ چہرہ، یہ جسم، یہ سب تو میں نے تمہیں دیا تھا۔ یہ نہ تم نے مجھ سے مانگ کر حاصل کیا تھا اور نہ ہی اس کی قیمت ادا کی تھی۔ یہ تو میری امانت تھی۔ پھر تم نے اسے میری مرضی کے مطابق استعمال کیوں نہیں کیا؟ تم نے اس سے وہ کام کیوں کیے جن کو میں ناپسند کرتا ہوں؟ تم نے ان عورتوں کا رستہ کیوں چن لیا جن سے میں ناراض تھا؟“

میں نے ان سوالوں کے بہت جواب سوچے ہیں، مگر مجھے کوئی جواب مطمئن نہیں کرتا۔ روز صبح اسکارف لینے سے پہلے میری آنکھوں کے سامنے ان تمام حسین عورتوں کے دلکش سراپے گردش کرتے ہیں جو بیوی ہیں۔ میں نے کبھی دیکھی ہوتی ہیں اور میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی ان کا راستہ چن لوں، مگر پھر مجھے وہ آخری عدالت یاد آجاتی ہے، تب میں سوچتی ہوں کہ اس دن میں اللہ کو کیا جواب دوں گی؟ میں ترازو کے ایک پلڑے میں اپنا وہ سراپا ڈالتی ہوں جس میں میں خود کو

اچھی لگتی ہوں اور دوسرے میں وہ جس میں میں اللہ تعالیٰ کو اچھی لگتی ہوں۔ میری پسند کا پلڑا کبھی نہیں جھٹکا۔ اللہ کی پسند کا پلڑا کبھی نہیں اٹھتا۔ تم نے پوچھا تھا کہ میں اسکارف کیوں لیتی ہوں؟ سو میں یہ اس لیے کرتی ہوں کیونکہ میں اللہ کو ایسے اچھی لگتی ہوں۔“ وہ اب چھیرے کی نوک سے لکڑی کے کنارے میں خم ڈال رہی تھی۔

”لڑکیاں سمندر کی ریت کی مانند ہوتی ہیں جیا! عیاں پڑی ریت، اگر ساحل پہ ہو تو قدموں تلے روندی جاتی ہے اور اگر سمندر کی ریت میں ہو تو کچھڑ بن جاتی ہے۔ لیکن اسی ریت کا وہ ذرہ جو خود کو ایک مضبوط سیپ میں ڈھک لے، وہ موتی بن جاتا ہے۔ جو ہری اس ایک موتی کے لیے کتنے ہی سیپ چتا ہے اور پھر اس موتی کو مخملیں ڈیوں میں بند کر کے محفوظ بخوریوں میں رکھ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی جوہری اپنی دکان کے شوکیں میں اصلی جیولری نہیں رکھتا۔ مگر ریت کے ذرے کے لیے موتی بننا آسان نہیں ہوتا، وہ ڈوبے بغیر سیپ کو کبھی نہیں پاسکتا۔“

حیا اب اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے ریگ مال لکڑی کے ٹکڑے پہ رگڑ رہی تھی۔ لکڑی کی گنگھریالی پتیاں اترا تر کر نیچے گر رہی تھیں۔ اس کے اندر بھی کچھ ایسا ہی چم رہا تھا۔ کیا؟ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی اور کبھی کبھی اسے لگتا وہ کبھی نہیں سمجھ سکے گی۔

کبریٰ بھلول کے گھر اور ان کے کھیت میں کام کرتے، ادا چائے کے پتے چنتے، ان کی مرغایوں کو دانہ ڈالتے وہ اب ان سے چھوٹے چھوٹے بچوں نے بظاہر بے ضرر سے سوال کثرت سے پوچھنے لگی تھی۔ وہ عائشہ کے بتائے گئے دو کو کبریٰ بھلول کے دو سے جمع کر کے دیکھتی تو جواب چار کے بجائے چار سو نکلتا۔ اب اسے پھر سے عبدالرحمن پاشا کے فون کا انتظار تھا۔ کب وہ فون کرے اور وہ اپنے پتے پھینکے کھیل پاشا نے شروع کیا تھا۔ اسے ختم اب وہ کرے گی۔

چند ہی روز میں اسے یہ موقع مل گیا۔ فون کی گھنٹی

بجی تو اس نے کارڈ لیس اٹھالیا اور اوپر اسٹڈی میں آئی۔

”ہیلو؟“ اس نے بظاہر سادگی سے کہا۔
دوسری جانب چند لمحوں کی خاموش چھائی رہی، پھر اس کی بھاری، کھردری آواز سنائی دی۔
”حیالی بی۔ کیسی ہیں آپ؟“
”میں ٹھیک ہوں، آپ سنائیے۔“

”جی الحمد للہ۔ آپ۔ کیا کر رہی تھیں؟“ وہ محتاط لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے اس کا فون اٹھانے کا مقصد نہ سمجھا ہو۔

”میں ایک کہانی لکھ رہی تھی، کہیں تو سناؤں؟“
اب کی بار دوسری جانب متذبذب خاموشی چھائی رہی، پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”جی، سناؤ۔“
”تین سال پہلے کی بات ہے، انڈیا کا ایک عام سا اسمگلر اپنی ماں اور بھائی کے پاس بیوک ادا آتا ہے۔ اس کا بھائی ادا میں ایک بہت کامیاب ہوٹل چلا رہا ہوتا ہے۔ نوادہ بھائی اس کے ساتھ ہوٹل کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ بظاہر اسے اپنے بھائی کا بہت خیال ہے۔ مگر آہستہ آہستہ وہ ہوٹل پہ قبضہ کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کے تعلقات استعمال کر کے اپنے تعلقات وسیع کرتا ہے۔ مافیا کے ساتھ روابط بدھاتا ہے اور تو اور، اس کی ایک عالمی وبہشت گرد تنظیم سے بھی روابط ہیں۔ پھر آج سے ٹھیک دو سال پہلے وہ اپنے بھائی کو کچھ یوں ہراساں کرتا ہے کہ ایک روز بے چارہ بھائی چپ چاپ ہوٹل چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ یونان میں ہے، مگر وہ درحقیقت کہاں ہے، یہ اس بڑے بھائی سے بہتر کوئی نہیں جانتا اور اس سے باز پرس کرنے والا کوئی ہے بھی نہیں سوائے ایک بوڑھی عورت اور دو معصوم لڑکیوں کے، یوں وہ عام سا اسمگلر استنبول کے مار سوخ ترین افراد میں شامل ہو جاتا ہے، اب بتائیے کیسی کی کہانی؟ کہتے ہیں تو بلبشنگ کے لیے دے دوں؟“

اس نے بہت معصومیت سے پوچھا تھا۔

”میں اس ساری بکواس سے کیا مطلب لوں؟“
 ”یہی کہ میرے بارے میں ذرا احتیاط سے کام لیجیے گا ورنہ پیر کے نیچے دباؤ تو چوٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔“
 ”بہت احسان فراموش لڑکی ہو۔ تمہیں بھول گیا ہے کہ اس رات تمہیں اس بحری جہاز سے نیم مرہ حالت میں کون ادھر لایا تھا؟“
 لمحے بھر کو وہ بالکل چپ رہ گئی۔

”میں پرسوں بیوک ادا واپس آ رہا ہوں۔ تم نے جب تک ادھر رہنا ہے تم رہو، میں ادھر نہیں آؤں گا ورنہ ہی تمہارے راستے میں آؤں گا، سو تم بھی میرے راستے آنے کی کوشش مت کرنا۔“ دھمکی آمیز لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ اس نے وہیں ہاتھ رکھا ہے جہاں سب سے زیادہ درد ہوتا تھا۔

”میں نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں اس کا فیصلہ ابھی نہیں کیا میں نے۔“ اس نے محفوظ سے انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

اس نے میجر احمد کا شکریہ ادا کیا جس نے اسے ایک دوسرے سنجہ سوچنا سکھایا تھا۔

”اور کیا قربان کر سکتی ہو تم اپنا فاصلہ گھٹانے کے لیے؟“ رات سونے سے قبل یہ آخری بات تھی جو عائشہ نے اس سے پوچھی تھی۔ اس نے نیند میں ڈوبی آنکھیں کھول کر سوالیہ نگاہوں سے عائشہ کو دیکھا بولی کچھ نہیں۔

”میں بتاؤں؟ تم اپنی نیند قربان کرنا سیکھ لو۔“ وہ کہہ کر لیٹ گئی تو حیا نے بوجھل ہوتی آنکھیں بند کر لیں۔ صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی ہمارے اس کا کندھا جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اسے اٹھا رہی تھی۔

”اٹھ جاؤ! عائشہ نے کہا ہے آج سے تم بھی ہمارے ساتھ قرآن پڑھنے جاؤ گی۔“

”میں؟“ اس نے کسل مندی سے آنکھیں ذرا کھولیں۔ ”مجھے نیند آرہی ہے۔“

”نہیں، نہیں، اب تو تمہیں بھی جانا پڑے گا۔ یہ

ٹارچر تم بھی سونائیں۔ میں اکیلے کیوں برداشت کروں؟ اب اٹھ جاؤ۔“ دم کٹی لو مڑی دوسری کی دم پھندے میں پھنسنے دیکھ کر بہت خوشی خوشی اچھلتی کودتی تیار ہو رہی تھی۔

حیاء وقت تمام کبیل پھینک کر اٹھی۔ اسے اور ڈی جے کو صبح خیزی کی عادت تو تھی مگر ان کی صبح فجر قضا ہونے کے بعد ہوتی تھی اور پھر بھاگ بھاگ کیسپس کی تیاری۔

اس نے اپنا لیموں کے رنگ کا زرد فریک پہنا جو ایک دفعہ جہان کے گھر پہن کر گئی تھی اور کیلے بال کھلے چھوڑ کر سنگھار میز کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ابھی اس نے پرفیوم کی شیشی اٹھائی ہی تھی ہمارے عقب میں زور سے چیخی۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“
 ”کیا؟“ وہ اس کے اچانک چلانے پر ڈر کر پٹی۔

”تم باہر جانے سے پہلے پرفیوم لگا رہی ہو؟“ ہمارے نے بے یقینی سے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”آہ ہاں۔ کیا ہوا؟“

”عائشہ گل کہتی ہے، اچھی لڑکیاں باہر جانے سے پہلے اتنا تیز پرفیوم نہیں لگاتیں۔ تم یہ باڈی اسپرے لگاؤ، مگر پرفیوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔“ وہ بہت خفگی سے ڈانٹتی حیا کے ساتھ آکھڑی ہوئی اور پھر ایریاں اونچی اٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھتی سر پہ اسکارف لپیٹنے لگی۔

حیا نے ایک ہاتھ میں پکڑے پرفیوم کو دیکھا اور پھر ذرا سختی سے اسے واپس رکھ کر باڈی مسٹ اٹھالیا۔ حلیمہ آنٹی کے لان میں چاندنی چھپی تھی۔ وہ مرکزی جگہ پر بیٹھی تھیں اور سارے چھوٹے بڑے بچے ان کے گرد نیم دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ وہ تینوں جس وقت داخل ہوئیں ایک جگہ سے بچوں نے فوراً ”جگہ چھوڑ کر دائرہ بڑا کر دیا“ حلیمہ آنٹی نے ایک نرم مسکراہٹ ان کی طرف اچھال کر سر کو جنبش دی۔ وہ تینوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔

”میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی دھتکارے ہوئے شیطان سے۔ اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔“

قرأت کرنے والا بچہ سنہرے بالوں والا ترک تھا جس نے سر پہ جالی دار ٹوپی لے رکھی تھی۔ باقی بچے خاموش تھے۔ وہ اپنی باریک مدھر آواز میں پڑھ رہا تھا۔

”آپ ایمان لانے والی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں جھکا کر رکھا کریں اور اپنے قابل ستر اعضا کی حفاظت کیا کریں۔“

وہ جو جمائی روکتی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی ایک دم گڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

”اور وہ اپنی زینت ظاہر نہ کیا کریں، سوا اس کے جو خود ظاہر ہو جائے۔“
 کم سن بچے کی آواز نے سارے ماحول کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر سوا ایک سحر ساطاری ہو رہا تھا۔ حیا نے بے اختیار سر پر اوڑھے دوپٹے سے کان ڈھکے جن میں اس نے موتی والی بالیاں پہن رکھی تھیں۔ وہی موتی جو جہان کے سیپ سے نکلے تھے۔ ہمارے نے اسے ایک ایک موتی دونوں بالیوں میں پرو دیا تھا۔ تیسرا موتی حیا نے سنبھال رکھا تھا۔

”اور انہیں چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پہ ڈالے رکھا کریں۔“

کسی معمول کی سی کیفیت میں اس نے گردن جھکا کر دیکھا۔ اس کا شیغون کا دوپٹا سر پہ تو تھا مگر گردن پہ اس نے مفکر کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ قدرے خفت سے اس نے دوپٹا کھول کر شانوں پہ ٹھیک سے پھیلا کر لیٹا اس وقت سوائے حکم ماننے کے اسے کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا۔ یہ عائشہ گل کی باتیں نہیں تھیں جن پہ الجھ کر ان کو ذہن سے جھٹکا جاسکتا تھا۔ یہ حکم بہت اوپر آسمانوں سے آیا تھا۔ وہاں سے جہاں انکار نہیں سنا جاتا تھا۔ جہاں صرف سر جھکایا جاتا تھا۔

ترک بچہ اپنا سبق ختم کر چکا تھا۔ حلیمہ آنٹی نے ہمارے کو اشارہ کیا۔ وہ اپنا قرآن سامنے کیے، تعوذ پڑھ کر اپنا سبق پڑھنے لگی۔

”اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔“
 اس کے نور کی مثال ایک طاق کی طرح ہے جس میں چراغ ہیں۔

چراغ فانوس میں ہے۔
 فانوس گویا ایک چمکتا ہوا تارہ ہے۔

وہ ایک بابرکت زیتون کے درخت سے روشن کیا جاتا ہے۔

نہ مشرقی ہے اور نہ مغربی۔
 قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے۔

اور اگرچہ اسے آگ بھی نہ چھوئی ہو۔
 نور ہے اور نور کے۔

اللہ اپنے نور کی طرف راستہ دکھاتا ہے جسے وہ چاہتا ہے۔

لان میں ایک دم بہت سی روشنی اتر آئی تھی۔ جیسے چمکتا چاند پورے آسمان پہ چھا گیا ہو۔ جیسے سونے کے پتنگے ہر سو آہستہ آہستہ نیچے گر رہے ہوں۔ جیسے نیلا آسمان سنہری قندیلوں سے جگمگا اٹھا ہو۔ وہ اس طلسم میں گھری مسخر زدہ سی ہوئی سنے جا رہی تھی۔

ہمارے بڑھ رہی تھی۔
 ”اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا۔“

ان کے اعمال ایک چٹیل میدان میں سراب کی مانند ہیں۔

پہا سا اس کو پانی سمجھتا ہے۔
 حتیٰ کہ جب وہ اس کے قریب آتا ہے تو اس کو کچھ بھی نہیں پاتا۔

اور وہ وہاں اللہ کو پاتا ہے۔
 پھر اللہ اس کو اس کا پورا پورا حساب دیتا ہے۔

اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔
 نیلا آسمان ان دیکھی مشعلوں سے روشن تھا۔

چاندی کی مشعلیں وہاں روشن نہیں تھیں، مگر وہاں روشنی تھی۔ نور تھا اور نور کے۔

”یا ان کی مثال سمندر کے گہرے اندھیروں کی مانند ہے۔“
 پھر اسے ایک لہر ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کے اوپر

ایک اور لہر۔ اس کے اوپر بادل۔ ان میں سے بعض کے اوپر بعض اندھیرے ہیں۔ اتنا اندھیرا کہ جب وہ شخص اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اور جس کا نہیں بنایا اللہ نے کوئی نور۔ تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور!

ہمارے اپنا سبق ختم کر چکی تھی۔ دور مر مرا کی لہریں کناروں پر سرخ سرخ کر پٹ رہی تھیں واپس اپنے اندھیروں میں۔ کلاس کا وقت ختم ہوا تو سحر ٹوٹا۔ قدیلے غائب ہو گئیں۔ صبح کی روشنی میں آسمان کے چراغ چھپ گئے۔

بچے اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ حلیمہ آئی ان کی طرف ہی آرہی تھیں۔ مگر وہ اپنی جگہ سن سی بیٹھی کہیں بہت اندر گم تھی۔ اپنی ذات کے اندھیروں میں۔ اندھیری لہر کے اوپر ایک اور لہر اور اس کے اوپر غم کے بادل۔ اتنا اندھیرا کہ مشکلوں کا سرا بھائی نہ دیتا تھا اور جس کا نہیں بنایا اللہ نے کوئی نور تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور!

وہ بالکل چپ سی اپنی جگہ پہ اسی طرح بیٹھی تھی۔

ہوٹل گرینڈ یوک ادا کے ایک نسبتاً "دوران ساحل کے قریب واقع تھا۔ جزیرے کے بازار کے رش اور سیاحوں کے شور و ہنگامے سے دور وہ ایک بہت پرسکون سی جگہ تھی۔ ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کی کھڑکیوں سے مرمر کا سمندر بالکل سامنے دکھائی دیتا تھا۔ وہ ادا کا سب سے بڑا سب سے منگوا ہوٹل تھا۔

"ذیمیت فردوس" پچھلے ساڑھے تین سال سے ہوٹل کے مالک کی پرسنل سیکریٹری تھی۔ اس کا عہدہ ساڑھے تین برس میں وہی رہا تھا البتہ اس کا لباس ایک دفعہ ضرور بدلا تھا۔ جب وہ تازہ تازہ از میر (ترکی کا ایک شہر) چھوڑ کر استنبول آئی تھی اور کئی جگہ نوکری کے لیے دھکے کھانے کے بعد اسے استنبول سے دور اس جزیرے پہ یہ جاب ملی تھی تب ذیمیت کا لباس عبدالرحمن پاشا نہیں تھا۔ اس وقت وہ اس کے

چھوٹے بھائی کی سیکریٹری تھی مگر ان پچھلے تین برسوں میں بہت کچھ بدلا تھا۔

اس نرم سی صبح میں اپنے ڈیسک کی کرسی سنبھالتے پرس اتار کر میز پہ رکھتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ہوٹل گرینڈ اب بہت بدل گیا تھا۔ اس کا پچھلا لباس بہت خوش خلق اور سادہ لوح سا آدمی تھا۔ ایسا آدمی جس میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی۔ وہ ہوٹل کا مالک ہونے کے باوجود اکثر نیچے ریسٹورنٹ کے کچن میں کام کرتا پایا جاتا تھا۔ اس کے عام سے چیلنے کو دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص یوک ادا کے رئیسوں میں سے ہے۔ پھر وقت بدلتا گیا۔ ذیمیت عبدالرحمن پاشا کو پہلے کبھی کبھار اور پھر اکثر ہوٹل میں اپنے بھائی کے ساتھ آتے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ہوٹل کا کنٹرول اور وہ آفس عبدالرحمن کی دسترس میں چلا گیا۔ عبدالرحمن نے کیسے سب کچھ اپنے قابو میں کیا کہ کوئی چوں بھی نہ کر سکا اور اس کا بھائی کہاں چلا گیا وہ کبھی نہیں جان سکی تھی۔ وہ اس کی سیکریٹری ہو کر بھی اپنے اور اس کے درمیان موجود فاصلے کو نہیں پاٹ سکی تھی۔ اسے عبدالرحمن کے سوائے چھوٹے موٹے دفتری کاموں کے علاوہ کچھ بھی کرنے کو نہیں دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ذیمیت کو شک گزرتا کہ اے آرپی نے اپنی کوئی اور سیکریٹری رکھی ہوئی ہوگی جو اس کے معمولات سے باخبر ہوگی ورنہ اس کے پاور آفس میں کیا ہوتا ہے وہ اس سے قطعاً بے خبر تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ پچھلے چند ماہ میں اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہوٹل گرینڈ میں کچھ اور بھی ہو رہا ہے کچھ ایسا جو غلط تھا۔ کچھ ایسا جو ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناتے اسے کبھی ہونے نہیں دینا چاہیے تھا مگر کیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی اور کھونچ لگانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

اپنی دراز سے ایک فائل نکالتے ہوئے اس نے یونہی ایک سرسری سی نگاہ سامنے۔ اس بند دروازے پہ ڈالی جس پہ اسے آپاشا کی تختی لگی تھی اور ٹھنک کر رک گئی۔

دروازے کی ٹپکی دراز سے روشنی جھانک رہی تھی۔ کیا عبدالرحمن واپس آگیا ہے؟ کب؟ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

وہ خوش گوار حیرت میں گھری جلدی جلدی اپنی چیزوں کو ترتیب دینے لگی۔ دنیا چاہے جو بھی کہے وہ عبدالرحمن پاشا کی سب سے بڑی پرستار تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنا سحرانگیز اور شان دار آدمی نہیں دیکھا تھا۔ بات پسند سم ہونے یا نہ ہونے کی نہیں تھی۔ بات اس وقار اور مقناطیسیت کی تھی جو اس آدمی کی شخصیت کا خاصا تھی۔

اسی لمحے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا۔

"ہی سر؟"

"ذیمیت! برنگ می اے کافی!" اس نے بھاری بارعب انداز میں کہہ کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ وہ اتنا سارا کام چھوڑ کر نہایت مستعدی سے کافی تیار کرنے لگی۔ اس کا لباس تین ماہ بعد اندیا سے لوٹا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ کافی کی ٹرے اٹھائے اس نے دروازہ ذرا سا بجا کر کھولا۔

عبدالرحمن پاشا کا آفس نہایت شان دار اور پُر نقش انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ اپنی شیشے کی چمکتی سطح والی میز کے پیچھے ریوالونگ چیر پہ ٹیک لگا کر بیٹھا وہ کھڑکی سے باہر پر سوچ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سگریٹ لبوں میں دبائے ہوئے تھا۔ ہلکی ہلکی بڑھی شیو میں وہ پہلے سے زیادہ باوقار لگ رہا تھا۔ دنیا کو وہ اچھا لگے یا برا ذیمیت کو اس جیسا کوئی نہیں لگتا تھا۔

اس نے کافی میز پہ رکھی۔ "اسلام علیکم سر اینڈ ویکم بیک۔" وہ مسکرا کر اپنے باس کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

"ہوں تھینکس!" عبدالرحمن نے ایک سرسری نگاہ اس پہ ڈالی اور پھر آگے ہوتے ہوئے سگریٹ انگلیوں میں پکڑ کر ایش ٹرے میں جھٹکا۔ وہاں راکھ کے بہت سے ٹکڑوں کے اوپر ایک اور ٹکڑا آن کر لیا پاشا کے متعلق ایک بات وہ جانتی تھی وہ اتنی بے تحاشا

اسموگنگ شدید پریشانی و فکر کے عالم میں کیا کرتا تھا۔ "سر! آپ کچھ اور لیں گے؟" وہ مؤدب کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"میرے کوٹ پہ داغ لگ گیا ہے" اسے صاف کرلاؤ۔" اس نے میز کے دوسری جانب رکھی کرسی کے کندھوں پہ ڈالے کوٹ کی جانب اشارہ کیا۔ خود وہ ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کیے گھرے شرٹ کے کف کھولے بیٹھا تھا۔ اس کا لباس بھی اس کی شخصیت کی طرح ہوتا تھا۔ نفیس اور شان دار۔

"جی سر!" ذیمیت نے احتیاط سے کوٹ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ تقریباً "پندرہ منٹ بعد جب وہ سیاہی کا وہبہ صاف کر کے لائی تو پاشا کا آفس سگریٹوں کے دھوئیں سے بھرا تھا۔ اس کی کافی جوں کی توں رکھی تھی البتہ ایش ٹرے میں راکھ کے ٹکڑے بڑھ چکے تھے۔

"سر! سب ٹھیک تو ہے نا؟ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے صرف پیشہ ورانہ تکلف میں نہیں بلکہ دلی فکر کے باعث پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ جواباً "وہ اسے نو تھینکس کہہ کر واپس جانے کو کہے گا۔ وہ اپنے معاملات کسی سے شیر نہیں کرتا تھا۔

"ہوں۔ بیٹھو!" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے اس ہاتھ میں دو سونے کی قیمتی انگلیں تھیں جو وہ ہمیشہ پہنے رکھتا تھا۔ ذیمیت حیرت چھپاتی بیٹھ گئی۔ "ذیمیت!" وہ سگریٹ کے کش لیتے گھڑکی کے باہر ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھتے ہوئے بولا تو اس کا لہجہ بے لک اور سرد تھا۔

"کسی غیر ملکی کو ترکی سے واپس بھیجنا ہو تو کیا کیا جائے؟"

(اتنی سی بات؟)

"سر! کوئی غیر ملکی اگر ترکی میں رہ رہا ہو تو وہ یقیناً کسی وجہ سے رہ رہا ہوتا ہے۔ اسے جس چیز کی کشش ترکی میں نظر آرہی ہو اس چیز کو ختم کر دینا چاہیے۔"

"اور اگر وہ کشش کسی انسان کی ہو مثلاً "ہونیڈ کی تو۔۔۔؟"

"تب اس کشش کو ختم کرنا چاہیے۔"

”اور وہ کیسے؟“ عبدالرحمن نے ذرا مسکرا کر اسے محفوظ انداز میں دیکھا۔

”سر! کوئی عورت اپنے شوہر کو صرف تب چھوڑتی ہے۔ جب اسے یہ لگتا ہے کہ اس کے شوہر نے اسے دھوکا دیا ہے۔ شدید بدگمان ہوئے بغیر عورت اپنے شوہر کو کبھی نہیں چھوڑتی۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ کوئی اس عورت کو اس کے شوہر کے خلاف برکائے؟“ انہوں نے اس نے ناگواری سے سر ذرا سا جھٹکا۔ ”وہ کیوں کسی کی بات پہ یقین کرے گی؟“

”جی سر! وہ کسی دوسرے کی بات پہ یقین نہیں کرے گی۔ وہ صرف اپنے شوہر کی بات یقین کرے گی۔“

”اور کوئی شوہر اپنے دھوکے یا اپنی بد اعمالیوں کی داستان اپنے منہ سے اپنی بیوی کو کیوں سنائے گا؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ یہ سب اپنی بیوی کو کہے۔“ اب کے دیمت ذرا معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ ”وہ یہ سب کسی اور سے کہے گا اور اگر ٹانگہ صحیح رکھی جائے تو اس کی بیوی اس کے علم میں لائے بغیر اس کی باتیں سن لے گی۔ ایک معصوم سا اتفاق۔“ بات ختم کر کے دیمت نے ذرا سے شانے اچکائے۔

عبدالرحمن کی آنکھوں میں ایک چمک در آئی۔ اس نے سکریٹ کا ٹکڑا ایش رے میں پھینکا اور ذرا آگے ہو کر بیٹھا۔

”مگر دیمت! کوئی آدمی کسی دوسرے کے بھی سامنے اپنے کسی بد عمل کا ذکر کیوں کرے گا؟“

”میں نے کہا نا سر! ٹانگہ صحیح رکھی جائے تو سب ٹھیک رہے گا۔ وہ آدمی اپنے بد عمل کی داستان نہیں سنائے گا۔ وہ عمل کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جو کسی کو ہیرو بنا دیتے ہیں لیکن اگر سیاق و سباق کے بغیر پیش کیے جائیں تو وہ ہیرو کو ولن بھی بنا دیتے ہیں۔“

عبدالرحمن پاشا کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی

گئی۔ اس کے چہرے پہ چھائی فکر غائب ہو رہی تھی۔ ”دیمت! جو کام میں پچھلے پانچ مہینوں میں نہیں کر سکا، وہ تم نے پانچ منٹ میں کر دکھایا ہے۔ تھینک یو سوچ۔“ وہ واقعتاً اس کا بہت ممنون تھا۔

دیمت کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ بہت مسرت سے اٹھی تھی۔ گو کہ اندر سے وہ جانتی تھی کہ عبدالرحمن کسی بیوی کو اس کے شوہر سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ غلط کام تھا، مگر عبدالرحمن کا تشکر ہر شے سے بڑھ چھانے لگا۔

”تمہارا شوہر کیسا ہے؟“ ”جی سر! کرسی سے اٹھتے ہوئے اس نے مغموم انداز میں بتایا۔ ایک حادثے کے بعد اس کا شوہر کچھ عرصے سے وینٹی لیٹر پہ تھا اور یہ پورا ہوٹل گرینڈ جانا تھا۔“

”ایڈوائس سیری چاہیے ہو تو بتا دیتا۔“

”تھینک یو سر!“ وہ پورے دل سے مسکرائی۔ عبدالرحمن اسے ”لاج“ دے رہا تھا۔ یہ اس کے مشورے کا انعام تھا۔ وہ بہت فرحت سے واپس جانے کے لیے مڑی تھی۔

”تمہارا بیٹا اشائل اچھا ہے دیمت!“

عبدالرحمن نے اس کے عقب میں پکارا تھا۔ اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ وہ بہت الجھن سے واپس پلٹی۔ عبدالرحمن اب ایک فائل اٹھا کر اس کی درق گردانی کر رہا تھا۔ وہ بظاہر اس کی طرف متوجہ نہ تھا، مگر اس نے یہ بات کیوں کہی؟ پچھلے تین برسوں میں تو اسے کبھی دیمت کے بالوں کا خیال نہیں آیا تھا، نہ ہی وہ عورتوں سے شغف رکھنے والا بندہ تھا۔ پھر اس نے یہ کیوں کہا؟

”تھینک۔ تھینک یو سر!“ وہ ذرا تذبذب سے بولی۔

”ویسے تمہارا پچھلا بیٹا اشائل بھی اچھا تھا۔“

”پچھلا؟“ اس نے بہت الجھ کر اپنے باس کو دیکھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ دیمت نے تو پچھلے تین برسوں میں سوائے اس کنگ کے، دوسری کوئی کنگ نہیں کرائی

تھی۔ ”ہاں، جو انتالیہ کے ساحل پہ تھا۔ تم پہ گھنگھریالے سرخ بال اچھے لگتے ہیں۔“ وہ فائل کی طرف متوجہ بہت سرسری انداز میں کہہ رہا تھا۔

دیمت کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ وہ پتھر کا پت بنی رہ گئی۔ ایک دم کمرے میں ٹھن بہت بڑھ گئی تھی۔ اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔ وہ بدقت تمام باہر نکلی اور اپنی کرسی پہ ڈھسے بی گئی۔

انتالیہ کا ساحل، سرخ گھنگھریالے بال۔۔۔ چھ سال پہلے اس نے ایک ایکس ریٹ میگزین کے لیے ماڈلنگ کی تھی۔ وہ بدنام زمانہ میگزین صرف انتالیہ میں چھپتا تھا اور وہاں سے باہر نہیں جایا کرتا تھا مگر مگر تب اسے میسے چاہیے تھے، اور وہ نشے میں تھی۔ بعد میں وہ سرمنہ تھی۔ اس نے وہ شر وہ جگہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے خاندان اس کے دوستوں، کبھی کسی کو اس میگزین کی ان چند کلیمز کا علم تک نہیں ہوا تھا۔ وہ میگزین تو شاید اب ردی کا ڈھیر بن کر اس دنیا سے ہی غائب ہو گیا ہو۔ تو پھر عبدالرحمن پاشا کو کیسے پتا چلا؟

وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے بیٹھی تھی۔ اس کی بے لگ آواز کی دھمکی وہ سمجھتی تھی۔ اگر اس نے یہ گفتگو کسی کے سامنے دہرائی تو وہ میگزین منظر عام پہ آجائے گا اور۔ اور اس کا گھر، بچے، زندگی سب تباہ ہو جائے گا۔

اس نے چہرہ اٹھا کر بے بس ہنسنے لگا ہوں سے اے آر پی کے آفس کے بند دروازے کو دیکھا۔

”بلیک میل!“ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُڑ آئے تھے اسے آج علم ہوا تھا کہ عبدالرحمن پاشا نے کیسے ہر شے کو اپنے قابو میں کیا تھا۔

بند دروازے کے اس پار وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا قیمتی موبائل تھا جس میں وہ کوئی نمبر ڈھونڈ رہا تھا، ایک نمبر پہ آکر اس کا ہاتھ ٹھم گیا۔ وہ نمبر اس نے انگریزی میں ”Dearest“

”Brother“ کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔

اب اس نمبر پہ رابطہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اگر ہر

چیز ویسے ہی ہوتی جائے جیسے وہ سوچ رہا تھا تو۔ اس نے مسکرا کر اس نمبر کو دیکھا اور پھر اس کے نام پیغام لکھنے لگا۔

”میں انتالیہ سے واپس بیوک اوا آچکا ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟“

پیغام جانے کے پورے ڈیڑھ منٹ بعد اسی نمبر سے جواب آیا تھا۔

”جنم میں جاؤ تم۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

وہ پیغام پڑھتے ہوئے محفوظ سے انداز میں ہنس پڑا۔ پھر مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے جوابی پیغام لکھنے لگا۔

”میں جنم میں بعد میں جاؤں گا، پہلے تم سے تو مل لوں۔ تم ہوٹل گرینڈ آؤگے یا میں استقلال اسٹریٹ میں برگر کنگ پہ آجاؤں؟“

سینڈ کاٹن دباتے وقت وہ جانتا تھا کہ اس کے برادر ڈیرسٹ کا جواب ان دونوں جگہوں میں سے ہی کوئی ہوگا۔ وہ انکار نہیں کرے گا۔ اس نے آج تک عبدالرحمن کو ”نہ“ نہیں کی تھی۔ وہ اسے ”نہ“ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔



حیا اس صبح جب حلیمہ آنٹی کے گھر سے واپس آرہی تھی تو اس کے موبائل پہ جہان کا پیغام آیا تھا۔

کبھی سے اترتے ہوئے اس نے پیغام کھول کر پڑھا۔

”سنو! میں ابھی ذرا کام سے بیوک اوا آ رہا ہوں۔ دوپہر میں ملے ہیں۔ لنچ ساتھ کریں گے ٹھیک!“

حیا نے حیرت سے ٹائم دیکھا۔ صبح کے سات بجے تھے۔ اگر وہ ابھی چلا ہو تو آٹھ ساڑھے آٹھ تک پہنچ جائے گا، پھر وہ دوپہر تک بیوک اوا میں کیا کرے گا؟ اس کا کب سے اس جزیرے میں کوئی کام ہونے لگا؟

وہ الجھتی اندر آئی تھی۔

بیک بندہ رکھتے ہوئے اس نے موبائل پر جہان کا نمبر ملایا۔ نمبر بڑی جا رہا تھا۔ اس نے فون رکھا اور چونکھٹ میں آکھڑی ہوئی۔ سامنے عانشی اور ہمارے اپنی چیزیں اکٹھی کرتی نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے اب جنگل جانا تھا۔

”آج میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکوں گی عانشی! جہان آ رہا ہے۔“ وہ ذرا الجھی الجھی سی بتا رہی تھی۔ ”شیور!“ عانشی نے سمجھ کر سر ہلادیا اور تھیلالے باہر چلی گئی۔ پھر آٹھ بجے کے قریب وہ سنگھار میز کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ جہان آ رہا تھا اسے ڈھنگ سے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس نے ہلکے ہلکے نم بالوں میں برش پھیرا، پھر ایک دراز سے وہ تھیلی نکالی جس میں اس کا تیسرا موتی رکھا تھا۔ ہمارے کی سلور چین میں اس نے وہ موتی دیئے ہی پرو دیا جیسے وہ دونوں بہنیں پروتی تھیں اور چین گردن سے لگا کر دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر بک بند کیا۔ تنگ زنجیر گردن سے چپک گئی تھی اور درمیان میں انکا موتی مزید چمکنے لگا تھا۔

اب اس نے پھر سے جہان کا نمبر ملایا، گھنٹی جا رہی تھی۔

”ہیلو؟“ جہان بولا تو پیچھے بازار کا مخصوص شور تھا۔

”جہان تم پہنچ گئے؟“

”ہاں میں تم سے دوپہر میں ملتا ہوں۔“

”تو تم دوپہر تک کیا کرو گے ادھر؟“

”میں وہ۔۔۔“ وہ ذرا رکا۔ ”میں ایک دوست سے ملنے آیا تھا ابھی اس کے پاس جا رہا ہوں۔“

”کون سا دوست؟“ عانشی نے پوچھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ جہان نے سوائے علی کرامت اور اس کی ماں کے، کبھی اپنے دوستوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کیا اس کا کوئی دوست نہیں تھا یا وہ اپنے دوستوں کا ذکر مستور رکھتا تھا؟

”ہے کوئی، تم نہیں جانتیں۔ اچھا۔ میں فارغ ہو کر کال کرتا ہوں۔“ وہ غلٹ میں لگ رہا تھا۔

”اوکے!“ اس نے فون کان سے ہٹایا، پھر سوچا کہ بچ پر۔۔۔ ہی پوچھ لے گی کیونکہ وہ جہان کو۔۔۔ اس سفید

محل میں نہیں بلانا چاہتی تھی۔ سو جلدی سے فون کان سے لگا کر ”ہیلو جہان؟“ کہا کہ مبادا اس نے فون بند نہ کر دیا ہو۔

جہان بھی فون بند کرنے کے بجائے کان سے ہٹا کر دوسری طرف کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے یقیناً ”حیا کا ہیلو نہیں سنا تھا۔ وہ ترکی میں کچھ کہہ رہا تھا۔“

”کوئی مبہم سا فقرہ جس میں حیا کو صرف ”اول گرینڈ“ سمجھ میں آیا تھا۔ ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

”اول گرینڈ؟ یعنی ہوٹل گرینڈ؟ جہان نے ہوٹل گرینڈ کا ذکر کیا؟ یعنی وہ ہوٹل گرینڈ جا رہا تھا؟“ وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہو گئی۔ کیا جہان کو علم نہیں کہ وہ عبدالرحمن پاشا کا ہوٹل ہے اور پاشا تو اب بیوک ادا واپس آ گیا ہے۔ ”لوگ عموماً“ ریسٹورانٹس میں ہی ملتے ہیں اس لیے اس نے یقیناً اپنے دوست کو وہی مقام بتا دیا ہو گا۔ اور جہان تو سرے سے کسی عبدالرحمن پاشا کو نہیں مانتا تھا۔ پھر؟

”اچھا چھوڑو سب۔ دوپہر میں اس سے ملنا تو پوچھ لینا۔“

سارے خیالات ذہن سے جھٹکتی، وہ پرنل باکس لے کر اٹھی اور اسٹڈی میں آ بیٹھی۔ کچھ دیر تو وہ باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، پھر ایک دم ایک بج پہنچ کر وہ باکس میز پر رکھ کر اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ زرد لے فرائک پہ اس نے بھورا اسٹول شانوں کے گرد سختی سے لپیٹ لیا بال یونی کھلے رہنے دیے اور پرس میں کالی مرچ کا اسپرے رکھ کر وہ باہر نکل آئی۔

اسے معلوم تھا کہ وہ اب جب تک جہان کو اور ہوٹل گرینڈ کو دیکھ نہیں لے گی اسے بے چینی رہے گی اب چاہے اس کے لیے اسے تنہا کیوں نہ سفر کرنا پڑے۔ ویسے بھی جزیرہ چھوٹا سا تھا۔ ہوٹل گرینڈ اور اس کی عقبی پھولوں کی مارکیٹ اس محل سے قریباً پندرہ منٹ کی ہارس رائیڈ پہ تھی۔ مگر سڑک گاہ سے اس

جگہ کا فاصلہ پانچ دس منٹ اور تھا۔ ”کیا تم مجھے دس منٹ میں پھولوں کی مارکیٹ پہنچا سکتے ہو؟“ اس نے پانچ لیرا کے دو کڑ کڑاتے نوٹ بکھی بان کے سامنے کر کے سنجیدگی سے پوچھا۔ بکھی بان نے ایک نظر نوٹوں کو دیکھا اور دوسری نظر اس پر ڈالی۔ ”شیور!“ اگلے ہی لمحے اس کی بکھی کے دونوں گھوڑے پتھریلی سڑک پر دوڑ رہے تھے۔

وہ ایک لمبی سیدھی سڑک تھی جو دو رویہ درختوں سے گھری تھی اور اس کے آخری سرے پہ ہوٹل گرینڈ کی بلند وبالا عمارت کھڑی تھی۔ عمارت کے پیچھے ساحل تھا گو وہ یہاں سے نظر نہیں آتا تھا۔ عمارت پوری کالونی میں ممتاز دکھتی کیونکہ اس پاس چھوٹے موٹے کیفے تھے یا پھر پھولوں کی دکانیں۔ پھولوں کی مارکیٹ یہاں سے شروع ہو کر ہوٹل کے عقب میں پچھلی گلی تک پھیلی تھی۔

وہ پھولوں کے ایک اسٹال پہ جا کھڑی ہوئی اور یونی بے تو جی سے پھول اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔ بے چین نگاہیں بار بار اٹھ کر ہوٹل کے دروازے کا طواف کرتیں۔ پتا نہیں جہان نے آنا بھی تھا یا اس نے یونی اس ہوٹل کا تذکرہ کیا تھا؟

تب ہی گلی کے سرے پہ ایک بکھی رکتی دکھائی دی۔ اس میں سے نیچے اترنے والا بلاشبہ جہان ہی تھا۔ اس نے سر پہ سرخ لی کیپ لے رکھی تھی اور اب وہ والٹ سے پیسے نکال کر بکھی بان کو دے رہا تھا۔

حیا جلدی سے ایک اونچے شلٹ کے پیچھے جا کھڑی ہوئی جس پہ گملے رکھے تھے گملوں اور پھولوں کی جھلی ٹہنیوں کی درمیانی درزوں سے اسے وہ منظر نظر آ رہا تھا۔

پیسے دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ اب ہوٹل کی مخالف سمت میں سر جھکائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا جا رہا تھا۔ اس کا رخ ہوٹل کی عقبی گلی کی جانب تھا۔

”بے چارا آیا ہو گا کسی دوست سے ملنے، وہ کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی ہے؟ وہ کیوں اس کا تعاقب کر رہی

ہے؟“ اس نے جھنجھلا کر خود کو کوسا۔ جہان کے آس پاس سڑک پہ بہت سے لوگ دوسری سمت میں جا رہے تھے۔ وہ بھی اس ریلے کے پیچھے چل دی۔ اب جہان کو پکارنا بے وقوفی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بس وہ کہیں کسی کیفے میں چلا جائے تو وہ واپس چلی جائے گی۔

گلی کے دورا ہے پہ پھولوں کا ایک بڑا سا اسٹال لگا تھا۔ وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور ایک فلورل میگزین اٹھا کر چرے کے سامنے کر لیا۔ میگزین کے اطراف سے اسے گلی کا عقبی حصہ نظر آ رہا تھا، جہاں دور آخری سرے پہ ہوٹل گرینڈ کی پشت تھی۔ وہاں ایک چھوٹا سا پرائیویٹ پارکنگ لاث بنا تھا اور مستعد گارڈز پہرہ دے رہے تھے یقیناً ”وہ ہوٹل کے مالکان کے لیے تھا اور یقیناً“ وہاں پر کوئی پرائیویٹ لفٹ بھی ہوگی جو ہوٹل کے اعلیٰ عہدیداران کو ڈائریکٹ اپنے فلور تک پہنچا دیتی ہوگی۔

اس نے میگزین کے کور کا کنارہ ذرا سا موڑ کر دیکھا۔ جہان اسی طرح سر جھکائے چلتا ہوا سامنے جا رہا تھا۔ ہوٹل گرینڈ کی عقبی طرف۔

سیلز میں اب اس سے ”کیا چاہیے؟“ پوچھ رہا تھا۔ ”ٹیوپس۔۔۔ سبز رنگ کا ٹیوپ مل سکتا ہے؟“ اس نے ارد گرد ٹیوپ کے پھولوں کو دیکھتے ہوئے وہ رنگ پوچھا جو استنبول کیا کرہ ارض پہ بھی شاید ہی ملتا۔ اس کے خیال میں!

”سبز رنگ کا ٹیوپ؟“ دکان دار ذرا حیران ہوا پھر بولا ”مل جائے گا۔“

”اتنے زیادہ کیوں ہوتے ہیں ٹیوپس استنبول میں؟ جہاں دیکھو، ٹیوپس ہی نظر آتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے دوسرا سوال جھاڑا۔ کن اکیوں سے اسے جہان اب پارکنگ لاث تک پہنچتا نظر آ رہا تھا۔ وہاں رک کر اس نے والٹ نکال کر گارڈ کو کچھ دکھایا شاید اپنا آئی ڈی کارڈ۔ نفی میں سر ہل کر جواباً ”کچھ کہہ رہا تھا۔“

”ٹیوپس تو استنبول کا سہل ہیں۔ کیا آپ نے ٹیوپ فیشیول کے بارے میں۔۔۔“

دکان دار جوش و خروش سے اسے فیشنول کے بارے میں بتانے لگا۔ جس میں اسے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بظاہر سر ہلا کر سنتی گئی بگا ہے ایک نگاہ ہوٹل کے عقبی پارکنگ لائٹ سے ڈال لیتی جہاں وہ ابھی تک کھڑا گاڑی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جب تک وہ واپس پلٹا، حیا اسٹول پر بیٹھ کر میگزین چرے کے سامنے کیے پھولوں میں کیمو فلانج ہوئی بیٹھی تھی۔ اب بس جہان چلا جائے تو وہ بھی خاموشی سے نکل جائے گی۔

کسی نے نرمی سے میگزین اس کے ہاتھ سے کھینچا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

”جب اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میگزین اس کے سامنے کرتے ہیں تو اس کو الٹا نہیں پکڑتے۔“

عین اس کے سر پہ کھڑے جہان سکندر نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میگزین سیدھا کر کے اسے تھمایا۔

اگر زمین میں گر جانے سے زیادہ مبالغہ آمیز محاورہ ہو تا تو وہ اس وقت حیا سلیمان پہ صادق اترتا۔ وہ قدرے بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔

”اوہ۔۔۔ تم تم ادھر کیا کر رہے ہو؟“

جواباً جہان نے مسکراہٹ دبائے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

”نہیں بلکہ میں۔۔۔ میں ادھر کیا کر رہی ہوں۔“

وہ ذرا خفت سے مسکرائی۔

”میں ایک کام سے آیا تھا اور تم شاید میرے پیچھے۔“ وہ مسکرا کر بولا، مگر اس کا چہرہ ذرا استاء ہوا لگ رہا تھا۔

”نہیں تمہارے پیچھے کیوں میں بھی ایک کام سے آئی تھی۔“ وہ سنبھل کر مسکرا کر بولی البتہ دل ابھی تک یونہی دھک دھک کر رہا تھا۔

”واقعی؟“

”ہاں میں اس علاقے پہ ایک رپورٹ لکھ رہی ہوں۔ ہالے کی ایک جرنلسٹ دوست کے لیے۔ بہت دلچسپ ہے۔“

جہان نے جواباً نگاہیں جھکا کر اس کے خالی ہاتھوں

کو دیکھا۔

”اور تم کاغذ کے بغیر ہی رپورٹ لکھتی ہو؟“

”یہ نوٹ بک کہاں گئی؟ اوہ یہ رکھی ہے۔ اس نے اب بہت اطمینان سے اسٹال کے اس طرف دکان کے کاؤنٹر پہ رکھی نوٹ بک اٹھائی اور اسے سینے سے لگا کر بازو لپیٹتے ہوئے مسکرا کر جہان کو دیکھا۔ جہان نے گردن موڑ کر دکان دار کو دیکھا۔ دکان دار نے ایک قلم میز سے اٹھا کر حیا کی طرف بڑھایا۔

”یہ آپ کا قلم! کیا میرے انٹرویو کے ساتھ میری تصویر بھی چھپے گی؟“ ترک دکان دار نے بہت سادگی سے پوچھا تھا۔

”گو شش کروں گی!“ اس نے مسکراہٹ دبائے سر ہلا دیا۔ جہان شانے اچکا کر پلٹ گیا تو اس نے ایک ممنون نگاہ دکان دار پہ ڈالی جو جواباً مسکرا دیا تھا۔ وہ جلدی سے جہان کے پیچھے لپکی۔

”مل لیے دوست سے؟“

”نہیں۔ بعد میں ملوں گا۔ سلیمان ماموں برسوں استنبول آرہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے؟“ وہ دونوں ساتھ ساتھ جزیرے کی ایک گلی میں چل رہے تھے جب جہان نے بتایا۔

”ہوں معلوم ہے۔ اس لیے آج میں تمہارے ساتھ واپس چلی جاؤں گی۔“ اس نے ابھی ابھی کا ترتیب دیا ہوا پروگرام بتایا۔ ابانے جب اپنے کاروباری ٹرپ کا ذکر کیا تھا تو اس نے استنبول واپس جانے کا تہہ کر لیا تھا اب جہان کے آنے سے آسانی ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ چٹھیاں وہ انور ڈنہیں کر سکتی تھی۔

”بیسویں کی پہاڑی کس طرف تھی؟“

جب سڑک ختم ہو گئی اور وہ پہاڑی راستے پر چڑھنے لگے تو جہان ایک جگہ رک گیا اور ذرا متذبذب انداز میں دو مخالف سمتوں میں جانے والے پہاڑی راستوں کو دیکھا۔

”یہ کیسے ہو گیا کہ جہان سکندر کو اپنے ترکی کے راستے بھول گئے؟“ وہ ذرا جتا کر مسکراتی ایک سمت

اوپر چڑھنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا ہے اڑتی شال کو اس نے حتی سے شانوں کے گرد لپیٹ کر پکڑ رکھا تھا۔

”جہان سکندر جب بیوک ادا تمہارے اور ڈی جے کے ساتھ آیا تھا تو اس وقت وہ دو سال بعد ادھر آیا تھا۔“

”اور مجھے یاد ہے تب بھی ڈی جے کے فون کرنے پہ تم بمشکل راضی ہوئے تھے۔“

”اوہ تم اس وقت ڈی جے کے ساتھ بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھیں؟ مجھے تو ڈی جے نے بتایا تھا کہ تم مصروف ہو۔“ وہ اس کے پیچھے پہاڑی پہ چڑھتے ہوئے ہلکے سے مسکرا کر بولا۔

”اس نے بعد میں بتایا تھا۔“

وہ مڑی نہیں مگر اسے حیرت ہوئی تھی کہ جہان کو اتنی پرانی بات اتنی جزئیات سے یاد تھی۔

”بیسویں کی پہاڑی کی چوٹی پہ وہ یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے پہنچ ہی گئے تھے۔ پہاڑی کی چوٹی کسی سرسبز لان کی طرح چھٹی اور گھاس سے ڈھکی تھی۔ وہاں فاصلے فاصلے بہت اونچے درخت لگے تھے یوں جیسے کسی یونیورسٹی کیمپس کا لان ہو۔ دور دور ٹولوں میں لوگ بیٹھے تھے۔

ایک طرف ایک چوکور بلاک کی مانند لکڑی کی عظیم الشان قدیم عمارت تھی۔ وہ ایک خستہ حال قدیم یونانی یتیم خانہ تھا جس کو دیکھنے لوگ دور دور سے Hill Jesus (بیسویں کی پہاڑی) پہ آتے تھے۔

وہ دونوں ایک درخت تلے آ بیٹھے۔ حیا نے تنے سے ٹیک لگالی جبکہ جہان اس کے قریب ہی کہنی کے بل گھاس پہ نیم دراز ہو گیا۔ اسے بے اختیار توپ کی کے عقبی برآمدے کا منظر یاد آیا جب وہ دونوں اسی طرح بیٹھے تھے۔ لمحے جزیرے کی ہواؤں سے پھیلتے لکڑی کی قدیم عمارت پہ گر رہے تھے گویا ماہر نے ان دیکھے قطرے ہوں۔

عمارت کے قریب چند لڑکے گھاس سے ہٹ کر ایک الاؤ کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ الاؤ سے آگ کی لپٹیں اٹھ اٹھ کر فضا میں گم ہو رہی تھیں۔

”جہان۔۔۔ کبھی تم نے اپنی جلد پہ جلنے کا زخم محسوس کیا ہے؟“ وہ دور اس الاؤ کو دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

”غریب شیفت دن میں کئی بار ہاتھ جلاتا ہے مادام!“

اس نے ایک نگاہ جہان پہ ڈالی۔ اس نے سوال ضائع کیا تھا۔ یہ بات اسے مبحرا حہ سے پوچھنی چاہیے تھی۔ اس نے سوال غلط بندے سے کیا تھا۔

”تم ہر وقت اپنے آپ کو اتنا غریب کیوں کہتے ہو؟“

لمحے بھر کو اسے جہان پہ بے طرح غصہ آیا تھا۔ استقلال اسٹریٹ میں تمہارا ریٹورنٹ ہے؟ جہانگیر میں تمہارا گھر ہے، اور جس روز ہم پاکستان سے آئے تھے میں نے دیکھا تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی gadget تمہارے کمرے میں رکھا تھا۔ اب وہ سب تو تمہیں گفٹ نہیں ملے تھے نا۔“

”تم زخم کی بات کر رہی تھیں۔ تمہاری گردن کا زخم ٹھیک ہوا؟“ وہ بغیر شرمندہ ہوئے بہت ڈھٹائی سے موضوع بدل گیا۔

”میرے زخم بہت سے ہیں میں نے ان کا شمار چھوڑ دیا ہے۔“ وہ ذرا تلخی سے کہتی رخ موڑ کر قدیم خستہ حال عمارت کو دیکھنے لگی۔ حرکت کرنے سے اس کے کان کی بالی میں موجود موتی ہلنے لگا تھا۔ مگر جہاں کو تو یاد بھی نہیں ہو گا کہ یہ موتی اس نے حیا کو دیا تھا۔

”تمہاری رپورٹ کہاں تک پہنچی؟“ وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا جیسے اسے ابھی تک یقین نہیں ہو کہ حیا ”اتفاق“ سے پھولوں کی مارکیٹ میں تھی۔

”بہت دور تک۔ سننا چاہو گے؟“

”ہاں تم نے اس بے چارے دکان دار سے پھولوں کے متعلق کون سا راز اگلوا یا ذرا میں بھی تو سنوں۔“ وہ کہنی کے بل ذرا اوپر کو ہو کر بیٹھے ہوئے بولا۔

”میں پھولوں کے متعلق نہیں عبدالرحمن باشا، اس کے گشہ بھائی اور ہوٹل گرینڈ کے متعلق رپورٹ لکھ رہی ہوں!“

اور زندگی میں پہلی بار اس نے جہان کے چہرے سے رنگ اڑتا دیکھا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔
”تم مذاق کر رہی ہو؟“

”نہیں، مگر اب تم یہ مت کہنا کہ استنبول میں عبدالرحمن پاشا نامی کوئی بندہ نہیں ہے۔ وہ ہے اور وہ ہوٹل گرینڈ کالک ہے۔ لیکن تم جانتے ہو اس ہوٹل کا اصل مالک کون تھا؟“

جہان نے جواباً ”سوال نہیں کیا“ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اس کا چھوٹا بھائی۔ عبدالرحمن کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو اچانک ڈیڑھ دو سال قبل منظر عام سے غائب ہو گیا۔ اگر آج وہ ادھر ہوتا تو عبدالرحمن پاشا اتنا مضبوط اور ناقابل شکست نہ بنا بیٹھا ہوتا۔ میں وہ وجہ تلاش کر رہی ہوں جس کے باعث اس کا بھائی یوں روپوش ہوا ہے۔“

”تم یہ سب جان کر کیا کرو گی؟“ وہ بہت الجھن سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں یہ اسٹوری ہالے کو دوں گی اور وہ اپنی صحافی دوست کو۔ یوں معصوم سی یہ کہانی اخبار میں چھپے گی اور اگر یہ چیز ایک دفعہ میڈیا کے ہاتھ لگ جائے تو پریشر کے باعث یا تو عبدالرحمن اپنے بھائی کو ڈھونڈ نکالے گا یا میڈیا۔“ وہ بہت جوش سے بولتی جا رہی تھی۔

”اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو کوئی پہلے ہی کر چکا ہوتا اور تم۔۔۔ تم اس کے بھائی کو منظر عام پہ لا کر کیا کرو گی؟“

”میں چاہتی ہوں کہ لوگ اس غلط فہمی سے نکل آئیں کہ عبدالرحمن پاشا کسی Voldemort

Lord کا نام ہے۔ تم یقین کرو جہان! میں نے جتنی اس معاملے پر تحقیق کی ہے اتنا ہی مجھے اندازہ ہوا ہے کہ پاشا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک جعلی پروپیگنڈا مہم ہے۔ بعض لوگ خود کو طاقت ور کہلا کر اپنی انا کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ میں قانون پڑھ رہی ہوں مجھے ان باریکیوں کا پتا ہے۔“

”اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ تم قانون پڑھ رہی ہو ورنہ میں تو اب تک بھول ہی چکا تھا۔“

”بات مت بدلو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ جب میڈیا میں یہ بات آئے گی کہ ہوٹل گرینڈ کالک کا اصل مالک یونان نہیں بلکہ کہیں کسی چھوٹی سی جگہ یہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو اس بات کو کتنا اچھا لائے گا۔“

”اشاپ دس حیا!“ وہ ایک دم جھنجھلا یا تھا۔ ”تم تم۔ کیا ضرورت ہے تمہیں پرانے مسئلے میں پڑنے کی؟ ضروری تو نہیں ہے کہ پاشا نے اپنے بھائی کو نکالا ہو، ہو سکتا ہے وہ خود گیا ہو، ہو سکتا ہے ان دونوں کے درمیان کوئی سیٹل منٹ ہو۔ ہزار ممکنات ہو سکتی ہیں۔“

”اور ہو سکتا ہے اس نے خود اپنے بھائی کو واپس آنے سے روک رکھا ہو۔ اگر اخبارات اس خبر کو اچھا لیں گے تو عبدالرحمن پاشا کی اس خود ساختہ شہرت کے غبارے سے ساری ہوائیں نکل جائے گی۔“ وہ بہت مزے سے بولی تھی پھر جہان کے تاثرات دیکھ کر اچھنچا ہوا۔ وہ بہت مضطرب اور کوفت زدہ سالک رہا تھا۔

”عبدالرحمن پاشا کو کوئی فرق نہیں پڑے گا فرق پڑے گا تو اس کے بھائی کو حیا! بہت سے لوگ نئی زندگیاں شروع کر لیتے ہیں وہ خود ہی اپنی پرانی زندگی میں نہیں لوٹنا چاہتے۔ اس طرح اس کو ایک سپوز کر کے تم اس کی زندگی مشکل میں ڈال دو گی۔ خواہ مخواہ مت پڑو ان لوگوں کے مسئلوں میں۔ چلو چلتے ہیں مجھے واپس کام پہ بھی پہنچنا ہے۔“

وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے انداز میں واضح اضطراب تھا۔

”تم کو اپنے دوست سے نہیں ملنا؟“

جہان نے رک کر ایک نظر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلادیا۔

”نہیں پھر کبھی مل لوں گا۔“
”مجھے سامان پیک کرنے میں ذرا وقت لگے گا، تم پورٹ پہ میرا انتظار کر سکتے ہو؟ میں تب سامان لے کر سیدھی وہیں آ جاؤں گی۔“
”میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں تمہاری دوست کے گھر۔“

”نہیں، تم بور ہو جاؤ گے، مجھے ساتھ والی آنٹی سے کچھ چیزیں لینی ہیں، وقت لگ جائے گا۔ میں تمہیں پورٹ پہ لوں گی۔“ وہ جہان کو عائشہ گل کے گھر کے باہر لگی آئے آپاشا کی سختی دکھانے کی محتمل ہرگز نہیں تھی۔

”اوکے!“ اس نے زور نہیں دیا۔ وہ شانے اچکا کر سر جھکائے نیچے اترنے لگا۔ وہ کسی اور بات پہ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

گھر آکر اس نے جلدی جلدی سامان پیک کیا، فون کر کے عائشہ سے معذرت کی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے، ابا کی آمد کا بتا کر جب وہ اپنا بیگ لیے نہایت عجلت میں بندرگاہ جانے کے لیے نکلی تو اسے بھول چکا تھا کہ اس کا پزل باکس اوپر اسٹڈی کی میز پر پڑا رہ گیا ہے۔

دوسری سرخی بیوک ادا کی اس سرسبز درختوں سے گھری گلی پہ چھا رہی تھی۔ بلند وبالا عثمانی محل کے سفید ستون سنہری زونسی میں چمک رہے تھے۔ عبدالرحمن ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنا گول چکر دار زینے اور چڑھ رہا تھا۔ اس کے جوتوں کی دھمک یہ کچن میں کام کرتی عائشہ کے سبزی کاتے ہاتھ رک گئے۔ گھر میں جوتوں سمیت صرف عبدالرحمن ہی گھوما کرتا تھا۔ وہ ٹل کلاس ترکوں کی طرح گھر سے باہر کبھی جوتے نہیں اتارتا تھا بلکہ استنبول کی ہائی ایلٹیٹ کی طرح قالین پہ بھی جوتے پہن کر بہت تفاخر سے چلا کرتا تھا۔

عائشہ نے صبح ہی اسے ایم ایس ایم کر دیا تھا کہ حیا کل چلی گئی ہے اور رات میں آنے بھی آگئی تھیں، وہ چاہے تو گھر آسکتا ہے۔ سو وہ آگیا تھا۔

اس نے جلدی سے سنک کی ٹوٹی کھولی، ہاتھ دھوئے اور انہیں خشک کیے بنا باہر نکلی تو اسے عبدالرحمن بالائی منزل کی راہداری کے پہلے دروازے

میں داخل ہوتا دکھائی دیا تھا۔ وہ اسٹڈی میں جا رہا تھا۔ عائشہ تیز قدموں سے اس کے پیچھے زینے چڑھنے لگی۔

اسٹڈی روم کا دروازہ پورا کھلا تھا۔ عبدالرحمن ایک بک شیلف کے سامنے گھڑا کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

”السلام علیکم!“ اس نے چوکھٹ میں رک کر سلام کیا۔

”ہوں و علیکم!“ وہ ہاتھ میں پکڑی کتاب کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ وہ اتنے دن بعد گھر واپس آیا تھا، مگر اس کا انداز ویسا ہی تھا۔

”تم کب آئے؟“

”ابھی۔“ وہ کتاب رکھ کر اسٹڈی ٹیبل کی طرف آیا اور دراز کھول کر اندر رکھی اشیاء اوہرا دھر کرنے لگا۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“ عائشہ کو بے چینی ہوئی۔

”کچھ پیپرز تھے، اور ایک کتاب بھی۔“ وہ اب کھنے کے بل زمین پہ بیٹھا کچلی دراز کھول رہا تھا۔

”تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟“ وہ اداسی سے بولی۔

”نہیں!“ وہ بنا پلٹے بولا تھا۔

”میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے جو بھی کہا تھا، آنے کے لیے کہا تھا۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے مگر تم نے اس دن کے بعد مجھ سے کبھی ٹھیک سے بات نہیں کی۔“

”عائشہ! میرے معاملات میں مت بولا کرو!“ اس نے مڑ کر ایک سخت نگاہ عائشہ پہ ڈال کر کہا اور واپس پلٹ گیا۔ ”تم نے اپنی دوست کو میرے سو کالڈ بھائی کے بارے میں بتایا ہے نا، اس نے مجھے خصوصاً“ یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”میں تمہارے حکم کی پابند تو نہیں ہوں عبدالرحمن!“ عائشہ نے نرمی سے مگر خفا لہجے میں کہا۔ ”ہمارے نے ہماری لڑائی کا ذکر کیا تو میں نے پوری بات بتا دی۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔“

”آنے کدھر ہیں؟“ وہ اب ٹیبل پہ رکھی کتابیں

اٹھا اٹھا کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

”وہ سو رہی ہیں۔“ وہ کہہ کر پلٹ گئی۔ جاتے ہوئے اس کا چہرہ بہت خفا اور اداس تھا۔ وہ چلی گئی تو عبدالرحمن نے پلٹ کر دیکھا پھر برہمی سے سر جھٹکا۔

”یہ لڑکی مرواتے گی اسے کسی دن۔“

سرخ جلد والی کتاب ایک فائل تلے رکھی تھی اس نے گہری سانس لے کر کتاب اٹھائی۔ اس کے اندر وہ کاغذات پڑے تھے جو اس نے پہلے وہاں رکھے تھے۔ کتاب اٹھا کر وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ اس کی نگاہ ایک شے پہ رک گئی۔

وہ ایک سیاہی بال بزل باکس تھا جس کی چاروں اطراف جلی ہوئی لگتی تھیں اور ان پہ سنہری حروف ابھرے ہوئے تھے۔

عبدالرحمن نے کتاب واپس رکھی اور آہستہ سے وہ باکس اٹھایا، پھر اس کو الٹ پلٹ کر کے وہ سطور دیکھنے لگا۔ ایک شعر تلے کو ڈبار کے چھے چوکھٹے بنے تھے اور ان میں متفق حروف ابھرے ہوئے تھے۔

وہ باکس پکڑے باہر آیا۔ عائشہ کچن سے اسی وقت نکلی جب وہ میز پر ہیاں اتر رہا تھا۔ عبدالرحمن نے نا محسوس انداز میں باکس والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ عائشہ نے اسے نہیں دیکھا تھا، وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ راہداری سے گزر کر پچھلے دروازے سے ہوتا ہوا عقبی باغیچے میں آگیا۔ وہاں کونے میں عائشہ کی ورک ٹیبل رکھی تھی جس پہ ہمارے کوئی ٹکڑنگ بک رکھے رنگ بھر رہی تھی۔ ہمارے سے وہ آتے ہوئے مل چکا تھا سوا ب اسے آتے دیکھ کر وہ سادگی سے مسکرا دی۔

”ہمارے!“ وہ دم دم مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس کے قریب آیا اور پزل باکس اس کے سامنے کیا۔ ”یہ کس کا ہے؟“

”اوہ یہ تو حیا کا ہے، وہ یہیں بھول گئی؟“ وہ حیرت سے بولی۔ ”کل اس کا کزن آیا تھا تو اسے جلدی میں جانا پڑا۔ تمہیں پتا ہے اس کا کزن بہت ہینڈ سم ہے۔“

”یہ حیا کا ہے؟“ عبدالرحمن نے اس کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے دہرایا۔

”ہاں یہ اسے کسی نے دیا تھا۔“

”کس نے؟“ وہ بنا پلٹ جھپکے ہمارے کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا۔“ ہمارے نے شانے اچکا دیے۔

”کیا یہ عائشہ نے بنایا ہے؟“

”ہاں، مگر تم اس سے پوچھنا نہیں۔ اس کے خریدار نے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا۔“ ہمارے کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ وہ مسکرا دیا۔

”اسی لیے تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم اس کو کھول سکتی ہو؟“

”نہیں، اس کی پہلی ابھی حیا نہیں حل کر سکی تھی۔ تم کر سکتے ہو؟“ ہمارے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”شاید، مگر ہمارے گل!“ وہ ذرا سا جھکا اور دھیرے سے بولا۔ ”یہ باکس میرے پاس ہے، یہ بات میرے اور تمہارے درمیان راز رہے گی۔ تم حیا یا عائشہ کو نہیں بتاؤ گی اس بارے میں۔ ٹھیک؟“

”ٹھیک!“ ہمارے نے الجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ ”مگر تم اس کو توڑنا نہیں۔ توڑ کر کھولنے سے اس کے اندر کی موجود شے تمہارے کام کی نہیں رہے گی۔“

وہ سر ہلا کر واپس پلٹ گیا۔ ہمارے اپنی ٹکڑنگ بک چھوڑ کر اس کے پیچھے آئی۔ وہ جب تک اندر آئی، عبدالرحمن اوپر جا چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں زینے چڑھنے لگی۔

تیسری منزل پہ عبدالرحمن کے کمرے کا دروازہ نیم دا تھا۔ ہمارے نے چوکھٹ کے قریب سر نکال کر جھانکا۔

عبدالرحمن بزل باکس الماری میں رکھ رہا تھا۔ الماری کا پٹ بند کر کے اس نے لاک لگایا اور چابی اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ڈال دی۔ ہمارے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور ملی کی چال چلتی واپس اتر گئی۔

عبدالرحمن نے وہ باکس کیوں رکھ لیا اس کا ذہن کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

اب آج صبح بچے تھے اور اب وہ ”مرمرہ ہونٹ“ میں تھے۔ مرمرہ ہونٹ ماسٹم میں واقع تھا۔ جیادری جے نے غریب عوام کی طرح وہ شان دار ہونٹ باہر سے ہی دیکھا تھا۔ اگر ڈی جے ہوتی تو وہ دونوں اس بات کو بہت انجوائے کرتیں کہ اباب اسی ہونٹ میں رہ رہے تھے۔ اس کا ڈورم ڈی جے کے بغیر بہت ادھورا سا تھا۔ ڈی جے ابھی تک وہیں تھی وہ تو جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔ ہالے نے کل ڈیویم بدل لیا تھا اب وہ ڈی جے کے بنگ سے منتقل ہو گئی تھی۔ البتہ ان دونوں نے اس بنگ سے ملحقہ میز پر ڈی جے کی ٹوٹی عینک ٹیپ سے جوڑ کر رکھ دی تھی۔

رات انجم باجی اور ہالے اسی کے پاس رک گئی تھیں۔ وہ تینوں گھنٹوں ڈی جے کی باتیں کرتی رہی تھیں۔

”جب ہم پہلی دفعہ آپ سے ملے تھے تو اسے آپ کے انڈین ہونے پر بہت اعتراض تھا۔ اسے پاکستان کا ٹی ٹونشی فاسٹل میں آخری بال پر مصباح کے آؤٹ ہونے کا بہت دکھ تھا۔ اس نے اس کے بعد کرکٹ دیکھنی ہی چھوڑ دی تھی۔ بعض دکھ اصل واقعات سے بڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ڈی جے کی محبت سے ڈی جے کا دکھ بڑھ گیا ہے۔“

”اور استقلال اسٹیٹ میں جب۔۔۔“

اس کے اور ہالے کے پاس بہت سے واقعات تھے۔ وہ یادوں سے نکل کر جب سوئیں تو صبح دیر سے اٹھیں۔ آج چھٹی تھی اور اب اسے اباب سے ملنے جانا تھا۔ سو اب وہ اسی لیے تیار ہو رہی تھی۔

جو گہرا سبز فراک اس نے پہنا تھا۔ یہ وہی تھا جو وہ ڈی جے کے ساتھ آخری دفعہ پھپھو کے گھر پہن کر گئی تھی۔

”بالکل پاکستان کا جھنڈا لگ رہی ہو۔“

کچھ یاد کر کے وہ اداسی سے مسکرائی اور پرفوم اٹھایا۔ ابھی اس نے اسپرے نوزل پر انگوٹھا رکھا ہی تھا کہ ہمارے کہیں آس پاس سے بچی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟ اچھی لڑکیاں اتنا تیز پرفوم لگا کر باہر نہیں جاتیں۔“

وہ ایک دم رک گئی۔ اف عانشیے گل اور اس کی اچھی لڑکی! اسے ان باتوں کو اپنے ذہن پر حاوی نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے دوبارہ نوزل دبانا چاہا مگر بہت نہیں کیوں اس نے پرفوم واپس رکھ دیا۔

اپنے باندھے اور پی جھے پر دانے گئے الفاظ یہ وہ پہلے ہی اسکن کلر کا بینڈیج لگا چکی تھی۔ فراک کی شیغون کی آستینوں سے باندھ جھلکتے تھے۔ کلر بینڈیج نے ان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس نے سبز روپڑہ ٹھیک سے شانوں پر پھیلا یا اور کھلے بالوں کو کندھے کے ایک طرف ڈالتی باہر نکل آئی۔

”اچھی لڑکیاں بال کھول کر باہر نہیں نکلتیں۔“ وہ اپنے ذہن میں گونجتی آوازوں کو نظر انداز کرتی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

”اچھی لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی بات مانتی ہیں۔“ وہ سر جھٹکتی آخری زینہ پھلانگ آئی۔

”اچھی لڑکیاں۔۔۔ اچھی لڑکیاں۔“ اس نے اپنا سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ اندھیرے پر اندھیرے۔ لہر لہر صبح کے وقت بھی اسے ہر طرف اندھیرا لگنے لگا تھا۔ اس کی روشنی کہاں تھی؟

وہ بے دلی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی انجم باجی کے اپارٹمنٹ کی طرف آگئی۔ انجم باجی اپنا چارجر اس کے کمرے میں بھول گئی تھیں۔ ان کا چارجر لوٹا کر اس نے اب چلے جانا تھا مگر بہت نہیں کیوں رک گئی۔

”انجم باجی! میرے بالوں کی فریج بریڈ بنا دیں گی؟“ اس نے خود کو کہتے سنا۔

”ہاں شیور۔ ادھر بیٹھو!“ انجم باجی برش لے کر اس کے بال سنوارنے لگیں۔

”جیا! تمہارے بالوں کو کیا ہوا ہے؟“ فرانسیسی طرز کی چوٹی کے باریک بل باندھتے ہوئے وہ حیرت سے

کہہ اٹھیں۔ وہ ذرا سی چونکی۔

”تمہاری scalp کی جلد کا رنگ ایسا سرخ بھورا سا ہو رہا ہے پچھلے ہوئے تھے بالوں میں؟“

”نہیں! ایک شیمووری ایکٹ کر گیا تھا۔ بس چند دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اس نے ان سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

چوٹی بناتے ہوئے بال کھینچ رہے تھے اور سر کی جلد درد کر رہی تھی، مگر وہ برداشت کر کے بیٹھی رہی۔ عانشیے نے جب وہ ویکس اتاری تھی تو اس کے بالوں کو کتنا نقصان ہوا، کتنا نہیں عانشیے نے تفصیل اسے کبھی نہیں بتائی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کبھی وہ اس سارے واقعے کی تفصیل دوبارہ سے سنے گی۔

اس نے انجم باجی کے اپارٹمنٹ سے نکلنے سے قبل خود کو آئینے میں نہیں دیکھا۔ اسے پتا تھا وہ فریج بریڈ میں بہت اچھی نہیں لگ رہی ہوگی۔

حسین اور مومن گورسل شٹل سے اتر رہے تھے جب وہ اسٹاپ پر پہنچی۔

”معتصم سے کہنا مجھے اس کو کچھ دکھانا ہے۔“ وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ حسین سے کہہ کر بس میں چڑھ گئی۔ وہ واپس آجائے پھر معتصم کے ساتھ مل کر پزل باکس کی پہلی حل کرنے کی کوشش کرے گی۔

مرمرہ ہونٹ، ماسٹم ڈسٹرکٹ میں واقع تھا۔ شیغون سے ڈھکی بلند و بالا عمارت گویا کوئی اونچا سا ٹاور ہو۔ اندر سے بھی وہی چمکتا آنکھوں کو خیرہ کرنا منظر۔

وہ پتلی ہیل سے پر اعتماد انداز میں چلتی لالی میں آئی تھی۔ اباب نے بتایا تھا کہ وہ لالی میں ہی ہوں گے اور وہ اسے دور سے ہی نظر آگئے تھے۔ ان کا اس کی طرف نیم رخ تھا۔ وہ کھڑے کسی سے محو گفتگو تھے۔

وہ ان کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ نگاہ اباب کے ساتھ کھڑے دونوں افراد پر پڑی۔ ایک دم سے اس کے پاؤں برف کی سل بن گئے۔

اباب کے ساتھ کوئی اور نہیں، ان کے کاروباری شراکت دار لغاری انکل اور ولید لغاری تھے۔

گویا کرنٹ کھا کر جیا مڑی اور تیزی سے ایک دوسری راہداری میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ صید شکر کہ ان میں سے کسی کی نظر ابھی اس پر نہیں پڑی تھی۔ یہ قابل نفرت شخص کہاں سے آگیا؟ وہ اس کا سامنا کیسے کرے؟ وہ کیا کرے؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس وہ بتا دیکھے لیڈر بزنس روم کی طرف آ گئی۔

وہاں آئینے سے ڈھکی دیوار کے آگے قطار میں بیٹن لگے تھے۔ ایک طرف ہاتھ رومز کے دروازے تھے۔ ایک ترک لڑکی ایک بیٹن کے سامنے کھڑی آئینے میں دیکھتی لب اسٹک درست کر رہی تھی۔

جیاس سے فاصلے پر آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی۔ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار گردن پر ہاتھ رکھا۔ جب ولید نے اس کا روپڑہ کھینچا تھا تو اس کی گردن پر رگڑ آئی تھی۔ ڈولی کا کھدرا ہاتھ، اس کا

فرانٹنگ چین مگر سیلی کوئی ڈولی نہیں تھا۔ جو اس کے لیے آجاتا۔ وہ اکیلی تھی۔ کس سے مدد مانگے؟ اس سے جو کسی مشکل میں اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا؟ مگر شاید اب کی بار۔

اس نے جلدی سے موبائل پر جہان کا نمبر ملایا۔

طویل گھنٹیاں جا رہی تھیں۔

”اٹھا بھی چکو!“ وہ فون کلن سے لگائے کوفت زوہ سی کھڑی تھی۔ آئینے میں جھلکتے اس کے چہرے پر اب تک زخموں کے نشان مندمل ہو چکے تھے۔

پانچویں گھنٹی پر جہان کی خمار آلود آواز گونجی۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت سو رہا ہے۔ براہ مہربانی کافی دیر بعد رابطہ کریں۔ شکریہ۔“

”جہان! اٹھو اور میری بات سنو!“ وہ جھلا سی گئی تھی۔

”میں بہت تھکا ہوا ہوں مجھے سونے دو، میں نے ریسٹورنٹ۔۔۔“

”جنم میں گیا تمہارا ریسٹورنٹ۔ تم ابھی اسی وقت مرمرہ ہونٹ پہنچو۔ اباب آئے ہوئے ہیں اور ساتھ ان کے دوست وغیرہ بھی ہیں، مجھے اکیلے ان سے ملنا

اچھا نہیں لگ رہا۔“ اس کی آواز میں بے بسی اور آئی تھی۔

ساتھ کھڑی لڑکی اب بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھ رہی تھی۔

”میں نہیں آ رہا، مجھے آرام کرنے دو۔“

”ٹھیک ہے۔ جنم میں جاؤ تم اور تمہارا ریٹورنٹ۔ وہ جن لوگوں نے تمہارے ریٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی تھی نا انہوں نے بہت اچھا کیا تھا تم ہو ہی اسی قابل۔“ اس نے زور سے بٹن دبا کر کال کالی۔

ترک لڑکی اب بیسن کی سلیب پر رکھا اسکارف اٹھا کر چہرے کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ چنانچہ لمحے اسے بے خیالی میں مبتلا رہی، پھر کسی میکا کی عمل کے تحت اس نے شانوں پر پھیلا دوپٹہ اتارا اور سر پر رکھ کر چہرے کے گرد تنگ ہالہ بنا کر پلو بایں کندھے پر ڈال لیا۔ سبز دوپٹہ کر نکل جا رہا تھا اور چاروں اطراف سفید مولی پانی بن ہوئی تھی۔ پاکستان کا جھنڈا۔

کندھے، آستین، کلاسیاں تک دوپٹے میں چھپ گئی تھیں۔ مگر کیا وہ اچھی بھی لگ رہی تھی؟ شاید نہیں۔

لیکن کس کو؟ کسی نے اس سے پوچھا اور ایک دم سے اس کا دل پر سکون ہو گیا۔ اس وقت وہ لوگوں کو اچھی لگنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہ سب اللہ کو راضی کرنے کے لیے نہیں کر رہی تھی، وہ تو شاید صرف اپنا دفاع کر رہی تھی۔ نیکی، اللہ کا خوف، اسے اب بھی ان میں سے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

”ابا!“ ان کے عقب میں جا کر اس نے ان کو پکارا تو وہ تینوں ایک ساتھ ہلے۔

”اوہ مائی چائلڈ!“ ابا خوشی سے آگے بڑھے۔ وہ ایک رسمی مسکراہٹ لبوں پر سجائے ابا سے ملی اور لغاری انکل کو فاصلے سے سلام کر لیا۔

”بیٹا! یہ لغاری ہیں، میرے دوست، اور یہ ان کے صاحبزادے ہیں ولید۔“

”مجھے تو آپ جانتی ہوں گی، ہم پہلے مل چکے ہیں۔“

ولید ایک محفوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”مجھے یاد نہیں، میں ہر کسی کو یاد نہیں رکھتی۔ ذرا رکھائی سے کہہ کر وہ ابا کی طرف مڑی اور اپنی بات کا رد عمل آنے سے قبل ہی بولی۔

”آپ کو کدھر لے کر جاؤں ابا! اسٹینبول کی سیر آپ کہاں سے شروع کرنا چاہیں گے؟“

”میرا خیال ہے انکل! استقلال اسٹریٹ چلتے ہیں، اس کی رونق کے بارے میں بہت سنا ہے۔“ ولید کی مسکراہٹ ذرا سسٹی تو تھی مگر وہ ابھی بھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ استقلال اسٹریٹ کی رونق سے اس کا اشارہ اس جگہ کے بازار اور ٹائٹ کلبز کی طرف ہی تھا۔

”جہاں تم کو، تم زیادہ جانتی ہو گی اسٹینبول کو۔“ ابا مسکرا کر بولے تھے۔

”میرا خیال ہے ابا، ہم بلیو موسق (نیلی مسجد) چلتے ہیں۔ میں جہان کو بھی بتا دوں۔“ وہ سارا پروگرام بنا کر موبائل پر جہان کو میسج کرنے لگی۔ جان بوجھ کر بھی جہان کا نام لینے کے باوجود ان باپ بیٹے نے نہیں پوچھا کہ کون جہان؟“ اسے مزید کوفت ہوئی۔ اسی کوفت زدہ انداز میں اس نے میسج لکھا۔

”ہم بلیو موسق آیا صوفیہ اور توپ کی جارہے ہیں تم اسی جگہ آ جاؤ، اور اگر تم نہ آئے تو میں تم سے بھی بات نہیں کروں گی۔“

”یہی بات اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دو!“ فوراً جواب آیا تھا۔

”فائن۔ اب میں تم سے واقعی کبھی بات نہیں کروں گی۔“

”تو کیا ٹیکسٹ کرو گی؟“ ساتھ ایک معصوم سا مسکراتا چہرہ بھی تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا، اگر وہ سامنے ہوتا تو وہ اس کی گردن دو بوج لیتی۔

آیا صوفیہ اور توپ کبھی پبلز ساتھ ساتھ ہی واقع تھے اور ان کے سامنے سڑک کی دوسری جانب اسٹینبول

کی مشہور زمانہ نیلی مسجد تھی پچھلی دفعہ اگر ڈی جے اور پھر جہان کی طبیعت خراب نہ ہو جاتی تو وہ لوگ نیلی مسجد ضرور جاتے مگر اب سب بدل چکا تھا۔

نیلی مسجد (سلطان احمد مسجد) کا رنگ نیلا نہیں تھا مگر اس کی اندرونی ازبک ٹائلز نیلی تھیں۔ باہر سے اس کے گنبد یوں تھے گویا چھوٹے چھوٹے پالے لٹے رکھے ہوں۔ مسجد کے احاطے کے آگے گیٹ تھا اور اس کے باہر قطار میں بیچ لگے تھے۔ یوں کہ ہر دو پنچبڑ کے درمیان ایک میز تھی۔

بیچ پر وہ اور ابا میز کے ایک طرف جبکہ ولید اور لغاری صاحب دوسری طرف بیٹھ گئے تھے۔ موبائل حیانے گود میں رکھا ہوا تھا گو کہ اب وہ جہان کی طرف سے مایوس ہو چکی تھی۔

وہاں ہر سو کو تر پھر پھڑپھڑاتے ہوئے اثر ہے تھے۔ ہوا سے اس کا دوپٹا بھی پھسلنے لگا، وہ بار بار اسے دو انگلیوں سے پیشانی پر آگے کو کھینچتی۔ آج اسے اپنے سر سے دوپٹا نہیں کرنے دینا تھا۔ آج نہیں۔

رات کے سیمینار کے بعد یوں کرتے ہیں کہ عمید خان سے مل لیں گے۔“ ابا اور لغاری انکل آپس میں جو گفتگو تھے ولید اسے نظروں کے حصار میں لیے اس کے مقابل بیٹھا تھا۔ وہ گردن موڑ کر لا تعلق سی اڑتے کو تر دیکھ رہی تھی۔

دفعنا! اس نے ابا اور لغاری انکل کو اٹھتے دیکھا۔ چونک کر اس نے گردن موڑی۔

”تم لوگ بیٹھو، ہم ابھی آتے ہیں۔“ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

انہیں کچھ دیکھنا تھا یا کوئی مل گیا تھا یا پھر شاید ولید نے اپنے باپ کو کیوں دیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھی رہی۔ دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ ابا کو بھی ترکی آ کر اتار کر کا اثر ہو گیا تھا۔ پاکستان ہوتا تو وہ کسی یوں اپنی بیٹی کو دوست کے بیٹے کے ساتھ تنہا چھوڑ کر نہ جاتے۔

”تو میں آپ کو واقعی یاد نہیں؟“ وہ محفوظ انداز میں

مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیانے گردن پھیر کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”میرے ابا کے دوستوں کے پاس بہت سے کتے ہیں، مجھے کبھی کسی ایک کتے کا بھی نام یاد نہیں رہا۔“ وہ جواباً اسی طرح مسکرائے گیا۔

”بہت نیک ہو گئی ہیں آپ مگر اس سرخ رنگ میں آپ بہت اچھی لگتی تھیں۔“

وہ لب بٹھیکے سرخ موڑے بیٹھی رہی۔

”کچھ کھا میں گی آپ؟ کیا پسند ہے آپ کو کھانے میں؟“

”آپ کو کیا پسند ہے کھانے میں؟ فراننگ پین، اب کے وہ بھی تمہارا مسکرا کر بولی تھی۔ وہ پھر بھی ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔

”گاڑی نہیں ہے آپ کے پاس ادھر؟ آپ کے ساتھ ڈرائیو پہ جانا چاہئے اچھا لگتا۔“ وہ اسے یاد دلایا رہا تھا۔ ایک سنگین غلطی جس کا رد وہ کبھی بھی کھول سکتا تھا۔ لمحے بھر کو وہ اندر تک کانپ گئی تھی۔

”اپنی حد میں رہیں ولید صاحب! جو رات کے اندھیرے میں آپ کو فراننگ پین کی ایک ضرب سے زمین بوس کر سکتا ہے، وہ دن کی روشنی میں تو اس سے بھی بدتر کر سکتا ہے۔“ کسی احساس کے تحت اس نے چہرہ موڑا تھا۔

دور سے جہان نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ وہ ان ہی کی طرف آ رہا تھا۔ نیلی جینز پہ سفیدی شرٹ میں بلبوس، اس کے چہرے سے لگ رہا تھا، وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے۔

حیا کی انہی سانس بحال ہوئی۔ اسے زندگی میں کبھی جہان سکندر کو دیکھ کر اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی، جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔

وہ بے اختیار انھی گود میں رکھا موبائل زمین پہ جا گرا۔ وہ چونکی اور جلدی سے جھپک کر فون اٹھایا۔ اس کی اسکرین پہ بڑی سی خراش پڑ گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے

ہی ایسے ہی آئیڈیل کپل کی طرح بات کرتے رہے ہوں۔ جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی تلخ کلامی ہوئی ہی نہ ہو۔

ولید لغاری کے چہرے کی مسکراہٹ پھر یوں غائب ہوئی کہ وہ دوبارہ مسکرا نہ سکا۔ بعد میں سارا وقت وہ محتاط انداز میں اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وہ اپنے سامنے اپنے شوہر اور باپ کے درمیان بیٹھی لڑکی پہ اب نظر ڈالنے کی بھی جرات نہیں کر رہا تھا۔

اس سہ پہر جہان نے ان تینوں مہمانوں کی بہت اچھے طریقے سے تواضع کی۔ توپچی اور آیا صوفیہ (میوزیم) کی راہداریوں میں ان کو ساتھ لیے وہ ایک اچھے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ آج استنبول میں حیا کا پہلا دن تھا جب وہ بہت اعتماد سے جہان کے پہلو میں چل رہی تھی۔

”تم ان دونوں کو ہوٹل ڈراپ کر کے ابا کو گھر لے جانا“ میں خود ہی گھر آجاؤں گی۔ ابھی مجھے یہاں کچھ کام ہے۔“ واپسی کے وقت اس نے جہان سے دھیرے سے کہا تھا۔ وہ شانے اچکا کر بنا اعتراض کے ساتھ چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد وہ نیلی مسجد کے گیٹ کے اندر چلی آئی۔ اسے یہاں کوئی کام نہیں تھا اسے بس کچھ وقت کے لیے تنہائی چاہیے تھی۔

مسجد کے احاطے میں سبزہ زار پہ پانی کا فوارہ ابل رہا تھا۔ اونچے گنبدوں پر چھاؤں سی چھائی تھی۔ وہ سر جھکائے روش پہ چلتی اندر جا رہی تھی۔

”اندھیروں پہ اندھیرے“ اس کے اوپر لہر۔ اس کے اوپر بادل۔“

اس کے قدموں میں تھکاوٹ تھی۔ اس شخص کی سی تھکاوٹ جس کا سراب اسے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔ زندگی کے بائیس برس ایک دھوکے میں گزار دینے کے بعد اس کو آج پہلی بار لگا تھا کہ وہ سب صرف ایک سراب تھا۔ چمکتی ریت جسے وہ آب حیات سمجھی تھی۔

”اور نہیں بنایا جس کے لیے اللہ نے نور تو نہیں

ہوئے ولید بھی ساتھ ہی اٹھا تھا۔“ جی میڈم! آپ اپنی بات پہ قائم ہیں؟“ وہ مسکرا کر کہتا اس کے قریب آیا۔ ”پھر نگاہ ولید پہ پڑی تو اس نے سوالیہ نظروں سے حیا کو دیکھا۔“

”جہان! یہ ابا کے دوست کے بیٹے ہیں ابا ان کے والد کے ساتھ ابھی۔۔۔ وہ آگئے۔“ ابا اور لغاری انکل سامنے سے چلنے آرہے تھے۔ جہان کو دیکھ کر ابا کے چہرے پہ خوشگوار حیرت ابھری۔

”سوری ماموں! میں ایرپورٹ نہیں آسکا۔ مئی نے بتایا تھا کہ آپ نے خود منع کر دیا تھا۔“ ابا سے مل کر وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہا تھا۔ لغاری انکل اور ولید سے بھی وہ اسی خوش دلی سے ملا تھا، البتہ وہ دونوں استفہامیہ نظروں سے سلیمان صاحب کو دیکھ رہے تھے۔ ”اٹس اوکے“ آفیشلی پک کر لیا گیا تھا، ہمیں اسی لیے میں نے سین کو منع کر دیا تھا۔“ جہان نے مسکرا کر سر کو جنبش دی، پھر نگاہ لغاری انکل کے سوالیہ تاثرات پہ پڑی تو جیسے جلدی سے وضاحت دی۔

”میں جہان سکندر ہوں، سلیمان ماموں کا بھانجا اور داماد۔ حیا کا ہرنینڈ!“

مرمر کا سمندر ایک دم آسمان تک اٹھا اور کسی تھال کی طرح اس پہ انڈیل دیا گیا تھا۔ وہ اس بوچھاڑ میں بالکل سن سی ہوئی جہان کو دیکھ رہی تھی جس رشتے کے متعلق نہ پوچھنے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی اس رشتے کا اقرار یوں اس منظر نامے میں ہو گا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”داماد؟ اوہ آئی سی!“ لغاری انکل نے بمشکل مسکرا کر سر ہلایا، پھر ایک نظر ابا پہ ڈالی جو لمحے بھر کو گنگ رہ گئے تھے مگر جلدی ہی سنبھل گئے تھے۔

”مجھے خوشی ہے جہان! کہ تم آئے۔“ حالانکہ وہ اس کے آنے کے بجائے کسی اور بات پہ خوش تھے۔ ”سوری ماموں! مجھے پہلے آنا چاہیے تھا اور اگر اب بھی نہ آتا تو حیا نے مجھ سے ساری زندگی بات نہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔“ اس نے مسکرا کر کہتے حیا کو دیکھا وہ جواباً ”دھیرے سے مسکرائی۔ جیسے وہ دونوں ہمیشہ سے

ہے اس کے لیے کوئی نور۔“

اندر اس عظیم الشان ہال میں وہ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے، ٹھوڑی ان پہ جمائے ساری دنیا سے لعلق بیٹھی تھی۔

”تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور۔“

اس نے ہمیشہ اپنی مرضی کی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنی مرضی کر کے غلط کیا تھا۔ اس نے بہت دفعہ اللہ کو ”ناں“ کی تھی۔ اسے کبھی اس بات سے فرق نہیں پڑا تھا کہ اللہ اسے کیسا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہمیشہ وہی بنی رہی جیسے وہ خود کو دیکھنا چاہتی تھی۔

”وہ سمجھتا ہے اسے پانی یہاں تک کہ وہ اس کے قریب پہنچتا ہے تو وہاں کچھ نہیں پاتا اور وہ اس کے قریب اللہ کو پاتا ہے۔“

اس نے آنکھیں بند کر کے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

جن دنوں اس کا تازہ تازہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا، اس نے دوپٹا بالکل گردن میں لپیٹا شروع کر دیا تھا۔ کتنا ڈانٹتے تھے تیار فرقان اور ابا بھی شروع شروع میں کچھ کہہ دیتے، مگر جب وہ خاموشی سے ان کی بات سنی ان سنی کر کے آگے نکل جاتی تو رفتہ رفتہ سب نے کہنا چھوڑ دیا اور پھر اس سفر کی نوبت کہاں آ پچی؟ اس کی ویڈیو کو مجھے کا نام دیا گیا ایک بدنام زمانہ آدمی اس کے پیچھے پڑا تھا، صائمہ نائی اس کے بارے میں آگے پیچھے ہر جگہ نازیبا باتیں کہتی پھرتی تھیں، اور ایک اغوا کار شخص نے اس کے بازو پہ وہ نام داغ دیا تھا جو شرفاء اپنے منہ سے نہیں نکالا کرتے تھے۔

اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔

”اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔“

لوگ کہتے ہیں مسجدوں میں سکون ہوتا ہے، کوئی اس سے پوچھتا تو وہ کہتی مسجدوں میں نور ہوتا ہے۔ نور اور نور گئے۔

اس نے آہستگی سے گردن موڑی۔ اس کے بائیں طرف ایک تیرہ چودہ سال کا ترک لڑکا آ بیٹھا تھا جس کے ایک بازو پہ پلستر چڑھا تھا۔ وہ گم صم سی نگاہوں سے

اوپر مسجد کی منقش چھت کو دیکھ رہا تھا۔

”نور کیا ہوتا ہے؟ تم جانتے ہو؟“ وہ اتنے ہولے سے بولی تھی کہ اپنی آواز بھی سنائی نہ دی۔

”نور وہ ہوتا ہے جو اندھیری سرنگ کے دوسرے سرے پہ نظر آتا ہے، گویا کسی پہاڑ سے گرنا پھلے سونے کا چشمہ ہو۔“ وہ اسی طرح چھت کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اور کیسے ملتا ہے نور؟“

”جو اللہ کی جتنی مانتا ہے اسے اتنا ہی نور ملتا ہے۔ کسی کا نور پہاڑ جتنا ہوتا ہے کسی کا درخت جتنا، کسی کا شعلے جتنا اور کسی کا پاؤں کے انگوٹھے جتنا۔“

لڑکے نے سر جھکا کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔

”انگوٹھے جتنا نور، جو جلتا بجھتا، بجھتا جلتا ہے۔ یہ

ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو کچھ دن بہت دل لگا کر نیک عمل کرتے ہیں اور پھر کچھ دن سب چھوڑ چھاڑ کر ڈپریشن میں گھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔“

”اور انسان کیا کرے کہ اسے آسمانوں اور زمین جتنا نور مل جائے؟“

”وہ اللہ کو نہ کہنا چھوڑ دے۔ اسے اتنا نور ملے گا کہ اس کی ساری دنیا روشن ہو جائے گی۔“ وہ پھر سے گردن اٹھائے مسجد کی اونچی چھت کو دیکھنے لگا تھا۔

اسے محسوس ہوا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا ہے۔ وہ دھیرے سے اٹھی اور باہر کی طرف چل دی۔

”سنو!“ وہ پیچھے سے بولا تھا۔ حیا لے بھر کور کی۔

”دل کو مارے بغیر نور نہیں ملا کرتا۔“

وہ پلٹے بغیر آگے بڑھ گئی۔ دل تو مارنا پڑتا ہے، مگر ضروری تو نہیں ہے کہ ٹھوکر بھی کھائی جائے۔ انسان ٹھوکر کھائے بغیر، زخم لیے بغیر، خود کو جلانے بغیر بات کیوں نہیں مانتا؟ پہلی دفعہ میں ہاں کیوں نہیں کہتا؟

نئی مسجد کے کبوتروں کی طرح اوپر اڑنا کیوں چاہتا ہے؟ پہلے حکم پہ سر کیوں نہیں جھکا تا؟ ہم سب کو آخر منہ کے بل گرنے کا انتظار کیوں ہوتا ہے؟ اور گرنے کے بعد ہی بات کیوں سمجھ میں آتی ہے؟

اس نے پھیلی کی پشت سے دھیرے سے آنکھیں

رگڑیں اور باہر نکل آئی۔

ایک فیصلہ تھا جو اس نے نیلی مسجد کے گنبدوں کو گواہ بنا کر کیا تھا۔ اب اسے اس فیصلے کو نبھانا تھا۔

پھپھو اور ابا لاؤنج میں بیٹھے بیٹے دنوں کی باتیں کر رہے تھے۔ پھپھو بہت خوش تھیں۔ یار بار غم آنکھیں پونچھتیں۔ وہ بچن میں چائے بنا رہی تھی، جہان کیک رے میں سیٹ کر رہا تھا۔ آج اس نے کون سا اعتراف کیا ہے۔ وہ سب یوں ظاہر کر رہے تھے گویا انہیں یاد ہی نہ ہو۔

”تمہاری پڑھائی کا حرج تو بہت ہو گیا ہوگا؟ اتنے دن لگا دے اوالار میں ڈورم آفیسر نے طلبی کی ہوگی؟“ وہ کیک پہ کچھ چھڑکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں ڈورم میں حاضری مار کنگ کا کوئی نظام نہیں ہے۔ ہاں کلاسز کا حرج ہوا تو ہے، پانچ دن تو اسپرنگ بریکر میں شامل ہو گئے تھے۔ اوپر کے چھ دن کی غیر حاضری لگی ہوگی۔ اب مزید صرف ایک چھٹی کی گنجائش ہے میرے پاس!“ وہ کیتلی میں چائے ڈالتے ہوئے بولی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

”ایگز امز کب ہیں؟“

”مئی کے آخر سے جون کے پہلے ہفتے تک۔“

”اور پاکستان تم نے پانچ جولائی کو جانا ہے نا؟ یہ آخری مہینہ تو شاید صرف ترکی گھومنے کے لیے ہے۔“

”ہاں مگر ایسیج اسٹوڈنٹس کی کوشش ہوتی ہے کہ قریبی ممالک بھی دیکھ لیں۔ کوئی قطر جا رہا ہے تو کوئی پیرس۔“ وہ رے اٹھا کر جانے کے لیے مڑی۔

”ہم لندن چلیں؟“

حیا نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اوون سے اسٹینکس کی پلیٹ نکالتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا تھا۔

”ہم لندن جا رہے ہیں کچھ عرصے تک، ابا کے

علاج کے لیے۔ تم بھی چلو۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے، سوچوں گی۔“ وہ جواباً مسکرائی اور رے لیے باہر آگئی۔

”میری بہت خواہش تھی بھائی کہ یہ سب پاکستان میں، سب رشتے داروں کے ساتھ ہو، لیکن شاید ایسا جلد ممکن نہ ہو اور پھر ہم دونوں ہیں تو یہاں اس لیے میں نے سوچا کہ غیر رسمی انداز میں رسم کر لیں۔“

پھپھو شاید ابا سے بات کر چکی تھیں، تب ہی وہ مسکرا رہی تھیں، وہ جو کارپٹ پہ بچوں کے بل بیٹھی رے سے پالیاں نکال کر میز پہ رکھ رہی تھی، نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

پھپھو مسکراتے ہوئے انھیں اور چند لمحوں بعد چھوٹی سلور رے لیے آئیں جس میں سرخ فستق رکھا نظر آ رہا تھا۔ حیا نے نا سمجھی سے رے کو دیکھا، پھر بچن سے ٹرائی وٹھکیل کر لاتے جہان کو وہ بھی پھپھو کے ہاتھ میں رے دیکھ کر رکا، پھر سوالیہ نگاہوں سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”جہان سکندر! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟“ پھپھو نے بظاہر مسکراتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے متنبہ کیا۔ وہ شاید راضی نہیں تھا، مگر نہیں، کہہ کر ٹرائی آگے لے آیا۔ حیا رے میز پہ ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اب نظر آیا تھا، سرخ فیتے کے دونوں سروں پہ ایک ایک انگوٹھی بندھی تھی۔

”شادی کا وقت تو ظاہر ہے، ہم بعد میں ڈیٹائیڈ کریں گے، مگر ہر ماں کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ میں اپنی بہو کو نسبت کی انگوٹھی پہنا دوں۔ غلطی بھی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ دونوں انگوٹھیوں کو پکڑے ان دونوں کے پاس آئیں۔

ان کے ہاتھ بدھانے پہ حیا نے کسی خواب کی سی کیفیت میں اپنا ہاتھ آگے کیا، انہوں نے مسکراتے ہوئے اس میں انگوٹھی ڈالی۔ وہ ایک ساوا، پلیٹینم بینڈ تھا۔ سرخ رین کے دوسرے سرے سے بندھا بینڈ انہوں نے جہان کی انگلی میں ڈالا، پھر رے سے چھوٹی قینچی اٹھا کر رین درمیان سے کاٹا۔ دونوں کی انگلیوں پہ

سے بند حارین ان کی انگلیوں کے ساتھ جھولتا رہ گیا۔
ترکی میں منگنی شاید اسی طرح ہوا کرتی تھی۔

حیائے سن ہوتے دلغ کے ساتھ سراٹھایا۔ جہاں
پھپھو کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور وہ اس کی پیشانی
چوم کر دعا دے رہی تھیں۔ ابا بھی اٹھ کر اس کو گلے
سے لگائے دعا دے رہے تھے۔ وہ سب کتنا حسین تھا،
کسی خواب کی طرح۔ دھنک کے سارے رنگوں سے
مزین کوئی بلبلہ جو کش ثقل سے آزاد ہو کر اوپر اڑتا
جا رہا ہو۔ اوپر۔ اور اوپر۔

”تم کیوں چپ بیٹھے ہو بر خوردار؟“ ابا شاید جہاں
سے پوچھ رہے تھے۔

”میں سوچ رہا ہوں میں وہ پہلا آدمی ہوں گا جس کی
منگنی اس کی شادی کے بعد ہوتی ہے۔“

وہ دھیرے سے ہنس کر بولا تھا۔ وہ نچلا لب دباے
جلدی سے ٹرے لیے کچن میں آگئی۔ اس کا ست رنگا
بلبلہ اوپر بہت اوپر تیرتا جا رہا تھا۔

شام میں دیر سے جہاں آیا کو واپس چھوڑنے گیا اور
پھپھو اپنے کام نپٹانے لگیں تو وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔
اپنی انگلی میں اپنی انگلی سے بندھے رن کو دیکھتے
ہوئے وہ زرب لب مسکرا رہی تھی۔ تب ہی لینڈ لائن
فون کی تھنٹی بجی۔

”ہیلو؟“ اس نے ریسیور اٹھایا۔ وہ سری جانب کوئی
نسوانی آواز تھی۔

”کیا میں مسٹر جہاں سکندر سے بات کر سکتی ہوں؟“

”نہیں“ وہ ذرا باہر تک گئے ہیں۔ کوئی پیغام ہو تو
دے دیجئے۔“

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

”جہاں کو کہنا اس نے جو پارسل مجھے بھجوایا تھا وہ
کھو گیا ہے۔ کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے شاید۔ میں
اسے رات میں کال کروں گی۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے فون رکھ دیا تھا۔

حیائے ایک نظر ریسیور کو دیکھا اور پھر شانے
اچکاتے ہوئے اسے کریڈل پہ ڈال دیا۔

جہاں جب واپس آیا تو وہ لاؤنج میں منتظر بیٹھی
تھی۔ پھوپھو اب تک سونے جا چکی تھیں۔ حیا کا ارادہ
تھا کہ وہ لندن کے ٹرپ کا پروگرام جہاں سے ڈسکس
کرے اور بھی بہت سی باتیں تھیں مگر پہلے اس کا
پیغام۔

”ماموں صبح ہوٹل سے ہی ایئر پورٹ چلے جائیں
گے ہمیں آنے سے منع کر دیا ہے۔ تم یوں کو وہ
کپ کافی بنا لاؤ“ میں کچھ نئی موویز لایا تھا۔ دیکھتے
ہیں۔“

وہ بہت اچھے موڈ میں کتے ہوئے ٹی وی کے نیچے
بنے ریک کی طرف آیا تھا۔

”اوکے لاتی ہوں اور ہاں تمہارے لیے فون آیا
تھا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”کوئی لڑکی تھی نام تو نہیں
بتایا مگر کہہ رہی تھی کہ تمہارا پارسل اسے نہیں ملا
کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے۔ شاید وہ رات میں کال
کرے۔“

وہ تیزی سے مڑتے ہوئے اٹھا تھا۔

”میرا پارسل اسے نہیں ملا اور کیا کہا؟“ وہ بے یقینی
سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔ کافی لاؤس؟“

”نہیں رہنے دو۔“ وہ قدرے مضطرب انداز میں
کتے ہوئے صوفے کی طرف آیا اور فون اٹھا کر سی ایل

آئی چیک کرنے لگا۔ اس کی انگلی میں انگلی اب بھی
تھی مگر رن نہیں تھا۔

”تم۔ تمہیں صبح کی پیس بھی جانا ہو گا تم یوں کو
سو جاؤ۔ میں بس تھوڑا کام کروں گا۔“ وہ اچھے اچھے
منتظر انداز میں سی ایل آئی چیک کرتے ہوئے بولا۔

ست رنگا بلبلہ پھٹ گیا تھا۔

سارا موڈ غارت سارا ایلان ختم۔

وہ ”اچھا“ کہہ کر بدلی سے کمرے میں چلی آئی۔
اس کا گھر لاؤنج سے ملحقہ تھا۔ دروازے کی ہلکی سی
درواز اس نے کھلی رہنے دی۔ جب تک وہ سو نہیں گئی
اسے جہاں صوفے پہ مضطرب سا بیٹھا فون کو دیکھتا نظر
آتا رہا تھا۔

صبح فجر پہ اٹھی تو دیکھا جہاں اسی طرح صوفے پہ
بیٹھا فون کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رت جگمگ
سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس لڑکی کا فون نہیں آیا تھا
شاید۔ انتظار لا حاصل۔ اس کے دل پہ بہت سا بوجھ
آن پڑا تھا۔

کلاس میں وہ سر سے دوپٹا اتار کر گئی تھی اور بالکل
بیچھے بیٹھی رہی۔ باہر نکلتے ہی اس نے دوپٹا پھر ٹھیک
سے سر پہ لے لیا۔ کامن روم میں واپس آئی تو معصوم
مل گیا۔

”حیا۔ کی آہل ہے؟“ حسین اور معصوم اس
کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ ڈی جے کی سکھائی گئی
اردو۔ وہ اس مسکراہٹ کے ساتھ ان کے پاس آئی۔
”میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور آپ کی خیریت ٹھیک
چاہتی ہوں۔ مجھے تمہیں کچھ دکھانا تھا۔“ آخری فقرہ
اس نے انگریزی میں ادا کیا۔

”ہیلو باکس؟“ وہ کھلا؟“

”نہیں مگر اس پہ لکھی پہلی مل گئی ہے۔ ٹھہرو
میں لے آؤں۔“ وہ اٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔
کمرے میں آ کر اس نے بیگ کھولا، کپڑے جوئے،
سوئٹرز پرس ہر چیز الٹ پلٹ کی مگر ہیل باکس وہاں
نہیں تھا۔

”کہہ رہا تھا؟ یہیں تو تھا۔ آخری دفعہ کہاں رکھا تھا
اس نے؟“ وہ سوچنے لگی۔ ”ہاں اسٹڈی میں“ جب وہ
جہاں کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ”اوہ خدا نہ
کرے وہ پاشا کے ہاتھ لگے۔“

اس نے جلدی سے موبائل اٹھایا اور اس کی ٹوٹی
اسکرین کو دیکھتے ہوئے عائشہ کا نمبر ملانے لگی۔

سفید محل کے عقبی باغیچے میں سہ پہر اتری تھی۔
عائشہ اسٹول پہ بیٹھی، ورگ ٹیبل پہ لکڑی کا کٹرا
رکھے، نوکدار چھرے سے اس کو چھید رہی تھی۔ اس
کی آنکھیں مکمل اپنے کام پہ مرکوز تھیں۔

”عائشہ! حیا کی کال!“ ہمارے اس کاموبائل
پکڑے بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔ عائشہ نے ہاتھ روک
کر اسے دیکھا اور پھر موبائل تھام لیا۔
”سلام علیکم حیا۔“ اب وہ فون کان سے لگائے اڑی
خوش دلی سے رکی باتیں کر رہی تھی۔ ہمارے ساتھ
ہی کھڑی ہو گئی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باتیں
سننے لگی۔

”ہیلو باکس؟“ عائشہ کی مسکراہٹ ذرا سمٹی
بھنویں ابھرنے سے سکڑیں۔ ”تمہارا والا کدھر رکھا تھا؟“

ہمارے نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا دل اس
لمحے زور سے دھڑکا تھا۔

”میں نے کل ہی پوری اسٹڈی کی صفائی اپنے
سامنے کروائی ہے۔ اگر ہوتا تو مل جاتا۔ ہو سکتا ہے تم
ساتھ لے گئی ہو؟ اچھا تم فکر نہ کرو۔ میں دوبارہ دیکھ کر
کہتی ہوں۔“ اس نے موبائل بند کر کے میز پر رکھا۔

”ہمارے! تم نے حیا کا ہیل باکس تو نہیں دیکھا؟“
”نہیں!“ ہمارے نے ہولے سے نفی میں سر
ہلایا۔

”چلو پھریوں کرتے ہیں کہ مل کر تلاش کرتے ہیں۔
مہمان کی چیز میزبان کے گھر میں کبھی کھوئی نہیں
چاہیے۔ بہت شرمندگی کی بات ہوتی ہے۔“

وہ چیزیں سمیٹتے ہوئے اٹھ گئی۔ ہمارے سر جھکائے
اپنی بڑی بسن کے پیچھے چل دی۔ اس کے ذہن کے
پردے پہ صرف ایک آواز گونج رہی تھی۔

”یہ باکس میرے پاس ہے۔ یہ بات میرے اور
تمہارے درمیان راز رہے گی۔ تم حیا یا عائشہ کو نہیں
بتاؤ گی اس بارے میں۔ ٹھیک؟“

”ٹھیک عبد الرحمن!“ اس نے بے دلی سے زیر
لبو ہرایا تھا۔

اس روز جب عائشہ نے اسے ایس ایم ایس کیا تب
وہ ہالے کے ساتھ جمعہ کی نماز پہ ایوب سلطان جامعہ

آئی ہوئی تھی۔

نماز جمعہ پہ جامعہ میں خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ ترک رسم کے مطابق کم سن بچے جمعے کی نماز پڑھنے سلطان کے مخصوص لباس میں آئے۔ سنہری پگڑی سنہرا اور سفید زردار لباس، میان میں تلوار، کا مدار جوتے پہنے وہ ننھے سلاطین اپنی ماؤں کی انگلیاں تھامے ہر جگہ پھر رہے ہوتے۔

انصاری محلے میں ہالے کے ساتھ چلتے ہوئے اسے بے اختیار اپنا اور ڈی جے کا ترکی میں پسلا دن یاد آیا تھا۔ وہ دن جو بہت طویل تھا۔ اب ان ساڑھے تین ماہ میں کتنا کچھ بدل چکا تھا۔

انصاری محلے میں استنبول کے بہترین اور سستے اسکارف ملا کرتے تھے۔ وہ اب سر ڈھکے بغیر یا ہر نہیں نکلتی تھی، مگر اس کے سارے دو بٹے شیفون کے یا ریشمی ہوتے جو سر پہ نہیں نکلتے تھے۔ اب وہ یہاں ایسے اسکارف لینے آئی تھی جو ساوا اور ایک رنگ کے ہوں نہ کہ ایسے شوخ اور کام دار کہ ہر کسی کی توجہ گھیریں۔ اسے اب کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا تھا۔ جہاں اس کا تھا اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

وہ اپنے چند جوڑوں کے ساتھ ہم رنگ اسکارف پیک کروا رہی تھی جب مہینہ ٹون بجی۔ اس نے فون نکال کر خراش زدہ اسکرین کو دیکھا۔ عائشہ کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

”میں نے سارے گھر میں ڈھونڈا، مگر نہیں ملا۔ تم خود کسی دن آجاؤ دوبارہ مل کر ڈھونڈ لیتے ہیں۔“ اس نے ویک اینڈ پہ آنے کا وعدہ کر کے موبائل پر س میں رکھ دیا۔

”واپسی پہ جوا ہر چلتے ہیں، مجھے فون کی اسکرین ٹھیک کروانی ہے۔“

”شیور!“ ہالے نے ہامی بھری۔ وہ ڈی جے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ ہالے ان لوگوں میں سے تھی جو دو سروں کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور بدلے کی توقع کے بغیر مدد کرتے رہتے ہیں۔ ترکی کے پر خلوص لوگ!

تاقسم سے انہوں نے انڈر گراؤنڈ میٹرو پکڑی۔ پہلا اسٹاپ چھوڑ کر وہ دوسرے پہ اتر گئیں۔ اسٹیشن سے باہر سامنے ہی جوا ہر شاپنگ مال تھا۔ بلند وبالا کھجور کے درخت، تلش چمکتا مال۔ روشنیوں کا سمندر۔ ہالے کچھ کھانے کے لیے ٹیک اوٹ کرنے ایک ریسٹورنٹ میں چلی گئی اور وہ بالائی فلور پہ فون پیئرنگ شاپ پہ آگئی۔

”پانچ دس منٹ کا کام ہے میم! آپ کاؤچ پہ بیٹھ جائیں۔ میں ابھی کر دیتا ہوں۔“ جس ترک دکان دار لڑکے نے اس سے فون لیا تھا، وہ فون کا معائنہ کر کے بولا۔

وہ سر ہلا کر سامنے کاؤچ پہ آ بیٹھی اور ریک سے ایک میگزین اٹھا کر یونیورسٹی گروالی کرنے لگی۔ لڑکا اب شوکیس کے پیچھے کھڑا، اس کے موبائل کے ٹکڑے الگ کر رہا تھا۔ کیسنگ اتار کر اس نے بیٹھی نکالی تو ایک دم رک گیا اور سر اٹھا کر قدرے تذبذب سے حیا کو دیکھا۔

”میڈم!“ اس نے ذرا الجھن سے پکارا۔ حیا نے میگزین سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”کیا ہوا؟“

”یہ لگا رہے دوں؟“

”کیا؟“ وہ رسالہ رکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

”آپ کے فون میں جی پی ایس ٹریسر ہے۔ اسے لگا رہنے دوں؟“

”ٹریسر؟ میرے فون میں ٹریسر ہے؟“ وہ سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔

”اوہ! آپ کو نہیں معلوم تھا اور جس نے یہ ٹریسر ڈالا ہے وہ تو ہمہ وقت آپ کی لوکیشن ٹریس کر رہا ہو گا۔“

وہ ہنا پلک جھپکے اپنے موبائل کے اندر لگے ناخن برابر ایک ٹریسر کو دیکھے گئی۔

اور وہ سوچتی تھی پاشا کو اس کی لوکیشن کا کیسے پتا چلتا ہے؟ یقیناً اس کے پچھلے فونز میں بھی ٹریسرز ہوں گے۔ تب ہی۔

”یہ بہت سلفشی کمنڈ ہے میم! وہ جب چاہے

اس سے فون کا مائیک آن کر کے آپ کی گفتگو بھی سن سکتا ہے۔ اب اس کا کیا کریں؟“

وہ چند لمحے اسے دیکھے گئی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

”اسے لگا رہے دو۔“

”رہی؟“ لڑکا حیران ہوا تھا۔

”ایک ٹریسر نکالوں گی تو وہ دس اور ڈال دے گا۔ اس لیے بہتر ہے میں اس کو اسی ٹریسر سے دھوکا دیتی رہوں۔ میں ہر جگہ اسے ساتھ نہیں لے کر جاؤں گی۔ خصوصاً اس جگہ نہیں جہاں میں نہیں چاہتی کہ اس کو پتا چلے۔“

”اوہ ویری اسمارٹ!“ لڑکا مسکرا دیا۔ ”میں آپ کو کسی چھوٹی سی ڈبی میں یہ ڈال دیتا ہوں تاکہ آپ کو اسے بار بار فون سے علیحدہ نہ کرنا پڑے۔“

وہ اب احتیاط سے وہ ننھا سا ٹریسر نکال رہا تھا۔ حیا ابھی تک ہنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔

عبدالرحمن پاشا۔ وہ کیا کرے اس آدمی کا؟ وہ اپنا اتنا وقت اور توانائی اس پہ کیوں صرف کرتا تھا؟ کیا یہ اندھی محبت تھی؟ شاید کچھ اور؟

اندھیرے کمرے میں مدھم سبز نائٹ بلب کی روشنی بکھری تھی اور جزیرے کے ساحل سے سر ٹکرائی لہروں کی سرسراہٹ یہاں تک محسوس ہوتی تھی۔ عائشہ آنکھوں پہ بازو رکھے قریباً نیند میں جا چکی تھی۔ جب بہارے نے پکارا۔

”عائشہ بات سنو!“ وہ جت لٹی چھت پہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

”ہوں؟“ عائشہ کی آواز نیم غنودگی سے بوجھل تھی۔

”جب بندہ بار بار جھوٹ بولتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟“

”اللہ اسے اپنے پاس۔“ بہت جھوٹ بولنے والا لکھ لیتا ہے۔“

بہارے نے چونک کر اسے دیکھا۔ عائشہ کی آنکھوں پہ بازو تھا۔ شکر کہ وہ بہارے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”ایچناس کدھر؟ آسمانوں پہ؟“

”ہاں آسمانوں پہ۔“

”کیا اس کے نام کے ساتھ ”جھوٹا“ کسی بڑے پوسٹر پہ لکھا جاتا ہے؟“

”شاید ایسا ہی ہو۔ اب سو جاؤ۔“

”عائشہ! اگر اللہ تعالیٰ وہ پوسٹر آسمان پہ بچھا دے تو کیا سب کو اس کے نام کے ساتھ جھوٹا لکھا نظر آئے گا؟“ اس کی آواز میں انجانا سا خوف تھا۔

چشم تصور میں اس نے دیکھا، باہر تاریک آسمان پہ سرخ انگاروں سے لکھا تھا۔

”انا طویلہ کی بہارے گل۔ بہت جھوٹ بولنے والی۔“

”ہاں سب کو ہر جگہ سے وہ نظر آئے گا۔“

”جو گھر کے اندر، کمرے کے اندر ہو گا اسے بھی؟“

”ہاں اب سو جاؤ بچے! صبح کام پہ بھی جانا ہے۔“

”اور اگر کوئی بیڈ کے نیچے کھس جائے تو وہاں سے بھی آسمان نظر آئے گا؟“

”ہاں اور بہارے گل! تم اب بولیں تو میں تمہیں ٹرنک میں بند کر دوں گی۔“

عائشہ جھنجھلا کر بولی تھی۔ اس کی نیند بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ وہ سارے دن کی تھکی ہوئی تھی۔ بہارے ذرا سی عائشہ کے قریب کھسکی اور چہرہ اس کے کان کے قریب لے آئی۔

”عائشہ!“ اس نے بہت دھیمی سی سرگوشی کی۔

”کیا ٹرنک کے اندر سے آسمان نظر آئے گا؟“

”اللہ اللہ!“ عائشہ نے غصے سے بازو ہٹایا۔

بہارے نے غراب سے منہ کبل کے اندر کر لیا۔

مگر اسے کبل کے اندر سے بھی آسمان نظر آ رہا تھا۔

سرخ انگارے اسی طرح دکھ رہے تھے۔

اس شام وہ تاقسم اپنی سرخ ہیل ٹھیک کروانے آئی تھی۔ جب ہیل جڑ گئی تو وہ کسی خیال کے تحت شاپ

لیے اسکو اڑ کے مجھے کی طرف آگئی۔ ”استقلال بیمنی“ (مجموعہ آزادی)

مجھے کے گرد گھاس کے گول قطعہ اراضی کو مثبت کے نشان کی طرح دو گزر گاہوں نے کاٹ رکھا تھا جس سے گول قطعہ چار برابر خانوں میں بٹ گیا تھا۔ کپاس کے چار خانے ہر سوٹوپس کی مہک تھی۔

بہادر جرنیل اب مجسم صورت اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اتارک مصطفیٰ کمال پاشا۔ یہ وہ وہ سرا پاشا تھا جس سے اس کو شدید نفرت ہونے لگی تھی۔ صرف اس کی وجہ سے وہ روز کلاس میں اسکارف اتارتی تھی اور ٹالی اس کو ایک استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا کرتی۔ اس ایک آدمی نے اسے ہرا دیا تھا مگر۔

”انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔“ ڈی جے کہیں دور سے بولی تھی۔ وہ چند قدم مزید آگے چل کر آئی۔ اس نے مجسم ہوئے جنگجو کی پتھر آنکھوں میں دیکھا۔ یہ آدمی کیوں جیتا؟ کیونکہ یہ لڑنا جانتا تھا، کیونکہ اس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ لڑتا رہا تھا یہاں تک کہ اسے فتح مل گئی اور ایک جنگجو کو کیسے ہرایا جاتا ہے؟ اس نے میجر احمد سے دل ہی دل میں پوچھا تھا۔

”اس سے مقابلہ کر کے۔ اس سے تب تک لڑ کے جب تک فتح نہ مل جائے یا جان نہ چلی جائے۔“ جواب فوراً آیا تھا۔ اگر وہ غلط ہو کر اتنا پر اعتماد تھا تو وہ صحیح ہو کر پر اعتماد کیوں نہیں تھی؟ وہ غلط ہو کر جیت سکتا ہے تو وہ صحیح ہو کر کیوں نہیں جیت سکتی؟ وہ کیوں اتارے اسکارف؟ وہ ان لوگوں کے پیچھے اللہ کو کیوں تان کرے؟ زیادہ سے زیادہ سبائی والے نکال دیں گے تو نکال دیں۔ مگر کیوں نکال دیں؟ نہیں وہ نہ اسکارف اتارے گی نہ میدان چھوڑے گی۔

وہ اتارک کے مجھے کو یہی اسکارف لپیٹ کر سبائی کے کلاس روم میں بیٹھ کر پڑھ کر دکھائے گی۔ مسجد میں جو فیصلہ میں نے کیا تھا اسے بس اب پورا کرنا ہے۔ طیب اردگان کو قانون بدلنا پڑے سو پڑے۔ وہ مزید

اس ذلت سے نہیں گزرے گی۔ اللہ کی حدود مذاق نہیں ہوتیں۔ اب وہ اسکارف پہن کر ہی پڑھے گی دیکھتے ہیں کون روکتا ہے اسے۔ اس کی ماں اسے روئے!

اتارک کے مجھے کو دیکھتے ہوئے اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اسے زندگی بھر اپنے اسکارف پہ بھجوتا نہیں کرتا۔ وہ نقاب نہیں کر سکتی وہ برقع نہیں اوڑھ سکتی مگر اسکارف اوڑھنا۔ ایک کام ہے جو وہ کر سکتی ہے تو پھر اسے روکنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ کوئی رستہ تو ہوگا۔

”رستہ ضرور ہوتا ہے۔“ میجر احمد نے کہا تھا۔ رستے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ اسے بھی رستہ ڈھونڈنا تھا۔

آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے اسکارف کو ٹھوڑی تلے پن سے جوڑا، پھر سامنے کے دو ٹکونے پلوں میں سے ایک کو مخالف سمت چرے کے گرد لپیٹ کر سر کی پشت پہ پن سے لگا دیا۔ اسکارف خاصا بڑا تھا۔ دوسرے پلوں نے سامنے سے اسے ڈھک دیا۔ نیچے سیاہ اسکرٹ پہ اس نے پوری آستینوں والا میوٹن پھول دار بلاؤز پہن رکھا تھا۔ توقع کے برخلاف میوٹن اسکارف کے ہالے میں دھکتا اس کا چہرہ کافی اچھا لگ رہا تھا۔

کتابیں اٹھائے بیگ کندھے پہ ڈالے جب وہ سبائی کی مرکزی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو سامنے ہی ٹالی چند پور پن اسٹوڈنس کے ساتھ آئی دکھائی دی۔ وہ گزرتے گزرتے آج کل جیا کے اسکارف پہ کوئی تبصرہ کر دیا کرتی تھی۔ اب بھی جیا کو آتا دیکھ کر اس کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

”جیا! اس نے زور سے آواز دی۔ جیا اسے نظر انداز کر کے تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آج اس کی پہلی کلاس ٹالی کے ہی ساتھ تھی۔

”Haya! what colour is yuor hair today? blue?“ جیا بنا کچھ کہہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔ پیچھے سے آتے قہقہے کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا آج کل جہاں ان لڑکیوں سے سامنا ہوتا وہ اسے مسخرے سے عرب لڑکی کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ بد تمیز نہ ہوں تو۔ آج وہ بنا اسکارف اتارے کلاس میں چلی آئی اور دوسری قطار میں بہت اعتماد سے بیٹھ گئی۔ چند ہی لمحوں بعد ٹالی اس کے ساتھ آئی تھی۔

”تم نے اسکارف نہیں اتارا؟ کیا ابھی سب کے سامنے اتارو گی؟“ جواباً اس نے بہت اعتماد سے مسکرا کر ٹالی کو دیکھا۔

”دیکھتے ہیں!“ جتانے والے انداز میں کہہ کر وہ کتابیں جوڑنے لگی۔ اندر سے اس کا دل بھی عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ آج کیا ہوگا؟ وہ اسے نکال دیں گے کیا؟

پروفیسر بارصات نے ابھی لیکچر شروع بھی نہیں کیا تھا کہ ان کی نگاہ جیا پہ پڑ گئی۔

”مس۔ میرا نہیں خیال آپ کو کلاس روم میں اسکارف کرنے کی اجازت ہے۔“ وہ براہ راست اسے مخاطب کر کے بولے۔ بہت سے طلباء طالبات گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ جو ساری بڑی بڑی باتیں احادیث آیات اقوال اس نے اس موقع کے لیے یاد کر رکھے تھے وہ سب اسے بھول گئے۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہہ سوا بالکل خالی خالی نگاہوں سے پروفیسر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ٹالی بھی مسکراہٹ دبائے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مس۔ آپ ہیڈ کو رنگ دیمو کریں۔“ انہوں نے دہرایا۔

”جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے راستہ نکال دیتا ہے۔“ عائشہ نے ایک دفعہ کہا تھا۔ مگر اسے سارے

راستے بند نظر آرہے تھے۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تب ہی پیچھے سے کوئی ترک لڑکی بول اٹھی۔

”سر! یہ ایک پیچ اسٹوڈنٹ ہے۔ مہمان۔ اور یہ رول مہمانوں پہ ایلٹائی نہیں ہوتا۔“ اس نے جلدی سے اپنے پروفیسر کو کچھ یاد دلایا تھا۔

”اوہ سو ری آپ مہمان ہیں؟ پلیز تشریف رکھیے۔“ پروفیسر بہت شائستگی سے معذرت کر کے لیکچر شروع کرنے لگے۔

ٹالی کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ جیا نے ایک نظر اسے دیکھا اور دھیرے سے مسکرائی پھر گردن موڑ کر پیچھے اپنی محنت کو دیکھنا چاہا لیکچر شروع ہو چکا تھا تمام سر جھکنے لگے تھے وہ اس لڑکی کو دیکھ نہیں پائی سو چہرہ واپس موڑ لیا۔ اس کے دل و دماغ سن سے ہو چکے تھے۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں اس نے لکھنا شروع کیا۔ سب اتنا آسان ہو گا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”یہیں رکھا تھا کہاں جاسکتا ہے۔“ وہ ویک اینڈ پہ بیوک ادا آئی تھی اور اب عائشہ اور ہمارے کے ساتھ مل کر ساری اسٹڈی چھان کر پوسی سے کہہ رہی تھی۔ ”وہ بہت قیمتی تھا۔ میں اسے کھونے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔“

ساتھ کھڑی ہمارے کا چہرہ زرد اور سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت دھیرے سے چل رہے تھے آج شاید وہ بیمار تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہمار کا پھول؟“ وہ ہمارے کا یہ پڑمروہ انداز کافی دیر سے محسوس کر رہی تھی سو پوچھنے بنا نہ سکی۔

ہمارے نے گردن اٹھا کر خالی خاموش نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہی پرانا مسئلہ صبح ہمارے کو ایک سیب ملا جس میں موتی نہیں تھا۔ حالانکہ مجھے تو آج ایک بھی سیب

نہیں ملا۔" عائشہ اپنے کھرے پزل باکس کھوجانے پہ بہت اداس تھی۔

"اب میرے سیپ سے موتی کبھی نہیں نکلے گا۔" ہمارے بڑی بڑی سوہ دونوں محسوس کیے بنا اسٹڈی ٹیبل کے دراز کھول کھول کر دیکھ رہی تھیں۔

"وہ باکس عبدالرحمن کے ہاتھ نہ لگ جائے مجھے اسی بات کا ڈر ہے۔ وہ باکس اس کو نہیں ملنا چاہیے عائشہ!"

ہمارے کی جھکی گردن مزید جھک گئی۔

"ملازمہ کبھی چوری نہیں کرتی" اس نے بھی باکس نہیں دیکھا۔ کہاں ڈھونڈیں۔

جیسا تھکے تھکے سے انداز میں کرسی پہ گری گئی۔ اس کا دل بہت برا ہو رہا تھا۔

"آئی ایم سوری حیا! عائشہ نے آزدگی سے کہا۔ اسی پل کمرے میں دبی دبی سسکیاں گونجنے لگیں۔ حیا نے چونک کر ہمارے کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے ہوئے رو رہی تھی۔

"ہمارے! کیا ہوا؟" وہ دونوں بھاگ کر اس کے پاس آئیں۔ ہمارے نے بھی چہرہ اٹھایا۔

"وہ باکس عبدالرحمن کے پاس ہے۔ اس نے مجھے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا۔"

"کیا؟" وہ سانس لینا بھول گئی۔ عائشہ خود شذر سی کھڑی رہ گئی۔

"مگر مجھے پتا ہے کہ اس نے وہ کدھر رکھا ہے۔ میں تمہیں لادیتی ہوں۔" ہمارے ایک دم اٹھی اور باہر بھاگ گئی۔ وہ دونوں بالکل ساکت شذر سی اپنی جگہ کھڑی تھیں۔

پانچ منٹ بعد ہی ہمارے واپس آئی تو اس کا بھی چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پزل باکس تھا۔ وہ حیا کا پزل باکس ہی ہے اس میں کوئی شک نہیں تھا۔

"یہ لو۔ تمہاری امانت۔" اس نے باکس حیا کی طرف بڑھایا۔

"ہمارے گل! حیا سلیمان تم سے بہت پیار کرتی

ہے۔" اس نے بے اختیار جھک کر اس بھی پری کے دونوں گال چومے۔ اور تم اس کو ڈانٹنا مستحق ہونے۔ کسی کو ڈانٹنا نہیں کرتے۔" اس نے ساتھ ہی عائشہ کو کہہ دیا تھا جو ہمارے سے ذرا سی خفا لگ رہی تھی مگر اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔

آنے کسی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد وہ حیا کو واپس چھوڑنے کے لیے گھر سے نکل آئیں۔ ہمارے قریبی کلب سے عبدالرحمن کا گھوڑا لے آئی تھی اور اب اس پہ بیٹھی ان دونوں کے عقب میں چلی آرہی تھی۔

"اسے عبدالرحمن نے رائیڈنگ سکھائی ہے۔ ہمارے سے اچھی رائیڈنگ پورے ادا میں کوئی بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ عبدالرحمن کا نام وہ آخری نام تھا۔ جو اس وقت وہ سننا چاہتی تھی۔ اس نے اس کا باکس کیوں رکھا وہ یہی سمجھنے سے قاصر تھی۔

"تم پہ یہ اسکارف بہت اچھا لگتا ہے حیا! اسے کبھی مت چھوڑنا۔"

"نہیں چھوڑو گی۔ میں سب انجی سے جیت گئی میں اتارک سے جیت گئی مجھے اور کیا چاہیے۔"

"تمہیں کچھ بھی چھوڑنا پڑے" اسے مت چھوڑنا! عائشہ نے دہرایا۔ حیا نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

ان کے عقب میں گھوڑے کی پیٹھ پہ بیٹھی ہمارے نے اپنے سے عائشہ کو دیکھا تھا۔ اس کی بہن اتنے اصرار سے اپنی بات دہراتی تو نہیں تھی پھر اب کیوں؟

☆ ☆ ☆

معتمم نے جلی ہوئی اطراف والے پزل باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر ایک بڑے ڈبے کی طرف اشارہ کیا جو اس کے ساتھ گھاس پہ پڑا تھا۔

"پہلے فلوٹیلہ کے لیے فنڈوز۔"

"اوہ شیور!" وہ گھاس پہ بیٹھتے ہوئے پرس سے پیسے نکالنے لگی۔ چند نوٹ ڈبے کی درز میں ڈال کر اس نے

دیکھا اس پہ جلی حروف میں لکھا تھا۔

"فریڈم فلوٹیلہ 2010۔"

وہ مئی 2010 تھا اور اسی ماہ کے آخر تک فلوٹیلہ نے غزہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یہ بات اب تک فلسطینی بہت دفعہ دہرا چکے تھے۔

گھاس کے آگے مصنوعی جھیل دوپہر کی کرنوں سے چمک رہی تھی۔ معتمم اس چمکتی دھوپ میں باکس پکڑے کافی دیر تک اسے الٹ پلٹ کر کے دیکھتا رہا۔

"یقین کرو! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر اس "ہومر" والی پسیلی کو حل کرنا آسان ہوگا۔ ٹھہرو! کوشش کرتے ہیں۔" اس نے جلی لکڑی پہ لکھے سنہرے حروف پڑھے۔

Marked on homer's doubts
A stick with twin sprouts

"ہومر دی فلسفی تھا تا جس کے بارے میں ہر اقلیطس نے کہا تھا کہ اسے درے مارے جانے چاہئیں؟"

اس کے کہنے پہ معتمم نے سر اٹھا کر خفگی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ شائے اچکا کر رہ گئی۔ یونانی فلسفہ وہ آخری شے تھی جو اسے دلچسپ لگتی تھی مگر شاید میراج احمد کا حساب الٹا تھا۔

"ہومر کے شبہات پہ نشان زدہ اسٹک۔ یہاں کسی نشان کی بات ہو رہی ہے۔ ہومر کے شبہات مگر کیسے شبہات؟" وہ سوچنے لگا۔

"معتمم! انسان تو کسی کے لکھے ہوئے کام پہ ہی لگایا جاسکتا ہے نا تو کیا ہومر کے لکھے ہوئے کام میں کسی کے شکوک و شبہات کا ذکر ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا مگر اس کے آنے کام میں جو حصہ بعد میں آنے والے ناقدین کو مشکوک لگتا ہے اسے مارک ضرور کیا گیا ہے۔"

"کیسے مارک کیا گیا ہے؟" وہ چونکی۔ "کسی خاص نشان سے؟"

"مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ ہومر کے کام میں مشتبہ حصہ ہوتا ہے اس پہ Obelus کا نشان لگا کر مارک کیا

جاتا ہے۔"

"Obelus کیا ہوتا ہے؟"

"تمہیں اوپلس کا نہیں پتا؟ یہ ہوتا ہے اوپلس! اس نے رجسٹر کے صفحے پہ ایک سیدھی لکیر کھینچی اور اس کے اوپر اور نیچے ایک ایک نقطہ لگا دیا۔

"یہ تو تقسیم کے سمبل ہے۔ اس طرح کہونا۔" اس نے پزل باکس کی سلائیڈ اوپر نیچے کیس یہاں تک کہ پورا لفظ "اوپلس" لکھا گیا مگر باکس جلد رہا۔

"یہ صرف پہلی پسیلی کا جواب ہے حیا! ہمیں ان چاروں کے جواب تلاش کر کے ان میں سے مشترک بات ڈھونڈنی ہے۔" اس نے یاد دلایا۔

حیا نے بدلی سے پزل باکس اسے تھما دیا۔ وہ اس وقت خود کو ہمارے کی طرح محسوس کر رہی تھی اپنے تحفے کے اتنے قریب مگر اتنی ہی دور اور بے بس۔ بہت بے بس۔

☆ ☆ ☆

شام کا اندھیرا استقلال اسٹریٹ پہ اتر آیا تھا۔ گلی کی رونق اور روشنیاں اپنے عروج پہ تھیں۔ وہ اور ہالے کافی دنوں بعد استقلال اسٹریٹ آئی تھیں۔ امتحان قریب تھے سو نکل ہی نہیں پائی تھیں۔ اب نکلیں تو ڈی جے کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ خرید انہوں نے کچھ نہیں بس وینڈو شاپنگ کرتی رہیں۔ وہ آٹھ بجے والے گورسل سے آئی تھیں۔ گورسل کو واپس رات کے ڈیڑھ بجے جانا تھا سو تب تک ان کا ارادہ خوب اچھی طرح سے جدیسی میں گھومنے کا تھا۔

"پہلے تو برگر کنگ میں ڈنر کر لیتے ہیں ٹھیک؟" وہ اس روز کے بعد جہان سے بھی نہیں ملی تھی سو چاہا ملے۔

"تمہاری صلح ہو گئی اس سے؟" وہ برگر کنگ کے دروازے پہ تھیں۔ جب ہالے نے پوچھا۔ حیا نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر ہنس پڑی۔

"وہ بات تو بہت پرانی ہو گئی۔ اب تک بہت کچھ بدل چکا ہے۔" وہ ہندھم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ سیاہ

اسکراف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور اس میں دکتا اس کا چہرہ بہت مطمئن لگ رہا تھا۔
 ”ہاں! لگ تو رہا ہے۔“ ہالے شرارت سے مسکرائی۔
 حیا نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کیا۔ پلاٹینم رنگ رات کی مصنوعی روشنیوں میں چمک رہی تھی۔
 ”واٹ؟ تمہاری جہان سکندر سے منگنی ہو گئی اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟“ ہالے خوشگوار حیرت سے کہہ اٹھی۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ کے دروازے میں کھڑی تھیں۔ اطراف میں لوگ آ جا رہے تھے۔
 ”مگر ہماری شادی منگنی سے پہلے ہوئی تھی۔ یہی کوئی بیس ایکس سال پہلے۔ لمبی کہانی ہے ڈنر کے بعد سناؤں گی۔“ وہ جلدی سے ہالے کا بازو تھامے اندر چلی آئی۔ آج اس نے وہی سرخ ہیل پہن رکھی تھی اور ذرا احتیاط سے چل رہی تھی۔
 ”جہان تو چھ بجے آف کر گیا تھا۔ ابھی گھر پہ ہوگا۔“ وہاں کام کرنے والے لڑکے نے بتایا۔ اسے مایوسی ہوئی، مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
 ”مجھے پوری کہانی سناؤ۔ تم نے اتنی بڑی بات نہیں بتائی؟“ ہالے پر جوش بھی تھی اور سارا قصہ سننے کے لیے بے تاب تھی۔
 ”چلو! اتنا قسم چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر سناتی ہوں۔“ وہ ہنس کر بولی۔
 چند قدم کا تو فاصلہ تھا۔ باتوں میں ہی کٹ گیا۔ وہ اسکو اپنے آئیں تو جگہ جگہ بارش سے گلی سڑک چمک رہی تھی۔ حیا نے بے اختیار اپنے پاؤں کو دیکھا۔
 ”یہیں ٹوٹی تھی میری ہیل۔“ اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اپنی مرمت شدہ ہیل کو دیکھا۔ لکڑی کی بہت باریک ہیل اب بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ پھر کتنا خواہ کر لیا تھا اس نے اس دن۔ سرخ ہیل، سرخ کوٹ، برستی بارش۔ اسے بہت کچھ یاد آیا تھا۔

”اوپارک میں چلتے ہیں۔“ ہالے اسے بلارہی تھی مگر وہ اسی طرح کھڑی سر جھکائے اپنی ہیل کو دیکھ رہی تھی۔ لمحے بھر کو اس کے گرد جگمگا تا اسکوائر ہوا میں

تحلیل ہو گیا۔ ساری آوازیں بند ہو گئیں۔ وہ بالکل ساکت کھڑی اپنی ہیل دیکھ رہی تھی۔
 یہیں ٹوٹی اس کی ہیل یہیں۔ یہیں۔
 Snapped there a bloody pine
 بلڈی؟ یعنی خون۔ مگر خون سرخ ہوتا ہے۔ سرخ لکڑی۔ لکڑی کی ہیل۔
 Split there some tears divine
 اس کی متحیر نگاہوں نے ناقسم اسکوائر کا احاطہ کیا۔
 آفاقی آنسو، آسمان کے آنسو۔ بارش۔ نہریں تقسیم ہوتی تھیں اس جگہ۔
 Roud the emerald crusified
 اس کی نظریں مجھے کے گرد پھیلے گھاس کے قطعہ اراضی پہ جم گئیں، جنہیں دو گزر گاہیں صلیب کے نشان کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ زمرہ گھاس جو مصلوب تھی۔

And the freedom petrified
 ساکن ہوئی، پتھری آزادی۔ یقیناً ”مجسمہ آزادی“۔ اتارک کا مجسمہ استقلال یسینی
 A love lost in symbolic smell
 پیار جو کھو گیا؟
 ”ڈی جے۔“ اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ ادھر ساتھ استقلال جدی میں ڈی جے گری تھی اور روز ناقسم اسکوائر میں ٹیولپس کی مہک پھیلی تھی۔ علامتی خوشبو۔ ٹیولپس جو استنبول کی علامت تھے۔

Under which the lines dwell
 اس جگہ کے نیچے کیا تھا؟ لکیریں نہیں لائنز ہاں! میٹرو لائنز، ریلوے لائنز۔ نیچے ریلوے اسٹیشن تھا۔ ایک ایک کر کے پزل کے سارے ٹکڑے جڑتے جا رہے تھے۔

obelus کا نشان کس چیز کا نشان تھا بھلا؟
 ”حیا۔“ آوی ہمیں فالو کر رہا ہے۔“ ہالے نے اس کا بازو جھجھوڑا۔ وہ ہالے کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ کسی خوابیدہ کیفیت میں۔ وہ بریڈل کی۔
 Taksim پورے چھ حروف۔ اس کی آنکھوں

میں بے یقینی تھی اس نے پزل حل کر لیا تھا۔
 ”حیا۔“ آوی ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔“ ہالے کی آواز میں ذرا سی گھبراہٹ تھی۔ وہ جیسے کسی خواب سے جاگی اور پلٹ کر دیکھا۔
 سڑک کے اس پار کھڑا شخص اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ ایک دم برف کا مجسمہ بن گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

وہ اس چہرے کو کیسے بھول سکتی تھی؟
 عبدالرحمن پاشا۔
 آنے کے ساتھ اور انفرادی کتنی ہی تصویروں میں وہ اسے دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر جس شناسائی سے مسکرایا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔

”چلو! واپس اسٹریٹ میں چلتے ہیں۔“ وہ ہالے کا ہاتھ تھامے تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ لوگوں کے رش میں سے جگہ بناتے تیز قدموں سے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے وہ دونوں اس شخص سے دور جا رہی تھیں۔ جب حیا کو یقین ہو گیا کہ وہ ان کو کھو چکا ہے تو اسی طرح ہالے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ایک کافی شاپ میں آئی۔

”پتا نہیں کون تھا۔“ انہوں نے ایک کونے والی میز کا انتخاب کیا تھا۔ ہالے دو مک گرام گرم کافی کے لے آئی اور اب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی اس آوی کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔

”ہاں! پتا نہیں کون تھا؟“ اس نے لائق سے شائے اچکائے اور گرم کپ لبوں سے لگایا۔ ایک دم ہی کافی کا گھونٹ کسی زہری طرح اس کی گردن کو جکڑ گیا۔ اسے سامنے سے پاشا آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ کافی شاپ میں کب داخل ہوا؟ انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔

”ہالے وہ ادھر ہی آ گیا۔“ اس نے سراسیمگی کی سی کیفیت میں کپ نیچے کیا۔ ہالے نے پریشانی سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ عین ان کے سر پہ آ پہنچا تھا۔
 ”کیا میں آپ کو جوائن کر سکتا ہوں مسز جہان سکندر؟“ کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھ کر کھڑے اس نے

مسکراتے ہوئے پوچھا۔ لمبی سرمئی برساتی میں ملبوس وہ اچھا خاصا مجسمہ خیم آوی تھا۔ فریم لیس گلاسز کے پیچھے سے چمکتی آنکھوں میں واضح مسکراہٹ تھی۔ وہ لمحہ ملاقات جس سے اس کو کبھی ڈر نہیں لگا تھا، اس وقت بے حد خوف زدہ کر گیا تھا۔

”جی! ضرور بیٹھے۔“ اس نے کپ پہ اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا۔
 ہالے نے اسے آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا تھا۔ حیا نے سمجھ کر سر کو اثبات میں ذرا سی جنبش دی۔ جیسے ہی وہ کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا اس نے گرام گرم کافی اس کے چہرے پہ الٹ دی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

میرے ندیم

نیمت - 275 روپے

رضیہ جمیل

مکوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021



طرح سے جانتی ہو، صرف اتنا ہی کہا ہے کہ ہاں کیا تھا
آف۔ اور دیکھو، کیا کیا کہہ رہی ہو۔ ایک تو بچ بولا
اور۔
”تو یہ سچ پہلے کیوں نہیں بولا۔؟“
”اس سب ڈرامے سے بچنے کے لیے جو تم اب

تمہارے دو بچے رہتے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں
گر سکتی ہوں، کھانا پکاتے ہوئے جل سکتی ہوں،
تمہارے کپڑے دھوتے ہوئے مجھے کرنٹ لگ سکتا
ہے اور کچھ نہیں تو میں مر بھی سکتی ہوں۔“
”دیکھا۔ اپنے مطلب کے رنگ دینا تم کتنا اچھی

”ہاں! ہر بار۔ تم اتنے سوال کرتی ہو، ایک بات کو
اتنا کھینچتی ہو اور پھر میرا یقین بھی نہیں کرتیں۔“
”تو مجھے یقین دلاؤ نا۔ جو کچھ تم نے بتایا اس پر نہیں
ایا یقین، جب آجائے گا تو کر لوں گی۔“
”کب آئے گا یقین۔؟“
”یقین ہمیشہ سچ پر آتا ہے۔“
”تو میں ڈرانا کر رہا ہوں؟“

”معلوم نہیں، خود سے پوچھو اور مجھے بھی بتاؤ۔“
”کیا تم کبھی کسی بات کو بغیر بحث کیے جانے نہیں
دے سکتیں، اسے ویسے ہی نہیں مان سکتیں جیسے میں
بتاتا ہوں۔“

”شاید کبھی ایسا کر لوں، لیکن آج نہیں۔“ وہ اسی
انداز سے بولی جس انداز سے وہ منوائی تھی، مانتی نہیں
تھی۔

”مجھے نہیں یاد کہ میرے موبائل کے ساتھ کیا ہوا
تھا۔ کھانا دو مجھے، ورنہ میں بھوکا سو جاؤں گا۔“
”ایک اور جھوٹ۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں
سب یاد ہے۔“

”ہاں یاد ہے، سب یاد ہے۔ میں نے خود کیا تھا
آف۔ پھر؟“
”پھر۔؟“ وہ اسے گھورنے لگی۔ ”پھر یہ کہ تم نے
ایسا کیوں کیا؟“

”بس کر دیا، میری مرضی، میرا دل کر رہا تھا۔“
”بہت اچھا کیا، تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ کوئی
ایمر جنسی بھی ہو سکتی ہے۔ گھر میں تمہاری بیوی

”میں فون کر رہی تھی اور تمہارا فون آف تھا۔
کہاں تھے تم، کیوں کیا فون آف؟“ اجالا نے بمشکل
اس کے پانی پینے کا ہی انتظار کیا تھا۔ واصل کی آنکھیں
سکڑیں، جو اکثر ایسے وقت ہی سکڑ جایا کرتی تھیں۔
”بیشوری ختم ہو گئی تھی۔“

اجالا نے سامنے ٹیبل پر رکھے موبائل کو اس کے
سامنے آن کیا۔ ”بیشوری تو ہے دو پوائنٹس ہیں
ابھی۔“

”پتا نہیں! الے ہی رکھے رکھے بند ہو گیا۔ میں
سمجھا بیشوری ختم ہو گئی۔“

”آل۔ نیا موبائل ہے اور رکھے رکھے بند
ہو گیا؟“

”مجھے کیا معلوم کیسے ہوا؟“ وہ چڑ گیا۔
”جب معلوم ہو جائے تو مجھے بتا دینا۔ سالن بن چکا
ہے۔ میں روٹی بنا کر کھانا لگا دوں گی۔“

”کیا مطلب۔؟ واصل نے بے چارگی سے اس
کی طرف دیکھا۔ ”کھانا لگاؤ۔ مجھے بھوک لگی ہے۔“
”مجھے بھی بھوک لگی ہے۔ میں بھی تھک گئی ہوں
کام سمیٹ کر، مجھے بھی آرام کرنا ہے۔ تم اتنی دیر سے
آئے ہو۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے پریشان الگ ہو گئی
تھی۔ اب تم سچ بتاؤ تو میں کھانا لگا دوں۔“

”یار! کہا تو ہے آف ہو گیا تھا۔ تم میری بات کا
یقین کیوں نہیں کرتیں۔ ہر بار گھر آتے ہی سوال
سوال، تکرار۔“

”ہر بار۔“ وہ حیرت سے چیخی۔

کر رہی ہو۔“ یہ ڈراما ہے، اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں، تم سے کہیں لگانے کے لیے فون نہیں کیا تھا۔“

”تم روزانہ مجھے فون کرتی ہو تو کیا وہ ایمر جنسی ہونے پر کرتی ہو؟“

”روزانہ ایمر جنسی نہیں ہوتی۔ کبھی ہو تو سکتی ہے نا۔“

”کیا ایمر جنسی تھی آج؟“ اس نے تحمل سے پوچھا جس پر وہ اور چڑ گئی۔

”تھی نہیں ہو سکتی تھی نا! اسے اور غصہ آگیا اس کے اندر۔“

”تھی تو نہیں نا۔“ وہ زبردست مسکرا کر لگا۔ ”نہ تم گریں نہ تم جلیں نہ ہی تمہیں کرنٹ لگا۔“

”اپنی غلطی مت ماننا۔ میرا مذاق بنا لو پہلے تم۔“

”فون سی غلطی۔۔۔ کس کا خون کروا رہے ہیں نے۔“ اسے غصہ آگیا تو وہ جو کھڑی تھی جین اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی اور منہ پھلائے اسے دیکھنے لگی۔ یہ اس بات کی نشان دہی تھی کہ اسے اس کی کسی بات پر یقین نہیں آیا اور وہ اس سے ناراض بھی ہے اور اب اسے اس کی طرف اسی ایک انداز میں تب تک دیکھتے رہنا تھا جب تک وہ اسے یقین نہیں دلاوے گا۔

”تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟“ وہ اس کے مسلسل اس طرح دیکھتے رہنے کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

اجالانے آنکھوں کے زاویے کو ایسے بدلا جیسے سنا ہی نہیں کہ اس نے کیا کہا ہے۔

”آفس میں ایک کلائنٹ کے ساتھ گرا گرمی ہو گئی پھر گاڑی راستے میں خراب ہو گئی۔ جیسے تیسے اسے ٹھیک کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تمہاری کال آئے گی۔ میں نے پہلے ہی فون آف کر دیا۔ میں اس وقت کسی سے بھی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔“

”مجھ سے بھی نہیں؟“

”نہیں!“

”تو تم نے جھوٹ کیوں بولا کہ فون خود بخود بند ہو گیا تھا۔“

اگر میں کہتا کہ میں نے خود کیا تھا تو اس سے زیادہ خطرناک صورت حال ہوتی۔ سوچا تھا ایک ہی بات کہ کربات ختم کروں گا لیکن میری غلط فہمی تھی تم تو اچھا خاصا شک کرتی ہو مجھ پر۔

”میں نے کب تم پر شک کیا؟“

”کب نہیں کیا، دن میں سو بار ٹیل کرتی ہو یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا فون بڑی تو نہیں۔“ واصف نے خفا ہو کر منہ بنایا۔

”فون بڑی ہے یا نہیں یہ نہیں چیک کرتی۔ تمہارا دل چیک کرتی ہوں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”پہلے تک تمہیں میرے دل پر یقین نہیں آیا۔“ وہ اور خفا ہو گیا اور وہ اسے خفا ہی چھوڑ کر کچن میں آگئی۔ کچھ ہی دیر میں واصف بھی وہیں تھا۔

”میں تمہارے لیے اتنی مشقت کرتا ہوں۔ میرا شکریہ ادا کیا کرو۔“ اس کے عین پیچھے کرسی پر بیٹھے وہ اس کی کمر پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ شادی کے بعد سے یہ اس کا پسندیدہ کام رہا تھا۔

”تم بھی میرا شکریہ ادا کرو میں تمہارے گھر اور تمہارے بچوں کے ہزار کام روزانہ کرتی ہوں اور مجھے تو اتوار کی چھٹی بھی نہیں ملتی۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں بولی۔

”لیکن میں تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔“

”میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔“

”لیکن تم شک بھی کرتی ہو، مجھے جھوٹا فریبی کہتی ہو۔“

”میں کہتی بھی ہوں اور ثابت بھی کرتی ہوں کہ تم جھوٹے فریبی ہو۔ میرے پاس شک کرنے کی وجہ ہوتی ہے جبکہ تمہارے پاس نہیں ہوتی۔“

”وجہ۔۔۔ وجوہات ہیں اجالا! میکے کی تقریبات میں تم کیسے اپنے چھوٹے بڑے ہر سائز کے کزن کے ساتھ

ہنسی مذاق کرتی ہو۔ کیسے ان کی گردنیں دو جتی ہو تمہارے ہی خاندان کے دور نزدیک کے رشتے دار جنہیں شک کی نظروں سے گھورتے ہیں میں تو پھر تمہارا شوہر ہوں۔“

”تم بھی گھور لیا کرو۔“ روٹی بنا کر وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ کر لیا کرو سوال جواب۔“

”کر لیتا اگر وہ سب شکوک میری محبت سے قدمیں بڑے ہوتے۔“

”تمہاری محبت کا قد بڑا نہیں ہے۔ میری اپنی ذات کا یقین تمہیں کوئی شک کرنے نہیں دیتا۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری بیوی خواب میں بھی تمہیں فریب نہیں دے سکتی۔ میری ذات کو لے کر تمہاری ذات میں کوئی الجھاؤ نہیں کیونکہ میں نے الجھاؤ بننے ہی نہیں دیا۔ اس الجھاؤ کو اپنے اندر سے کاٹ کر ہمیشہ کے لیے پھینک دیا ہے۔“

”تو تمہارے خیال میں میرے اندر الجھاؤ ہے جو تمہیں الجھاؤ دیتا ہے؟“

”کچھ تو ہے۔“ اس نے ایسے کہا جیسے زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتی۔

”یعنی سب تمہاری ہی خولی ہے اور میری محبت کا تو کمال ہی نہیں۔ اتنی محبت کرتا ہوں۔“

اور وہ ایسے سر ملانے لگی جیسے وہ اس کی باتوں پر ہلایا کرتی تھی تب سے جب وہ اسے یونیورسٹی میں کہا کرتا تھا کہ اسے اس کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ ہنسی رو کے سر ملایا کرتی تھی چہرے پر وہی تاثر ہوتا تھا جو ایک نادان کی بات سن کر کسی بزرگ کے چہرے پر آجاتا ہے۔ شروع میں واصف کے لیے یہ صرف اس کی ایک ادا تھی پھر جیسے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ گیا۔ پہلے وہ اس سے لڑتا جھگڑتا تھا اسے قائل کرتا تھا، ناراض بھی ہو جاتا تھا پھر وہ اسے صرف دیکھ کر رہ جاتا۔

”نہ مانو ہم کیا جانو میرے دل کا عالم۔“

”بات یہی تو ہے کہ یہ دل تمہارا نہیں ہے۔“

”تو!“

”تو یہ کہ ہم اپنی چیزوں کو خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“ اجالانے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

”نہ کھلا۔ نہ کھلا۔ پھر وہی بات! تمہیں مجھے چڑانے میں مزا آتا ہے نا!“

”شاید! کیونکہ تمہیں چڑاتے ہوئے میں اپنے دل کے شکوک کا اظہار کر جاتی ہوں۔“ اس نے جھل جھلکی سے کہا۔

”کیسے شکوک۔۔۔ بولو جبکہ میں نے تم سے کیا اپنا ہر وعدہ پورا کیا ہے۔“ واصف نے کھانا ختم کر کے اپنی اور اس کی پلیٹ اٹھائی اور انہیں دھونے لگا۔

”گھر کے کاموں میں تمہاری مدد کرتا ہوں، آفس سے سیدھا گھر آتا ہوں۔ تمہارا اتنا خیال رکھتا ہوں، تمہاری الٹی سیدھی باتوں کا جواب دیتا بھی ہوں اور انہیں برداشت بھی کرتا ہوں۔“

”لیکن ایک وعدہ رہتا ہے۔“ کچن کی سلیب صاف کرتے اس کے ہاتھ رکنے لگے۔ ”صرف میرے ہی رہنے کا۔“

وہ دل کھول کر سنا اور اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

”تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔“

”مجھے خود نہیں معلوم کہ مجھے یقین کیوں نہیں۔“

”گزرے وقت کا حساب کتاب کر کے مجھ پر یقین کر لو۔“

”لیکن میں تو آنے والے وقت کا حساب کتاب کرتی ہوں۔“ اور وہ پھر دل کھول کر سنا۔

ان کی ایسی تکراریں ہزاروں بار ہوتی تھیں۔ ان کی پہلی ملاقات سے، محبت کے پہلی بار اظہار سے، اس کے ساتھ زندگی شروع کرنے کے پہلے دن سے۔

”اجالا یا گل ہے۔“ کثر تکرار کے اختتام پر وہ اس

کے کان کے پاس آکر چلا کر کہتا۔

”واصف باگل تھا۔“ وہ بھی اسی انداز میں کہتی۔

”میری آنکھوں میں دیکھو! کیا یہ کسی پاگل کی آنکھیں ہیں؟ کیا باگل ایسے ہوتے ہیں؟ یہ تو راجھے کی سی آنکھیں ہیں۔“

”راجھا کبھی محبت سے سیر نہیں ہوا تھا۔ ان آنکھوں میں اور۔ اور ہوا ہو گا کیا پتا۔“

”راجھے پر بھی شک! پھر بھی اس کی زندگی میں صرف ہیر ہی تھی کیونکہ شاید اسے اور۔ اور محبت ہیر سے ہی چاہیے تھی۔“

”مطلب؟“

”چھوڑو مطلب۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے گول گول گھمانے لگا ساتھ وہ گنگنا بھی رہا تھا۔

ایک روز وہ رات گئے ایسے کسی کزن کے ساتھ گھر واپس آیا۔ اس کے بار بار فون پر وہ صرف اتنا ہی کہتا رہا کہ وہ بس گھر آئی رہا ہے اور وہ ”بس“ پانچ گھنٹے بعد ہی آیا۔ دو تین بار اس کے مزید فون کرنے پر وہ جیسے غصے میں آگیا۔

”آ رہا ہوں نایار! کہا تو ہے۔“ اس کے انداز نے اجالا کا خون جلا دیا۔

”پانچ گھنٹوں میں تمہیں پانچ منٹ نہیں ملے کہ تم اطمینان سے مجھے فون کر کے بتاؤ کہ تم کہاں ہو۔ کیا کر رہے ہو۔ کب تک آ جاؤ گے۔“ اس کا کزن فیصل جاچکا تھا اور اب وہ عین اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

”مگر میں فون نہیں بھی کرتی تو تمہیں چاہیے کہ تم کرو اور مجھے بتاؤ۔ ایک لاکھ دفعہ میں نے فون چیک کیا ہاتھ میں فون لیے لیے میرا جسم شل ہو گیا اور تم اپنے کزن کو شائینگ کرواتے رہے تم گاڑی میں بیٹھ کر کسی دکان کے کونے میں کھڑے ہو کر مجھے اطمینان سے ساری بات نہیں بتا سکتے تھے۔ بیوی پرانی ہو گئی ہے، اس نے کھانا کھایا ہے کہ نہیں وہ سو سکے گی یا

نہیں تمہیں پروا نہیں۔“

”فیصل کے پاس وقت کم تھا اسے واپس دوسرے شہر جانا تھا۔ یقین کرو اتنی بری طرح سے ہم الجھ گئے خریداری میں کہ اس سب کا خیال ہی نہیں رہا۔“

”مجھے یہ مت بتاؤ کہ تم کتنے مصروف تھے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس مصروفیت میں سے کچھ وقت نکالنا کیا مشکل تھا؟“

”ہاں مشکل تھا۔“ اس نے صاف کہا۔ اس بات سے اجالا کا غصہ اور بڑھ گیا۔ ”بیوی سے بات کے لیے وقت نہیں۔ واہ۔“ وہ سوں سوں کر کے رونے لگی۔

”یہی تو بات ہے یار! تمہیں ایک بات یونہی کہہ دو تم اسے سچ جان لیتی ہو۔“ اس کے روتے ہی اس نے بچوں کی طرح اس کے گرد اپنے بازو حائل کیے۔ ”اکثر باتوں کے وہ مطلب نہیں ہوتے جو نکالے جاتے ہیں۔“

”میں وہی مطلب نکالتی ہوں جو تمہاری باتوں میں ہوتا ہے۔ رات کے ایک بجے تم گھر واپس آ رہے ہو اور تم چاہتے ہو کہ میں تم سے کچھ پوچھوں بھی نہیں۔“ خود کو اس کے حلقے سے آزاد کروا کر وہ بیڈ روم کی طرف جانے لگی۔

”میں شرمندہ ہوں۔“ وہ تیزی سے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”مجھے پروا نہیں۔“

”تم ناراض ہو؟“ اس نے انگلی سے اس کی گیلی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہیں پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔“

رات گئے تک وہ اسے مناتا رہا۔ وہ اسے منانا کر تھکتا نہیں تھا۔ یونیورسٹی سے ہی یہ اس کا پسندیدہ کام رہا تھا۔ وہ دن میں کئی کئی بار ناراض ہوتی بات کتنی ہی معمولی ہوتی مانتی وہ اپنی مرضی سے ہی تھی۔ ”تم تھکتی نہیں ہو ناراض ہو ہو کر؟“ وہ اکثر اس کے ناراض ہونے پر بار بار پوچھتا۔

”تم نہیں تھکتے مجھے منانا کر؟“

”نہیں! مجھے اچھا لگتا ہے تمہارا ناراض ہونا، بات بات پر لڑنا، ہزاروں بار ہزاروں سوال کرنا، ہر بار ایک نیا انداز ایک نیا کھیل۔“

”میں کھیل ہوں؟“

”کھیل سے کم بھی نہیں ہو۔ تمہیں یہ سوچ کر اطمینان نہیں ہوتا کہ ہر بار تمہارے نئے انداز کے ساتھ میری محبت کا انداز بھی نیا ہوتا ہے۔“

”آں۔ لیکن مجھے تو لفظ ”نئے“ نے سوچ میں ڈال دیا ہے۔ تم اتنے متلاشی ہوئے بن کے؟“

”اوه۔ یعنی تم اپنی بات کو پھر سے اپنی مرضی کا رنگ دینے جا رہی ہو؟“

”میرا خیال ہے۔ میں تمہاری بات کی گہرائی میں جا رہی ہوں۔“

”میری بات میں کوئی گہرائی نہیں یہ صرف ایک بات ہے۔“

”اس کا مطلب کہ تمہاری باقی باتیں بھی صرف باتیں ہی ہیں۔ صرف باتیں۔ ہیں نا؟“

”میرے پاس اتنا دماغ نہیں کہ یہ سب سوچوں لیکن تمہارا دماغ بہت گہرا ہے۔“

”شاید واقعات دماغ کو گہرا بنا دیتے ہیں۔“ وہ ٹھوڑی رہا تھ رکھ کر اپنے مخصوص انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں بچے سوچکے تھے اور وہ دونوں لان کی طرف بنی سیر پڑھوں پر بیٹھے تھے۔

”کیا؟“ واصف کی شکل سوالیہ بن گئی وہ جانتا تھا اس کا اس طرح سے دیکھنا۔

”تم بتاؤ کیا؟“ اجالا نے دیکھتے رہنے کا کام جاری رکھا۔ ”کچھ تو ہو گا بتانے لائق۔“

”میں نے کیا کہا اب؟“ وہ حیران ہوا۔

تم نے ان میں کسی کو مسیح کیا، پھر سینٹ آئیم اور ان بکس میں سے مسیح جو ڈیلیٹ کر دیے۔ باقی مسیح جو رہنے دیے۔ تم نے وہی مسیح کیوں ڈیلیٹ کیا؟

”کون سا مسیح۔ مجھے نہیں یاد۔“

”ا کار می مت کرو پلیر۔“

”یار! اگر وہ ہو گا ڈیلیٹ۔ اس میں ایسی کون سی بڑی بات ہے۔“

”یہی میں سوچ رہی تھی کہ آخر مسیح میں ایسا کیا تھا کہ اسے ہی خاص طور پر ڈیلیٹ کیا گیا تاکہ میں نہ بڑھ سکوں دراصل تم نے مسیح تو ڈیلیٹ کر دیا مگر ڈیلیٹوری رپورٹ ڈیلیٹ نہیں کی۔“

واصف ایسے چونکا جیسے پکڑا گیا ہو۔ اجالا کا منہ اتر گیا۔ اسے توقع تھی کہ واصف سچ بولے گا اور ان کی ایک ہزار ایک لڑائیاں صرف ایسی ایک بات پر ہونی تھیں کہ وہ اسے پہلی بار پوچھنے پر ہی حقیقت کیوں نہیں بتاتا۔

”یار! صائمہ کو کیا تھا۔“ واصف اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر ڈر گیا۔ اس کا ”ہیلو“ مسیح آیا تھا، میں نے بھی حال چال پوچھ لیا اس کا، پھر مسیح جو ڈیلیٹ کر دیے سوچا، تم موبائل دیکھو گی تو پھر پوچھو گی اور صائمہ ویسے ہی تمہیں بہت زہر لگتی ہے۔“

”یہی تو بات ہے کہ تم اس وقت تک حقیقت نہیں بتاتے جب تک میں ثبوت پیش نہ کروں، پھر تم ساری کہانی سناتے ہو۔“

”یہ غلط بات ہے۔ ہر بار تو تم ثبوت پیش نہیں کرتیں، میں خود ہی مان جاتا ہوں۔“

”تم مانتے نہیں ہو، میں منواتی ہوں۔“

”رات کے گیارہ بجنے والے ہیں۔ تمہارا پھر سے ناراض ہونے کا ارادہ ہے۔“

”پھر سے۔؟“ اس نے بھنوس اچکا کر پوچھا۔

”نہیں میرا مطلب ابھی اس وقت سونے کا ارادہ ہے؟“

”تم کبھی مجھے نہیں سمجھو گے۔“ اجالا کا منہ پھول گیا۔

وہ بالکل ایک چھوٹی سی بچی کی طرح بن جاتی تھی ایسی بچی جس کا سر رست ہر حال میں اس کے لاڈ

برطانیہ میں مقیم سات شعری مجموعوں کے خالق محبوبوں کے خوش نوا شاعر



میری ہیں رازی



سے سترہ ناول، دھڑکتیوں کا تازہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے

سوہن راہی گیت نگاری میں ایک بڑا نام ہیں، انہوں نے گیت کے کیوس کو بڑی وسعت اور کشادگی عطا کی ہے، انہوں نے سرنگیت کے سوتوں سے گیت کی نئی دنیا میں تخلیق کی ہیں۔
افتخار عارف

گیتوں کی قدیمی روایت میں پیش نظر گیتوں کے دل کی دھڑکن اور معاشرتی شعور کا نرم و نازک اسلوب سوہن راہی کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فاخر حسین

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

Idara-e-Adab London

63 - Hamilton Avenue Surbiton,

Surry, KT67PW. U.K.

Phone: 0044-0208-397-0974

اکثر اسے ایسے ہی سوال پوچھ کر الجھا دیا کرتی تھی۔

”کیا عورت میں خوبی ہوتی ہے؟“
”تو کیا نہیں ہوتی؟“

”میرا خیال ہے عورت کا عورت ہونا ہی خوبی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ خفا ہو کر بولی۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ ویسے دم بھرتے رہتے ہو میرا کہ میں یہ ہوں، میں وہ ہوں۔“

”ہاں کہتا ہوں اپنی بیوی سے کہتا ہوں اور بس۔“

”بس؟“

”بس یہ کہ تم مجھے بھاگتی ہو۔“

”کوہ۔ یعنی کہ میں تمہیں بھاگتی ہوں۔“ وہ چڑ گئی۔

”بالکل! اس لیے تمہاری خامیاں بھی میرے لیے خوبیاں ہی ہیں۔ عورت میں بس یہی خوبی ہونی چاہیے

اسے ”بھا“ جانا آنا چاہیے۔“

”بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ باقی بچے کھانا پکانا سینا

برونا، گھر کے ہزار کام جائیں بھاڑ میں، کیونکہ یہ سب

تو کسی گنتی میں ہی نہیں بس وہ اٹھلاتی پھرے شوہر

کے آگے پیچھے۔“

اور وہ ہنسنے لگا دیکھا۔ دیکھا! کتنا چڑتی ہو تم پھر۔ پھر

کہتی ہو کہ سچ نہیں بولتا۔“

”یعنی میں تمہیں بھاگتی ہوں اس لیے ہمارا یہ رشتہ

قائم ہے، میری خامیاں خامیاں نہیں۔“

خوبیاں خوبیاں نہیں۔“

”اتنی گہرائی میں تم جاتی ہو، میں نہیں

جاسکتا۔“ واصف نے معصوم شکل بنا کر کہا۔

”میں اتنا جانتا ہوں کہ جن سے محبت کی جاتی ہے وہ

”دیوتا“ بن جاتے ہیں پھر تم جانتی ہی ہو کہ دیوتاؤں کی

صرف پوجا ہی کی جاتی ہے۔“ اس کے ہاتھ سے

رہ مٹوٹ لے کر اس نے بیوی آن کیا۔

☆ ☆ ☆

”واصف سے پوچھنا تھا کہ اس دیوتا کی پوجا کب

تک کی جائے گی۔“

تو کہوں کیونکہ میرا دل چاہ رہا ہوتا ہے کہ ہم مل کر لے

کریں۔“

”اور تم ایسا نہیں کر سکتیں؟“ اجالا نے حیرت لیے

پوچھا۔

”ہاں۔ نہیں کر سکتی۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ اماں نے ایک بار کہا تھا کہ ایک عورت میں

اتنی غیرت تو ہونی چاہیے کہ وہ برداشت کرے اور گالی

نہ کھائے اور اگر گالی سے تو برداشت نہ کرے اور میں

نے برداشت کر لیا ہے کیونکہ میں گالی نہیں سن سکتی

اور برداشت اس لیے کر لیا کیونکہ میں اس کے ساتھ

رہنا چاہتی ہوں۔“

سویرا اپنی گیلی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

”وہ تو تم سے محبت کرتا تھا! کہاں گئی وہ محبت؟“

سویرا نے اسے ایسے دیکھا جیسے کسی نادان بچے کو

دیکھا جاتا ہے۔

”محبت۔ محبت کے نام پر وہ جو کھیل کھیلتا تھا وہ ختم

اب ہم میاں بیوی ہیں۔“

”میاں بیوی۔ تو کیا میاں بیوی میں محبت نہیں

ہوتی؟ کہاں چلی گئی تم دونوں کی محبت؟“

”شاید کہیں چلی گئی ہے اجالا! محبت یکطرفہ ہو تو وہ

نہ ہونے کے برابر ہی ہوتی ہے اور بیوی کی محبت تو

سرے سے ہوتی ہی نہیں۔“ وہ تلخی سے ہنسی۔

رات گئے تک سویرا کے الفاظ اجالا کے ذہن میں

گھومتے رہے۔

☆ ☆ ☆

”عورت میں تمہاری پسندیدہ خوبی کون سی

ہے؟“ واصف فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا اور وہ بور بور رہی

تھی۔ اس نے جھٹ سے لی وی آف کر کے سامنے

بیٹھ کر پوچھا۔

”یہی کہ وہ دوبارہ بیوی آن کر دے جلدی۔“

”تم اپنی بیوی سے باتیں کرو اسے دیکھو لی وی میں

کہا رکھا ہے۔“ اس کا انداز شرارت لیے ہوا تھا۔ وہ

اٹھاتا ہے۔ وہ عورت تھی اور اسے لاڈ اٹھوانا بے حد

پسند تھا۔ جب ہر بار اسے منایا جاتا تو اس کا رتبہ اور بلند

ہو جاتا۔

واصف چڑتا تو وہ بھی چڑ جاتی۔ یہ نہیں کہ یہ صرف

واصف کا ہی حق ہے۔

واصف غصہ کرنا تو وہ بھی کر لیتی۔

دونوں لڑنے پہ آئے تو جی جان لگا کر لڑتے تھے۔

”یعنی تم دونوں کا ابھی بھی یونیورسٹی والا ہی حال

ہے۔“

سویرا نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔ پہلے تو

وہ ہنسا کرتی تھی، اجالا کے لیے چوڑے قصوں پر۔ وہ

دونوں ہم نام تھیں، ہم خیال تھیں اور ایک دوسرے

کی بہترین دوست تھیں۔

”کامران تو مجھ پر چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتا ہے۔“ اس

نے اداسی سے کہا۔

”کیوں۔ کیوں کرتا ہے ایسے؟“

”پتا نہیں۔ خیال بھی بہت رکھتا ہے بس اپنے

آگے بولنے نہیں دیتا۔ کہتا ہے گھر میں راج کرو بس

سوال جواب نہ کرو۔ کہاں جا رہا ہے۔ کب آ رہا ہے کیا

کر رہا ہے غلطی سے پوچھ بھی لوں تو میری شامت

آ جاتی ہے۔ ایسے دھاڑتا ہے کہ دل دہل جاتا ہے۔“

”تمہیں اس پر شک ہے کیا کوئی اور۔“

”بات کسی اور کے ہونے کی نہیں ہے اجالا! بات

صرف اتنی سی ہے کہ ہماری زندگی میں ”محبت“ صرف

اچھا اور صرف میرے اچھا رہنے پر رہے گی۔ میری

فرماں برداری میری محبت ہے بس شادی سے پہلے

تک ہر اچھی بری بات ہم دونوں میں۔ شادی کے بعد

اسے میری طرف سے کوئی ایسی بات نہیں چاہیے۔

اسے سب کچھ اپنی پسند کا چاہیے۔ مجھے گھر میں سب

کچھ ملتا ہے صرف اسی تک جانے کا راستہ نہیں ملتا۔

کبھی میرا دل چاہتا ہے اس سے بات کرنے کو لیکن

میں اسے بلا ضرورت فون نہیں کر سکتی۔ کبھی میرا دل

چاہتا ہے کہ میں بار بار فون کر کے اسے گھر آنے کے

سوریا سنجیدہ ہو گئی جیسے کہ اب وہ اکثر سنجیدہ ہی رہتی تھی۔

”پتا نہیں کیوں اجالا! مجھے لگتا ہے واصف نے ٹھیک ہی کہا ہے، دیکھو ناں وہی عورتیں جو خزانہ ہوتی ہیں چالباز، دو نمبر گالچی بدنیت ہوتی ہیں۔ انہیں بھی تو یہ مروتی بساتے ہیں ناں کیونکہ وہ ان کے دلوں کو رام کر سکتی ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ اجالا نے پوچھا بھی اور سوچا بھی۔

”بس ایسی ہی کوئی بات ہے۔“

سوریا کو اللہ حافظ کہہ کر وہ واصف کو فون کرنے لگی۔ تیل جا رہی تھی لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا، آج کل وہ پہلے سے کہیں زیادہ مصروف رہنے لگا تھا۔ آفس میں بہت سے نئے لوگوں کو تقرر کیا گیا تھا اور وہ پرانے درکرز کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے۔ کسی نئی پراڈکٹ کی لاؤنچنگ کی وجہ سے سارے اسٹاف کو رات گئے تک کام کرنا پڑا تھا۔

شروع میں اجالا نے کافی شکوہ کیا۔ اس کی بدلی ہوئی روٹین کا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد لان میں بیٹھ کر وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ باتیں کرتے تھے، اب وہ آتا ہی اتنا لیٹ تھا کہ کھانا کھا کر سو جاتا تھا پھر جیسے اس نے سمجھوتا کر لیا۔ اب وہ شکایت بھی نہیں کرتا تھا اجالا سے اور نہ ہی اس کے چہرے پر وہ جھکن نظر آتی تھی جو شروع شروع میں آیا کرتی تھی۔

”کب تک تمہاری یہ روٹین رہے گی؟“ اس نے اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھی۔

نوالہ چباتے رہنے کے بہت دیر بعد اس نے کہا۔ ”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ جواب دینے میں اتنا وقفہ اجالا کو بہت کھلا۔

”پھر بھی کچھ پتا تو ہو گا۔“ اجالا نے خفگی سے کہا۔ واصف نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کھانا کھانے لگا اور کھانا ہی کھاتا رہا۔ اجالا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر تو تھا کہ اجالا نے اگلا سوال نہیں پوچھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ واصف ہمیں اپور وقت گزار رہا ہے؟“ وہ سوریا سے فون پر بات کر رہی تھی۔

”ہوتا تو وہ آفس میں ہی ہے۔ آفس سے معلوم کیا ہے میں نے۔ کام بھی نئی پراڈکٹ پر ہی کر رہے ہیں۔ رات گئے تک زیادہ ٹرانساف وہاں موجود ہوتا ہے۔“

”تو پھر؟“ سوریا نے پوچھا۔

”تو پھر۔۔۔“ اجالا نے خود سے ہی کہا۔ ”سب کچھ ویسا ہی ہے اور شاید کچھ بھی ویسا نہیں۔ کچھ دن پہلے میرے پاس اس کا موبائل تھا۔ اس نے کال کرنے کے لیے میرے ہاتھ سے لیا۔ واصف کا کہنا ہے کہ اس نے صرف لیا تھا اور مجھے جانے کیوں یقین ہے کہ اس نے چھینا تھا۔“

”تمہارا وہم ہے۔ تم جانتی ہو کہ واصف کتنا اچھا ہے۔“

”ہاں! اچھا تو ہے۔“ وہ خود الجھ گئی۔

واصف نے اسے گول گول گھمانا بھی چھوڑ دیا تھا اور پانی کے چھینے مارنا بھی۔ وہ اسے بار بار فون کرتی اور وہ اسے آرام سے بتا دیتا کہ کب تک وہ گھر آجائے گا اور وہ اس وقت گھر آ بھی جاتا تھا۔

لیکن ایک رات تو اجالا کے لیے حد ہی ہو گئی، جب وہ رات کے دو بجے گھر آیا۔ تین گھنٹے سے وہ اسے مسلسل فون کر رہی تھی اور اس کا فون آف تھا۔

”کہاں تھے تم؟“ لاؤنج میں اس کے داخل ہوتے ہی وہ پھٹ پڑنے کے لیے تیار تھی۔

”میں تھکا ہوا ہوں، سوئے جا رہا ہوں۔ تم اپنی پڑتال صبح کر لینا۔“ اس نے اس کے بولنے سے پہلے ہی سختی سے کہا۔

”میں بھی تھکی ہوئی ہوں۔ مجھے بھی سونا ہے۔ تمہارا فون آف تھا، بارہ بجے آفس بھی بند ہو چکا تھا۔ تم کہاں تھے دو گھنٹے؟“ وہ جیسے اسے سنے بغیر کہیں اور ہی گم تھا۔

”تم سے بات کیے بغیر میں نہ خود سوؤں گی نہ ہی تمہیں سونے دوں گی۔ تم کر کیا رہے ہو آج کل آفس میں تمہارا آفس بند ہو چکا تھا۔ واپس تم اب آ رہے

ہو۔ کہاں تھے تم؟ کہاں رہتے ہو تم؟“ وہ غصے میں تیز تیز بول رہی تھی۔ ”اور یہ فون دو مجھے اپنا۔ میں دیکھوں کہ یہ آف کیسے ہو گیا؟“ وہ فون پکڑنے اس کے ہاتھ کی طرف آئی۔

”نکو اس بند کرو اپنی۔“ واصف نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹکا۔

”اور بند ہی رکھو۔“ واصف نے دوسری بار بھی اسی سختی سے کہا۔ جیسے اسے لگا رہا۔ جیسے کھینچ کر اسے پھیٹر مارا۔

”نکو اس۔“ اجالا بھی اسی کی طرح دھاڑی۔

”ہاں۔ جو میں اب اور نہیں سنوں گا۔“

اجالا نے اس کی آنکھوں میں در آئی سختی کو دیکھا۔ اجنبیت کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں موجود کچھ نئے رنگوں کو پہچانا۔ اس کا وہ کھٹکا جو اس کے اپنے اندر واصف کو لے کر رہتا تھا اسے اس کی آنکھوں میں نظر آنے لگا۔

”میرے سامنے ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا۔“ واصف نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

اس کا انداز صاف صاف بتا رہا تھا کہ وہ اب اس کا ایک لفظ ایک سوال برداشت نہیں کرے گا۔ کوئی تکرار۔ کوئی جواز۔ وہ اب نہیں سنے گا۔

اسے اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ اب برداشت نہیں کرے گا۔

”واصف! اجالا کی آنکھیں میلی ہو گئیں اور یکایک اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ لیکن واصف نے جیسے اس کی آواز دیکھی نہ ہی اس کے آنسو دیکھے۔ وہ بیڈروم میں جا کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔

بے آواز روتے ہوئے اجالا کو گمان سا ہوا کہ واصف سلی بخار رہا ہے۔



”اجالا! تم تو اتنی نڈر ہو۔ تم تو کبھی چوکی ہی نہیں۔ پھر اس رات تم نے واصف کو بنا کچھ بتائے

سوتے کیسے دیا۔“ سوریا نے بمشکل اسے چپ کروایا تھا۔

”مجھے اسی رات۔۔۔ اسی وقت یہ معلوم ہوا سوریا کہ میں واصف کے بل بوتے پر ہی نڈر تھی۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ میں تو اس رات اس کی چٹکھاڑتی آواز سن کر ہی سمجھ گئی تھی کہ میں کتنی ڈرپوک ہوں۔

ہمت کر کے میں اس کے آفس گئی رات گئے۔ آفس تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے میں واصف کو کال کرتی رہی تھی لیکن واصف نے میری کال ریسیو ہی نہیں کی۔“

”پھر؟“

”واصف کے کیبن میں۔۔۔ میں نے دونوں کو باتیں کرتے دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں کافی کے ٹک تھے۔ واصف کے قریب ہی موبائل رکھا تھا۔

واصف نے مجھے دیکھ بھی لیا تھا لیکن واصف کو جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔ اس کی آنکھوں میں دیدہ دلیری تھی۔

ایک نظر میں۔۔۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر واپس پلٹ آئی۔“

”کون تھی وہ؟“

”اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون تھی۔“ اجالا نے اپنے گیلے گال رگڑے۔ ”سات آٹھ ماہ میں ہی اتنا کچھ بدل گیا۔“

”تمہیں وہیں واصف سے بات کرنی چاہیے تھی۔“

”کیسے کرتی۔ مجھے واصف سے ڈر لگ رہا تھا۔“

”ڈر۔“ سوریا حیران ہوئی۔

”ہاں!۔۔۔ اس کے آنسو روانی سے گرنے لگے۔“

”کیوں۔۔۔“

”کیونکہ اب وہ واصف نہیں، صرف میرا شوہر ہے۔ محبت محبت کا جو کھیل وہ کھیل رہا تھا اب شاید وہ ختم۔“

اجالا نے اسی کے الفاظ میں اسے سمجھا دیا۔



فائزہ افتخار

گیتی سیر

سیف اللہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ وہ نیپال کے دورے پر گئے تو واپسی پر میٹھا ان کے ساتھ تھی۔ وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تو سیف اللہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ سیف اللہ کی والدہ پر شکوہ خانم نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا مگر ان کی بیوی مرنے سے قبل نہ کیا۔ وہ ناراض ہو گئی اور دونوں بیٹیوں، زینبی اور ایم کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ سیف اللہ نے اپنی میسرکار کو چھوڑ کر مہر سے پسند کی شادی کی تھی۔ وہ مہر کی جدائی میں راتوں کو جاگنے لگا۔ دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال پر مہر واپس آگئی مگر وہ میٹھا کو اس گھر سے نکال نہیں سکی کیونکہ وہ مکان پر شکوہ خانم کے نام تھا۔ اور وہ میٹھا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مہر نے میٹھا کی تعلیم چھڑا دی۔ کیونکہ کاروبار مہر کے نام تھا۔ وہ میٹھا پر پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پر شکوہ خانم میٹھا کو گھر ہی میں پڑھانے لگیں۔ انہیں میٹھا کے خوابوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے خواب پر اسرار ہوتے تھے اور اکثر سچے بھی ہوتے تھے۔

علاقے میں میلہ لگا تو مہر ایم اور زینبی جوش و خروش کے ساتھ وہاں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ میٹھا بھی جانا چاہتی تھی۔ مگر مہر اور گرینی نے اسے روک دیا۔

نکولڈ



میشا نے تہہ کر لیا کہ خواہ سب سے چھپ کر سہی، میلے میں ضرور جائے گی۔ میشا نے پر شکوہ خانم کی پرانی ساڑھی اور مہر کے کمرے کے پردے کاٹ کر ایک خوب صورت لباس تیار کیا اور چہرے پر بھونڈے انداز میں میک اپ تھوپ لیا تاکہ کوئی اسے دیکھے بھی تو پہچان نہ سکے۔ کانوں میں اس نے زینی کے بندے پہن لیے۔

میشا میلے میں گئی تو اسے وہاں دیر ہو گئی۔ اسے مائر نامی ایک نوجوان ملا۔ میشا نے اسے گھرنیک ساتھ چلنے کا کہا، مگر اسے اپنا نام پتا نہیں بتایا۔ وہ مائر کو اپنے ساتھ کشتی میں لے گئی۔ میشا کشتی سے اتری تو اس کا ایک ہند کشتی میں گر گیا۔ اس کے جانے کے بعد مائر نے وہ بند اسنبھال کر رکھ لیا۔ میشا نے اپنی بے ساختہ باتوں سے اسے متاثر کیا تھا۔

مہرنے کارا کو دعوت پر بلایا، کیونکہ وہ اس کے بیٹے مائر سے اپنی کسی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ مائر دعوت پر آیا تو میشا بیماری کے باعث اس سے مل نہیں سکی۔

زینی نے وہ بند اجو اس رات میشا نے پہنا ہوا تھا اپنے دوپٹے میں بروچ کے طور پر لگایا تو مائر اسے وہ ہی لڑکی سمجھا جو اسے فیسول میں ملی تھی۔

کارا نے خاندان اور قرب جوار کی تمام لڑکیوں کو اپنے گھر مدعو کیا تاکہ مائر شادی کے لیے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ پر شکوہ خانم کا گھر انہ بھی مدعو تھا۔ مگر وہ لوگ میشا کو ساتھ نہیں لے گئیں۔

میشا گھر میں تنہا بیٹھی رو رہی تھی کہ اچانک وہاں رومان آگیا۔ اس نے اپنا تعارف پری زاو کی حیثیت سے کرایا۔ رومان نے پارٹی میں جانے کے لیے میشا کے لباس کا انتظام بھی کر دیا۔ زینی نے وہ بند الان میں پھینک دیا تھا۔ رومان نے وہ اٹھا کر میشا کے دوپٹے میں لگا دیا اور اسے دعوت میں لے گیا۔ میشا دعوت میں پہنچی تو مائر اسے دیکھ کر چونک گیا۔

قسط ۲۲

اسے دیکھ رہے تھے۔ اتنی بہت سی سوالیہ اور تنقیدی نظروں کو خود پر مرکوز پا کے وہ مزید گھبرا گئی اور جب مائر کو بے تابانہ اور بے ساختہ اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو اس کی توجہ سے شہی گم ہو گئی۔

”ہائے اللہ! اس نے مجھے پہچان لیا۔ تب ہی تو تیر کی طرح لپکا ہے ابھی مجھے بازو سے پکڑے گا اور بارہر نکال دے گا۔ مہرانا کو سب پتا چلے گا۔ وہ شامت الگ۔“

وہ وہیں بہت کی طرح استاء ہو کے سوچنے لگی۔

”مائر۔ رکو۔“

زینی نے اسے پکارنا چاہا۔ مگر وہ کسی کشش سے بندھا سیدھا اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ زینی کو مائر کی نظریں اس اجنبی لڑکی پہ جمی دیکھ کے جلن سی محسوس ہوئی جب کہ وہ نہیں جانتی تھی۔ مائر کی نظریں درحقیقت میشا کے چہرے یا وجود پہ نہیں۔ اس کے لباس پہ لگے اس جھمکے پہ تھیں۔

”نہیں یہ میشا تو نہیں؟“ زینی کے ذہن میں خیال

اس رات کی طرح آج بھی اس کا چہرہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس رات بد ہیئت، بے ہنگم میک اپ نے اس کے نقوش چھپا رکھے تھے تو آج آدھے چہرے پہ لگا ماسک انہیں عیاں کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے لائے گھٹکھریالے بال کچھ اس طرح سے چہرے اور گردن کو ڈھانے ہوئے تھے کہ ماسک سے محروم باقی کا چہرہ ان میں چھپ گیا تھا۔

اس رات کی طرح آج بھی اس کا لباس اپنی طرز کا منفرد پہنا ہوا تھا۔ اس کے ناپ سے کہیں بڑا۔ جو بار بار اس کے پیروں میں الجھ رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی چال میں وہ بے ساختگی اور بہاؤ نہیں تھا جو عموماً ہوتا ہے۔ وہ سنبھل سنبھل کے ایک ایک قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے باوجود بار بار لڑکھڑا جاتی۔

مائر کی نظروں کے تعاقب میں زینی نے بھی مڑ کے دیکھا اور حیرت سے کہنے لگی۔

”یہ کون پاگل ہے؟“

ان دونوں کے علاوہ وہاں اور بہت سے لوگ تھے جو

”لگ تو وہی رہی ہے۔“

”آپ یہاں ریست کر لیں آئی۔“

کارا ملازمہ کی مدد سے پر شکوہ خانم کو سہارا دے ایک الگ تھلگ کمرے میں لائی۔

”مناسب نہیں لگ رہا۔ سب مہمان کیا سوچیں گے۔“

وہ متذبذب تھیں، ایسے محفل میں سے اٹھ کے آنا بھی معیوب لگ رہا تھا۔

”کچھ نہیں سوچیں گے بلکہ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ جب آپ نے بتا دیا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو مجھے اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”تم میری وجہ سے پارٹی چھوڑ کے یہاں کیوں آ گئی ہو۔ جاؤ کارا۔ وہاں سب کو تمہاری کمی محسوس ہو رہی ہو گی۔“ پر شکوہ خانم نیم دراز ہو کے سانس ہموار کرنے لگیں۔

”یہ میڈ میں آپ کے پاس چھوڑے جا رہی ہوں۔ آپ کا خیال رکھے گی۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو منگوا لیجئے گا۔“

اتنے سارے لوگوں کی نظریں۔

اتنے بہت سے سوال۔

زینی کا کھوجتا کریدنا انداز۔

اوپر سے تیزی سے اس جانب بڑھتا مائر۔

وہ حواس باختہ ہو کے تیزی سے مڑی تو اس کا پیر لپے لہارے کی جھال میں بری طرح اٹکا اور وہ گرتے گرتے بچی۔

”تم وہی ہونا۔“ مائر نے اس کے بالکل سامنے آ کے راستہ روکا۔

”وہ۔۔۔ وہی۔۔۔ کون وہی؟“ میشا نے تھوک نکل کے خشک ہوتا حلق پر کیا۔

”تم اس دن مجھے بہت مشکل میں ڈال گئی تھیں۔“

جانتی ہو میں کیسے واپس گیا؟ مجھے کشتی چلانی بالکل نہیں آتی تھی۔“

میشا بے دھیانی میں اس کی بات سن رہی تھی جو بڑے وثوق سے کہہ رہا تھا جبکہ اس کی ساری توجہ زینی پہ تھی جو اسے بار بار شک بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد اب مہر کو اپنی جانب بلارہی تھی۔

”وہ۔۔۔ تو وہ تو مجھے بھی نہیں آتی۔“

میشا نے کھسکنے کے لیے پرتوٹنے کی کوشش کی مگر وہ بالکل سامنے تھا اور اسے جانے دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”تو تم اپنے گھر کیسے جاتی ہو؟ تمہارا گھر تو جھیل کے اس پار ہے ناں؟“

”نہیں؟“ میشا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

”مگر میشا۔۔۔ اسے شک تو نہیں ہو گیا کہ میں مہر ماما کی بیٹی ہوں اور سیف کا بیٹا میں رہتی ہوں۔ یہ تو بتا دے گا سب کو۔“

”میں تو۔۔۔ میرا گھر تو سفید پھولوں والی پہاڑی کے اوپر ہے۔“ ایک اور جھوٹ۔

”سفید پھولوں والی پہاڑی وہ کہاں ہے؟“

”جہاں میرا گھر ہے۔“

ترنت جواب ملنے پہ مائر مسکرایا۔ اب اسے مزید یقین ہو گیا۔ ایسی بھولی باتیں وہی کر سکتی تھی۔

”تو اب تم اسے ایسے استعمال کرتی ہو۔“

مائر نے اس کے کاندھے پہ بروچ کی طرح لگے بندے کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”اس جیسا دوسرا کھو گیا ہے ناں۔“

”تمہیں کیسے؟“

میشا پوچھتے پوچھتے رک گئی، دور سے زینی کو دیکھا جو اس کی جانب اشارہ کر کے مہر کو کچھ بتا رہی تھی۔

”زینی نے بتا دیا ہو گا۔ اب میں نے بھی اگل دیا تو یہ مجھے چور بھی سمجھے گا۔“

”پتا نہیں۔ شاید کھو گیا ہو۔ مجھے کیا ہون سا میرا ہے۔“ وہ صاف مکر گئی۔

”مجھے تو یہ بھی کسی کا کھویا ہوا ملا تھا۔ باہر گرا ہوا تھا“
میر نے اٹھالیا۔

اس نے فوراً ”بات بتائی اور اس سے پہلے کہ مار کچھ اور پوچھتا۔ وہ کترا کے نکل گئی۔ ڈر تھا زینی مہر کے ساتھ اگر اس کے چہرے سے مارک ہی نہ نوج لے۔ وہ بھانڈا پھوٹنے سے پہلے کچھ پیٹ پوجا کرنا چاہتی تھی۔

اسے کھانے کی میز کی جانب جاتے دیکھ کے ماراب کچھ مایوس سا نظر آنے لگا۔

ادھر وہ اپنا لباس سنبھالنے کے چکر میں پھر سے لڑکھرائی اور میز سے جا نکلرائی۔ اور اس پر رکھے بلوریں جگ اور گلاس ایک دوسرے پہ جا گرے۔ کئی ایک تو کرجی کرجی ہو گئے۔ جواب تک اس کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے وہ بھی ہو گئے اور میشا گھبرا کے کانٹے ہاتھوں سے یہ سب ٹھیک کرنے لگی۔ نظر بار بار بھٹک کے اس میز تک جا رہی تھی جہاں چاکلیٹس کا ڈھیر لگا تھا۔

کسی مغنیہ نے سر چھیڑے تو لوگ میشا کی بدحواسیوں اور عجیب و غریب حلیے سے نظر ہٹا کے اس کی جانب مشغول ہو گئے اور میشا کھسکتی کھسکتی چاکلیٹوں والی میز کے پاس جا پہنچی۔ دونوں ہاتھوں میں چاکلیٹس بھرنے کے بعد اس نے انہیں چھپانے کی کوشش کی۔

”کیسا فضول۔ بے کار ڈریس ہے۔ کوئی ایک پاکٹ بھی نہیں ہے کہ چاکلیٹ چھپائی جاسکے۔ ہاں بھئی پرستان سے جو آیا ہے۔ پیروں کو کیا ضرورت ہوئی ہے۔ چیزیں چوری کرنے یا چھپانے کی۔ ان کا تو جب جی چاہے جلد سے ہر چیز اپنے سامنے حاضر کر لیتی ہیں۔“

”یہ کون لڑکی ہے کارا! تمہارے سر والی عزیزوں میں سے ہے؟“

مہر نے کارا سے پوچھا تو اس نے لاعلمی میں شانے اچکائے۔

”نہیں۔ شاید آس پاس سے آئی ہو۔“

”مہر کتنی دیکھو اس کی۔“

مہر کے کہنے پہ کارا نے توجہ دی۔ وہ ایک ہاتھ سے دھڑا دھڑ چاکلیٹس کھانے میں تو دوسرے ہاتھ سے انہیں چھپانے میں مصروف تھی۔ نفس طبع کارا کے ہاتھ پہ ناگواری سے تل آگئے۔ جن پہ میشا کی نظر جیسے ہی پڑی وہ گھبرا کے چاکلیٹ پھینکتی تیزی سے مڑی کہ مہر اور کارا کی نظروں کے حصار سے دور جاسکے۔ وہ ایک بار پھر سامنے سے آنے والے وجود سے جا نکلرائی اور یہ کوئی اور نہیں ایسی تھی۔

”ماما۔“

ایسی کے ہاتھ میں کیک کا بڑا سا پیس تھا۔ مگر میشا کے ٹکرانے کی وجہ سے وہ ٹکڑا اس کی ٹانگ اور ہونٹوں پہ جا لگا اور پھیل کے اسے بدہیت بنا گیا۔ وہ منہ بسورے مہر کو پکارنے لگی۔

”یہ ہے کون؟ تماشا لگا کے رکھ دیا۔“

مہر کو بڑبڑاتے ہوئے یہاں کا رخ کرتے دیکھا تو میشا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

لوجی۔ اب یہ آئیں۔ مارک اتارا اور پڑے میرے چہرے پہ طمانچے۔ سب کے سامنے انسلٹ!

”کیا؟ تم نہیں جانتیں یہ کون ہے۔ آنٹی خانم کو لے کر آؤ۔ وہ یہاں کے سب لوگوں کو اچھی طرح پہچانتی ہیں۔“

کارا اپنی کسی ملازمہ سے کہہ رہی تھی۔ میشا کے کان میں یہ بات پڑی تو وہ مرنے والی ہو گئی۔ جانتی تھی کہ گرجی اسے سات برسوں میں بھی پہچان لیں گی۔ اب تو بھاگنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا لباس مٹیوں میں بھر کے اور اٹھایا اور لگا دی دوڑ۔

راستے میں کتنوں سے ٹکرائی۔ کتنوں کو دھکا دیا۔ کتنی چیزیں پیروں کی ٹھوک سے پرے ہٹائیں۔ یہ سب دیکھنے کا ہوش نہیں تھا۔

”جا کے دیکھو اسے کون تھی یہ؟“

کارا نے کچھ ملازموں کو اس کے پیچھے بھیجنا چاہا مگر مارنے روک دیا۔ اسے اس اجنبی لڑکی کے آنے سے

جو موہوم سی آس بندھی تھی وہ اس ساری بد مزگی سے خود ہی دم توڑ گئی۔

”جانے دیں مام! پہلے ہی بہت mess ہو گیا ہے پارٹی میں۔“

”مجھے تو لگتا ہے کسی نے یہ سب کرنے کے لیے اسے بھیجا تھا یہاں۔“

میسا کو بڑے سے دروازے کے بار بھاگتے دیکھ کے زینی کے چہرے پہ اطمینان بھری مسکراہٹ چھا گئی۔ کہیں نہ کہیں اس کے دل میں یہ شک ضرور تھا کہ یہ آنے والی لڑکی ہونہ ہو۔ میشا ہی تھی۔

رومان جھیل کے کنارے بیٹھا اس میں کنکریاں پھینکتا جا رہا تھا۔ اور پھر کنکری کے گرنے پہ جھیل کی سطح پہ جودائے بنتے تھے وہ رومان کے چہرے پہ ہلکی سی مسکان لے آتے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں اور اس دلچسپ کھیل میں اس قدر محو تھا کہ اسے ذرا بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ اس کے عقب میں میشا بھاگتی آرہی تھی اس نے اپنا ریشمی گلابی لباس کافی اوپر تک اٹھا رکھا تھا۔ تیز بھاگنے کے لیے اپنے اوپری ایڑی والی سینڈل بھی ہاتھوں میں پھنسا رکھے تھے۔ مارک چہرے سے اوپر کر کے بالوں میں اڑس رکھا تھا۔ رومان اپنے خیالوں سے اس وقت ہڑبڑا کے چونک اٹھا جب میشا اس کے بالکل سر پہ پہنچ گئی اور اس کی پشت پہ دے دھڑا دھڑ گھونٹے برسانے اور برا بھلا کہنے لگی۔

”بہت برے ہو تم۔ گندے۔ فضول۔“
وہ گھبرا کے اٹھا اور اسے روکنے کے کوشش کی۔

”ناگل ہو گئی ہو؟ یہ کیا حرکت ہے؟“
لیکن وہ اس کی سنے بغیر اپنی کہے جا رہی تھی۔ کہے

جا رہی تھی اور رویے جا رہی تھی۔
روئے جا رہی تھی اور اب اس کے سینے پہ زور زور سے مارے جا رہی تھی۔

”ذلیل کروا کے رکھ دیا مجھے تماشا بنوا دیا میرا۔ گندے۔“

آخر رومان نے اس کی دونوں کلائیوں زور سے دبوچ لیں۔ ”اٹاپ بیٹا۔“

اس کے تخت لہجے اور گرفت پہ مشیما خائف ہو کے چپ ہو گئی۔ مگر اب وہ پوری طرح سے پھر پھڑا کے اپنی کلائیوں اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ رومان جانتا تھا جیسے ہی اس نے ہاتھ چھوڑے وہ پھر سے مشتعل ہو جائے گی اس لیے اس نے مزید مضبوطی سے اسے جکڑ لیا۔

آخر بے بس سی ہو کے میشا نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اسے کچھ اس طرح دیکھا کہ رومان پکھل گیا۔

”کیا ہوا بیٹا؟“

اس بار اس کا لہجہ بہت نرم تھا جس پہ میشا اس کے سینے پہ ہاتھ لگا کے سسک کے رو پڑی۔ اس کے آنسو ارمان کے گریبان میں جیسے جیسے جذب ہو رہے تھے۔ وہ جیسے اس کے آنسوؤں کے حصار میں بھگ رہا تھا۔ یہ سسکیاں شاید اس پہ کوئی منتر پھونک رہی تھیں۔ اس سحر کے عالم میں جیسے ہی اس کے ہاتھ سے میشا کی کلائیوں چھوئیں، وہ رونا بھول کے پھر سے پہلے دالے جلائی موڑ میں آگئی اور لگی اس کے سینے پہ مکے برسانے۔

”تم۔ ایک دم بے کار فیری میں ہو۔ اگر تمہارا موڑ نہیں تھا نیچے آ کے میری مدد کرنے کا تو اوپر بڑے سڑتے رجتے منع کر دیتے اپنی گرینڈ ماکو۔ کباڑا کر کے رکھ دیا میرا سب کے سامنے۔“

”اس سے پہلے کہ مزید کباڑا ہو جائے۔ تم گھر تو پہنچو۔ اپنی کھڑوس ماما کے پنچنے سے پہلے پہلے۔“

رومان نے اس کا ہاتھ کھینچا اور اسے گھسیٹا ہوا لے جانے لگا۔

اس کی زندگی کا یہ پہلا سفر تھا موٹر بائیک پہ۔ جاتے ہوئے وہ جتنی خوش اور بر جوش تھی۔ اب واپسی پہ اتنی ہی چپ چاپ اور مقہوم تھی۔ خاموش

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO



اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت - 75 روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور سی آر آر سے منگوانے والے

دو بوتلیں - 200 روپے

تین بوتلیں - 275 روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

دفتری خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 32216361

رومان دے پاؤں گھر میں داخل ہوا۔

راہداری میں نیم تاریکی تھی۔ وہ پھونک پھونک
کے قدم اٹھا رہا تھا مگر اس کے بھاری لانگ شوژ لکڑی
کے فرش پہ اتنی احتیاط کے باوجود بھی ہلکی سی دھمک
سدا کر رہے تھے اس نے جھک کے ان کے تھے
ٹھوڑے۔ ویسے بھی کچھ سے بھرے جوتے اندر لے جا
کے اس نے اپنی شامت نہیں لائی تھی۔

جوتے ایک طرف رکھنے کے بعد اس نے بائیک کی
چابیاں لٹکائیں۔ جیب سے وہ ماسک نکالا جو میٹھا نے
سنا تھا اور بغل میں دبایا وہ گلابی لبادہ۔ دے پاؤں وہ
بغلی کمرے میں داخل ہوا اور بغیر بتی جلانے اسی نیم
تاریکی میں۔ محض اندازے کے سہارے الماری
تک بڑھا۔ دھیرے سے الماری کھول کے اس میں
گول مول کر کے بغل میں دبایا لباس پھینکا۔ ایک
دراز میں ماسک رکھا اور اسی رازداری کے ساتھ وہاں
سے نکل آیا۔ ایک اور دروازے کو ذرا سا کھول کے
اندر جھانک کے اطمینان کیا۔

بیڈ پہ کمبل کا پاڑ سا بٹا تھا جس کے اندر سے کوئی
نسوانی وجود۔ بلکہ بے پناہ وجود خراٹے لیتا لرز رہا
تھا۔ اسے گہری نیند سوتے دیکھ کے رومان کی سانس
قدرے ہموار ہوئی۔ دروازہ اسی احتیاط سے بند کر کے
وہ کچن تک آیا۔ فریج سے ایک سیب آدھا کھایا
برگر اور پانی کی بوتل نکال کے وہ لکڑی کا تنگ زینہ طے
کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ بے تابی سے برگر کے بڑے
بڑے نوالے نگل رہا تھا۔ یہ زینہ اس مختصر سی اسٹور نما
گیلری میں جا کے ختم ہوتا تھا جو اس کا ٹھکانا تھا۔ نیچی
چھت والا۔ سیلن زدہ۔ کسی بھی قسم کے فرنیچر
آرائش، آرائش اور سہولت سے محروم۔ اس
نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور سیب کترتے ہوئے سامنے
دیکھنے لگا۔ برابر والے گھر کے سب سے اوپر والے
کمرے کا پردہ ہمیشہ کی طرح ہٹا ہوا تھا۔ چاند کی
روشنی سیدھی میٹھا پہ پڑ رہی تھی جو روتے روتے
نڈھال ہو کے سوچکی تھی۔

رومان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور نگاہوں میں

نظریں چراتی اس کے شانوں پہ اپنے دونوں ہاتھوں کا
دباؤ ڈالتی تھوڑی اوپر ہوئی۔

گھر آتے ہی ان سب کے قدموں کا رخ میٹھا کے
کمرے کی جانب تھا۔ پر شکوہ خانم کے ہاتھ بھی
وہیل چیئر کو تیزی سے آگے دھکیل رہے تھے۔ ان کی
تشویش کی وجہ سراسر دوسری تھی۔ وہ میٹھا کو اکیلے چھوڑ
کے جانے پہ پشیمان اور متاسف تھیں اور ساتھ ساتھ
اس کی متوقع ناراضی کا سوچ سوچ کے سریشان بھی جبکہ
وہ تینوں ماں بیٹی اپنا شک دور کرنا چاہتی تھیں۔
”تمہاری طرح مجھے بھی میٹھا شک ہے مگر سوچتی
ہوں وہ لاکھ گھر میں سے کیسے نکلی ہوگی۔“

مہرنے سرگوشی کی جس کی تائید ایچی نے کی۔
”اور وہاں تک اتنی جلدی گئی اور واپس کیسے آئی ہو
گی اور اس کے پاس وہ کپڑے کہاں سے آئے ہوں
گے۔“

”لیکن ایک بار۔ صرف ایک بار۔ صرف اس
کے چہرے کے پارے میں نہ سوتے ہوئے یہ تصور کرو
کہ وہ واقعی میٹھا تھی تو آپ دونوں کو بھی یقین آجائے گا
۔۔۔ وہی بال وہی قد و قامت وہی فضول حرکیں۔۔۔
صرف شکل و صورت چھپانے سے۔“

گھر کے اوٹھ کھلے دروازے تک پہنچ کے وہ جیب
ہو گئی۔ ان کی چہ میگوئیوں کے دوران پر شکوہ خانم پہلے
وہاں پہنچ گئی تھیں۔ اور اب سوئی ہوئی میٹھا کے
چہرے پہ محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

”سوری میٹھا۔ گرینی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے
تھا۔“

میٹھا کے چہرے پہ آنسو خشک ہو کے نشان چھوڑ
چکے تھے۔ نیند میں بھی وہ ہلکی ہلکی سسکیاں لے رہی
تھی۔

مہراچی اور زینی نے حیرت سے ایک دوسرے کو
دیکھا اور پھر شانے اچکا دیے۔

آنسو بہ رہے تھے۔

گھٹکھریالے بال اڑ رہے تھے۔ جن کو سمیٹنے کا اسے
ہوش نہ تھا۔

بائیک اب بھی اونچے اونچے غیر ہموار راستوں سے
گزر رہی تھی مگر اب وہ ڈر کے رومان کی کمر کے گرد بازو
نہیں جمائل کر رہی تھی نہ خوف کے مارے آنکھیں
میچ رہی تھی۔

رومان نے بھی سارے راستے اسے بالکل مخاطب
نہ کیا۔ مگر جب بائیک گھر کے آگے روکی اور اسے اتر
کے ڈھیلے ست قدموں کے ساتھ اندر جاتے دیکھا تو
اس کے اترے چہرے پہ رومان کو ترس سا آگیا۔
”سوری۔۔۔ میٹھا۔۔۔ میں نے کوشش کی تھی۔
مگر۔۔۔“

وہ اس کی بات سننے کے بجائے یا مڑ کے کوئی جواب
دینے کے بجائے سر جھکائے اندر بڑھنے لگی۔

”ناراض ہو گئی ہو مجھ سے؟“

اس پہ بھی جواب نہ ملا تو وہ پھر بھی باز نہ آیا۔
”کیا ہو گیا ہے پار؟“

اب میٹھا زور سے چلاتے ہوئے پلٹی۔
”میں نے کہا تھا ناں۔۔۔ مجھے یار مت کہنا۔“

اس کی شرر برساتی آنکھوں میں آنسو تھے چہرے
پہ بے حد برہمی۔ انداز تقریباً ”پھاڑ کھانے والا تھا۔ اس
کے باوجود رومان کو اسے دیکھ کر ہنس سی آگئی۔ جس پہ
میٹھا اور ناراض ہو گئی۔

”گندے۔۔۔ اوپر سے ہستے ہو۔۔۔ بجائے شرمندہ
ہونے کے۔“

وہ تیزی سے کائی زدہ سیڑھیاں چڑھی۔ مگر گیٹ
پہ لگا تالا دیکھ کے ٹھٹک کے رک گئی۔ اب جا کے یاد
آیا کہ وہ یہاں سے کیسے نکلی تھی۔ تذبذب کے عالم
میں کچھ دیر تالے کو گھورتے رہنے کے بعد وہ جی کڑا کر
کے پلٹی مگر رومان سے ٹکرائی۔ جو پتا نہیں کب اس
کے بالکل پیچھے آ کے چپکے سے کھڑا ہو گیا تھا۔ بغیر کچھ
کے رومان نے دونوں ہاتھ اس کی کمر پہ رکھے اور اسے
اٹھالیا۔ میٹھا پھولے ہوئے ناراض چہرے کے ساتھ

محبت جھلکنے لگی۔
”جھلی۔“

پر شکوہ خانم نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو وہ کسمکسا کے اٹھ بیٹھی۔ ویسے بھی دن کا اچال سیدھا اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ ایسی بری عادت تھی بچپن سے ہی۔ پردے ہٹا کے رکھنے کی۔ گرے ہوئے پردے اس کی گھبراہٹ میں اضافہ کرتے تھے۔ انہیں اپنے برابر بیٹھے محبت سے مسکراتے دیکھ کے میٹھا نے خفگی کے اظہار کے طور پر منہ پھیر لیا۔
”ناراض ہو؟ ہونا ہی چاہیے مگر بتی نے ٹھیک نہیں کیا اپنی ڈول کے ساتھ۔“
وہ نس سے مس نہ ہوئی۔ انہوں نے جھک کے اس کا ہاتھ چوما۔
”میٹھا میری جان۔ کاش میں تمہیں سمجھا سکتی کہ میں تمہیں کیوں نہیں لے کے گئی تھی۔ ویسے اچھا ہی ہوا جو تم نہیں لکیں۔ جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“

”ہاں۔ میں جانتی ہوں۔“

رات کا سارا قصہ تازہ ہوتے ہی اس کے دل میں اس بے عزتی کا زخم بھی ہرا ہو گیا۔ وہ اٹھ کے سیلپر پہننے لگی۔
”مجھے پتا ہے میرے جانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ تو صرف غلط ہو سکتا ہے۔ صرف غلط۔“

وہ اٹھ کے باہر جاتے جاتے آرزوگی سے کہہ گئی اور پر شکوہ خانم کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ان سے ناراض زیادہ ہے یا کسی اور بات پر دکھی زیادہ ہے۔

دروازہ ایک دھماکے سے کھلنے لگا۔ رومان کی انگڑائی درمیان میں ہی رہ گئی۔ وہ بوکھلا کے سامنے دیکھنے لگا۔ سارا بالوں میں رولز لگائے۔ میک اپ سے لتھڑے نقوش پر شدید برہمی لیے اسے تیز نظروں

سے گھور رہی تھی۔
”کہاں تھے تم رات؟“ اس کی کرخت نوکیلی آواز گونجی۔

”سورہا تھا۔“ رومان منمنایا۔

”سو نے سے پہلے کہاں تھے؟“

”سو نے سے پہلے۔۔۔ اوہ ہاں یاد آیا واش روم میں تھا۔۔۔ یہ بھی بتاؤں کیا کر رہا تھا؟“

”شٹ اپ رومان۔۔۔ سیدھا جواب دو مجھے۔ میں رات کے ایک بجے تک تمہارے روم میں آ آ کے چیک کرتی رہی ہوں۔ تم یہاں نہیں تھے کہاں تھے اتنی دیر تک؟“

”وہ۔۔۔ میں ایک دوست کے ساتھ تھا میم!“
”دس دن ہوئے ہیں تمہیں اس ٹاؤن میں آئے ہوئے کون سے ایسے دوست بنا لیے ہیں تم نے جو تمہیں آدھی آدھی رات تک روک کر رکھتے ہیں۔ یاد رکھو رومان۔۔۔ تم یہاں کام کرنے آئے ہو دوست بنانے نہیں۔“

”جی۔“ وہ ہمیشہ کی طرح رعب میں آگیا۔

”آئندہ تم میری اجازت کے بغیر رات کے نو بجے کے بعد کہیں نہیں جاؤ گے۔“

”جی۔“ اس نے ہاتھ سینے پر باندھ کے تابع داری سے سر جھکا لیا۔

”میرے گھر میں رہنا ہے۔ میرے ساتھ کام کرنا ہے تو میرے کہنے پر چلنا ہو گا۔ اوکے؟“

”جی میم۔“

وہ سر جھکائے بڑی تابع داری اور مسکینی سے کہہ رہا تھا۔ چہرے پر دنیا جہاں کی معصومیت تھی۔ سارا اسے تیز نوکیلی نظروں سے گھورتی جیسے ہی جانے کے لیے مڑی رومان کی آنکھوں کی شرارت اور ہونٹوں کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے اس نے سارا کی شان میں کچھ اضافہ کیا دروازہ بند ہونے پر زبان چڑائی اور لپک کے کھڑکی کی جانب آیا۔ پردہ ہٹلایا۔ میٹھا ہاتھ میں تنکوں کی ٹوکری اٹھائے اپنے گھر کے اجڑے ہوئے لان کو عبور کرتی گیٹ کی طرف جاری

تھی۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اور گرمی ہوئی اور وہ جلدی سے پردہ گرا کے باہر کی جانب لپکا۔

مارکب سے وہ بندہ ہاتھ میں لیے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ زینبی اور میٹھا آپس میں گٹھن ہو رہی تھیں۔ کبھی زینبی کی بات یاد آتی۔

”میری ایک چیز ہے تمہارے پاس۔۔۔ کچھ تھا جو میں اس رات کشتی میں گرا آئی تھی۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم نے میری نشانی سمجھ کے اپنے پاس رکھ لیا ہو گا۔“

پھر رات والی اجنبی حسینہ کی بات ذہن میں گونجی۔
”مجھے تو یہ بھی کسی کا کھویا ہوا ملا ہے۔ باہر گرا ہوا تھا کہیں۔“
وہ ابھٹا چلا گیا۔

میٹھا کی ٹوکری تازہ خوبانیوں اور آڑو سے بھری ہوئی تھی جو اس نے ابھی چنے تھے۔ جھیل کے کنارے ایک چکنے پتھر پر بیٹھی وہ ایک ایک خوبانی ٹھنڈے شفاف پانی سے دھو دھو کے رکھ رہی تھی جب رومان اس کے برابر آ کے بیٹھ گیا۔

وہ ذرا کی ذرا چوکی۔ پھر ہاتھ پر ڈھیر سارے بل ڈال کے اپنے کام میں کچھ زیادہ ہی مگن نظر آنے لگی۔
”ہیلو۔“ رومان نے دلچسپی سے اس کے مگن ہونے کو محسوس کیا۔
”کیا ہے؟“

”ویسے تم نے غلط نہیں کہا تھا۔ تم ہو خاصی کیوٹ۔“

”تعریف سننے سے میرا غصہ کم نہیں ہو گا۔“

”تو کیا سننے سے ہو گا؟“

”میرا غصہ بڑا خراب ہے۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔“

رومان نے اس کی ٹوکری سے چن کے جگڑا سا آڑو نکالا اور کھاتے ہوئے بولا۔

”کوئی بات نہیں۔ تم بڑے شوق سے غصہ نکال سکتی ہو مجھ پر۔۔۔ فیری میں بڑے غصہ پروف اور ڈھیٹ ہوتے ہیں۔“

”تم بہت نکلتے والے فیری میں ہو۔ کچھ نہیں آتا تمہیں ہم نے میری لائف کیا بتائی ہے۔ الٹا سب بگاڑ کے رکھ دیا۔ تم جھوٹ بول رہے تھے کہ یہ کرو گے۔ وہ کرو گے رات کو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو سنڈر بلا کے ساتھ ہوا تھا۔ تم نے مجھے شرمندہ کرا دیا۔“

”میں نے؟ مجھے کیا پتا تھا تم اندر کون سے کارنامے انجام دے رہی ہو۔ میں تو باہر تھا۔“
”باہر تھے تو کیا ہوا۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے بڑے آئے کہیں کے پرے۔۔۔ پرے کو سب نظر آتا ہے چاہے سامنے ہونہ ہو۔“

وہ ناراض ہو کے اپنی ٹوکری اٹھاتی وہاں سے جانے لگی کہ رومان نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

”اچھا بیٹھو۔۔۔ میں تمہیں سچ بتاتا ہوں۔“
”کیا سچ؟“ وہ ٹھٹھکی۔
”اپنے بارے میں ایک سچ۔ کچھ ایسا جو تم نہیں جانتیں۔“

”تم اپنی کس چیز کی بات کر رہی تھیں جو میرے پاس رہ گئی تھی؟“
مارا اپنی الجھن دور کرنے کے لیے زینبی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ جبکہ وہ کھلی پڑ رہی تھی کہ شاید وہ اس کے لیے اتنا بے قرار ہو گیا ہے کہ کال کیے بغیر رہ نہیں سکا۔

”ہاں وہ وہ ہند۔ یاد آگیا تمہیں؟“
”کیا تم اسے واپس نہیں لینا چاہو گی۔“
”نہیں۔ تم اسے رکھنا چاہو تو رکھ سکتے ہو اس کے ساتھ کاڈ سرائیر رنگ مجھ سے کھو گیا ہے۔ شاید کہیں گر گیا ہو وہ بھی۔“

مارا زینبی کی بات سن کے چونکا۔ پھر ہلکا سا مسکرایا۔

(اوہ تو یہ وہی ہے۔)
مگر اس کی خاموشی نے زین کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔
”ماں۔۔۔ وہ بے تالی سے پکارا اٹھی۔
”کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟“
اب کے وہ بولا تو بہت مطمئن تھا جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ چکا ہو۔
”ضرور کیوں۔۔۔ نہیں۔“ وہ فضاؤں میں اڑنے لگی۔

☆ ☆ ☆

یشا تجس کے مارے کچھ اور قریب ہو گئی۔
رومان بھی بہت سنجیدگی سے اسے تیار ہاتھ لگا کر اس کا خیال تھا اب اس معصوم سے ڈرامے کو طول دینا مناسب نہیں ہے۔
”میں نے تمہیں اپنے بارے میں پورا سچ نہیں بتایا تھا۔ دراصل۔۔۔“ یشا اپنی آنکھیں پوری کھولے۔
بغیر ہلکے جھکے۔ اپنا منہ ذرا سا کھولے اس کے چہرے کے بالکل قریب اپنا چہرہ لاکے اسے ایسے تکتے جا رہی تھی کہ رومان کی ساری سنجیدگی ہوا ہو گئی۔
وہ دلچسپی سے اس کی نیم وا ہونٹوں پہ ٹھہری اس کو دیکھنے لگا۔ اور اس کی اوپر کو اٹھی آنکھیں۔ جن میں قدرت نے بڑی فیاضی سے بھر بھر کے کاجل اندھا بنا تھا۔

رومان کی آنکھوں میں وہی مخصوص شرارت اور ہونٹوں پہ اس کی انہی مسکراہٹ پھر سے آن موجود ہوئی۔

”دراصل میں ایک۔۔۔“ اس نے کہتے کہتے بات بدل دی۔

”میں ایک بیک فیری مین ہوں اور میری پاؤرز بہت کم ہیں۔ ابھی میرے اختیارات محدود ہیں۔ میں تمہاری مدد اس طرح سے نہیں کر سکتا جیسے تم چاہتی ہو۔ مگر میرے پاس جادو اور پاؤرز کم سہی۔ عقل پرستان میں سب سے زیادہ ہے۔“

”اچھا۔۔۔ لگتا تو نہیں۔“ بڑی دیر بعد اس نے پلکیں جھپکیں۔
”آزما کے دیکھ لو۔۔۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا اس وقت تک جب تک تم سٹڈریلا کی طرح اپنے خوابوں کی شہزادے کو نہ پاؤ۔“
”ہر اس۔۔۔؟“ یشا نے اپنا ہاتھ آگے کیا جسے ایک سیکنڈ کی دیر کے بغیر رومان نے فوراً تھام لیا۔

”ہر اس۔۔۔ پکا والا وعدہ۔“
وہ مطمئن سی ہو کر اپنے کپڑے جھاڑتی اٹھی۔
”چلو۔۔۔ ٹھیک ہے اب مگر نامت۔“
”مگر اس کے لیے تمہیں وہ سب کرنا ہو گا جو میں کہوں یعنی میری ٹریننگ شروع۔ کل ہو گی تمہاری پہلی کلاس۔“
”آج سے کیوں نہیں۔“

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے بات کرنے لگے۔
پھلوں کی ٹوکری اب رومان نے اٹھا رکھی تھی اور وہ شاہانہ انداز میں ہاتھ ہلاتی اس کے ایک قدم آگے آگے چل رہی تھی۔
”آج تم اچھی طرح سے سوچ سمجھ کے پہلے کسی نتیجے پہ پہنچ تو جاؤ۔ پھر میں فیصلہ کروں گا کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے یا نہیں۔“
”کس نتیجے پہ پہنچنا ہے مجھے؟“

”تمہیں مار کا دل اپنی جانب کھینچنے کے لیے میری مدد چاہیے نا کہ وہ تم سے شادی کر سکے تو اس سے شادی کرنے سے پہلے تم یہ طے تو کر لو کہ تمہیں اس سے محبت ہے بھی یا نہیں۔“

”لو۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔ محبت تو ہے۔“
”اچھا۔۔۔ تمہیں کیسے پتا۔“
”اچھا لگتا ہے وہ مجھے۔“

یشا نے الجھن بھرے عالم میں کہا ”اب وہ بھلا اور کون سی علامت ہوتی ہے محبت کی۔ اچھا لگتا ہے تو لگتا ہے۔“
”اور؟“ رومان تفصیل جاننا چاہ رہا تھا مگر وہ جھنجھلا اٹھی۔

”اور کیا۔۔۔ بس وہ ہے ہی اچھا۔“
”مجھے سارا آئنی کی ملی بہت اچھی لگتی ہے تو کیا میں اس سے شادی کر لوں؟“
”تم سارا آئنی کو کیسے جانتے ہو؟“
وہ بری طرح چوکی تھی اور اس کے سوال نے رومان کو اسی بری طرح گزربا دیا تھا مگر صرف ایک لمحے کے لیے۔
”تم یہ سوال کرتے ہوئے بھول رہی ہو کہ میں کوئی عام انسان نہیں ہوں۔“

”او۔۔۔ ہاں تم تو پرے ہو۔ تم تو سب جانتے ہو۔“
”مگر کیا تم مار کو جانتی ہو؟“
”ہاں ناں۔۔۔ وہ مار ہے۔ کارا آئنی کا بیٹا۔ بہت ہینڈ سم بالکل کسی پرنس کی طرح۔“
”اتنا تو سب ہی جانتے ہوں گے اس کے بارے میں۔ مگر کسی سے محبت کرنے کے لیے اس کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا ہوتا ہے۔“
یشا چلتے چلتے رک گئی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا۔
”کیا واقعی محبت کرنے کے لیے بہت کچھ جاننا ضروری ہوتا ہے؟“

رومان اس کی نگاہوں کے سحر میں کھو گیا اور جیسے ہتھیار ڈال دیے۔

”ہوں۔۔۔ نہیں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ محبت کچھ جاننے کچھ سوچنے کچھ سمجھنے یا کسی نتیجے پہ پہنچنے کا وقت ہی کب دیتی ہے۔ یہ تو جیسے سے دل میں گھات لگا کے بیٹھی ہوتی ہے اور کسی کو پہلی نظر میں ہی دیکھ کے دبے پاؤں حملہ کر دیتی ہے۔ ایک اجنبی کو ایک انجان گودل کا حکمران بنا دیتی ہے۔“

یشا ابھی اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ اس کی نظر سامنے۔۔۔ یعنی رومان کے عقب میں گئی۔ کافی فاصلے پہ مہر چھتری تانے کسی کو ڈھونڈتی آرہی تھی۔ یشا جست لگا کے رومان تک آئی اس کے بازو کو زور سے پکڑ کے اپنی جانب کھینچا۔
”ارے۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو۔“

وہ بوکھلا سا گیا جیسے یشا اسے زبردستی اپنے گلے لگانے والی ہو۔ اس افکار کا امکان اس کے ذہن میں دور دور تک نہیں تھا۔ مگر یشا نے اسے کھینچ کر اپنے سامنے کرنے کے بعد اس کی اوٹ میں پناہ لے لی۔
خود کو سمیٹ کے اس کی چوڑی پشت کے پیچھے چھپا لیا۔
”مہر ماں۔۔۔ مجھے چھپالو۔“
رومان مسکرا دیا۔ ”کاش میں واقعی تمہیں چھپا سکتا۔“

مہر اپنی پالتولی کی تلاش میں جنگل کی جانب مڑ گئی۔ اور رومان نے پھلوں کی ٹوکری اسے تھمائی۔
”لو گئیں تمہاری مہر ماں۔ اب میں بھی چلتا ہوں اور تم بھی اچھے بچوں کی طرح گھر جاؤ۔“

وہ اس کے گل تھپتھپا کے مڑ گیا۔ اور یشا ٹوکری جھلاتی اس کے وعدوں کے خمار میں ڈولتی آگے بڑھنے لگی۔ رومان کے وعدوں نے کچھ ایسی تقویت دی تھی دل کو کہ مار اب دسترس سے دور نہیں لگ رہا تھا لیکن جیسے ہی وہ گھر کے قریب پہنچی۔ گیٹ سے ذرا فاصلے پہ کھڑی مار کی کار کو دیکھ کے ٹھنک کے رک گئی۔ مار کا ر سے نیک لگا کے کھڑا سامنے دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے زین اپنی مخصوص اتراتی ہوئی چال کے ساتھ آ رہی تھی۔ اس کا حسن مکمل بناؤ سنگھار کے ساتھ دو آتشہ ہو رہا تھا اور مار کی نظروں میں رعب حسن کے سامنے مرعوبیت کے مکمل عکس ڈولتے نظر آ رہے تھے۔ یشا رشک و حسد کے ملے جلے جذبات کے ساتھ زین کو مار کی کار کی جانب بڑھتے دیکھ رہی تھی اور جب مار نے آگے بڑھ کے زین کا ہاتھ تھاما۔ اور اس کے لیے اپنے برابر کی نشست کا دروازہ کھولا تو یشا کا پورا وجود جیسے بے جان ہو گیا اور ٹوکری اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کے نیچے جا گری اور ساری خوبائیاں اور آڑو ادھر ادھر لڑھکنے لگی۔

وہ ان ہی ست مضحل قدموں کے ساتھ چلتی اپنے کمرے کی جانب گئی۔ وہ رہ کے وہ منظر یاد آرہا تھا جب مار اپنے مکمل طور پہ نظر انداز کرتا زین کو لے کر اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

ماہر زینی کے ہمراہ ٹہل رہا تھا۔
”ہاں مجھے لگا۔ ایک رہ گیا ہے۔ بے کار ہے اب،
پتا ہو تا دو سراسر اتم نے اتنا سنبھال کے رکھا ہو گا تو میں نہ
پھینکتی۔“
”کیسے نہ سنبھالتا۔ تم تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھا۔“

”اور تم مجھ تک پہنچنا کیوں چاہتے تھے؟“ وہ اترا
گئی۔ حسب عادت۔۔۔ حسب فطرت۔
”کیا اب بھی سہیلانے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟“
ماہر زینی نے کیوں کھل نہ پارہا تھا۔۔۔ مچلتے مچلتے ہی
اچانک کنی کتر جاتا۔
”مجھے سننا اچھا لگتا ہے۔“
”اور مجھے تمہیں سننا اچھا لگتا ہے۔“
بالا خرماڑ کے منہ سے ایک تعریفی جملہ نکل ہی گیا۔
جو کہ بہر حال اس کی تعریف میں نہیں تھا۔

”جانتی ہو۔۔۔ میں نے اس رات تمہیں ٹھیک سے
دیکھا بھی نہیں تھا مگر صرف تمہاری باتوں کی وجہ سے
میں۔۔۔“
”نجانے کون سا احساس تھا جو اسے کہنے سے روک
رہا تھا۔“
”کیا۔۔۔ بولو ناں۔“
”نہیں۔۔۔ ابھی نہیں۔“
”کیوں؟“ وہ مایوس ہو گئی۔ کچھ جھنجھلا بھی اٹھی۔

”مجھے آہستہ آہستہ قدم بڑھانا اچھا لگتا ہے۔“
”اور مجھے ایک ہی جست میں سب فاصلے مٹا دینا
اچھا لگتا ہے۔“
وہ کسی چیلنج کی طرح اس کے سامنے آن موجود ہوئی۔

”ویسے بھی اتنی مختصر سی زندگی میں کچھ بھی آہستہ
آہستہ کرنے کا وقت کس کے پاس ہے۔“
وہ ماڑکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی
اور وہ اس کے اس فلسفے اور اس رات والی بے ساختگی

کے نزدیک سے زن سے موڑ لے گیا تھا۔ وہ آئینے
کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور اسی سے اپنے آپ کو
دیکھنے لگی۔

آج سے پہلے کبھی خود کو دیکھتے ہوئے اس کی نظروں
میں اتنی ناپسندیدگی نہیں جاگی تھی۔
بالوں کو اس کا رخ سے باندھنے کے باوجود کئی لٹیں
نکل کے اس کے چہرے کے اطراف پھیلی تھیں۔ وہ
بال جن کو اچھے شیمپو اور کنڈیشنرز سے دھلنا تب نصیب
ہوتا تھا جب ایکی اور زینی کے ہاتھ روم سے شیمپو کی
شیشیاں خالی ہو کے نکلتیں اور وہ ان میں پانی ڈال کے
ان کی باقیات استعمال کرتی۔

بالوں میں کہیں کہیں گھاس بھی اٹکی تھی۔ کہاں
کہاں گھس کے تو توڑے تھے پھل۔
اس نے بالوں کو جھاڑا۔ پھر گال پہ لگی مٹی نظر
آئی تو ٹھیس کو تھوڑا سا اٹھا کے اپنے گال کو رگڑ کے
صاف کرنے لگی پھر دوبارہ خود کو غور سے دیکھا تو شکل پہ
بارہ بج گئے۔

”وہ کیسے مجھے دیکھے۔ کیسے مجھے پسند کرے۔ کیسے
کرے مجھ سے محبت۔ ذرا سی بھی تو اچھی نہیں لگتی
میں۔ گندی، میلی، پٹھے پرانے کپڑوں والی۔“
اور وہاں سے کچھ دور۔۔۔ اپنے ڈربے نما کمرے
کے روشن دان سے جھانکتا رومان مسکرا رہا تھا۔ دور
بہت دور سے میٹھا اپنے کمرے کی کھڑکی کے پار آئینے
کے سامنے کھڑی اپنے چہرے پہ ملال سے ہاتھ پھیرتی
ہمیشہ کی طرح اس کے دل میں اتر رہی تھی۔
”کیسے نہ دیکھوں تمہیں۔۔۔ کیسے نہ پسند کروں۔۔۔
کیسے نہ کروں تم سے محبت۔۔۔ اتنی تو اچھی لگتی ہو تم
۔۔۔ ساہ معصوم۔۔۔ جھلی۔“

اس نے اپنے بازو کو دیکھا۔۔۔ جہاں میٹھا کے ناخن کا
ہلکا سا نشان تھا۔ جب اس نے مہرے چھپنے کے لیے
یکدم رومان کو دیوچ کے اپنی جانب کھینچا تھا۔ رومان
نے اس خراش پہ ہولے سے اپنے لب رکھ دیے۔

”تو تم نے وہ ایر رنگ پھینک دیا تھا۔“

میں مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر پھر زہنی کی دلکشی اور عنایت نے اسے مزید کوشش کرنے سے روک ہی دیا۔

مہر سر پہ چھتری تانے سمار کے ساتھ اس کے گھر کے لان میں تھی اور تعریفی نظروں سے شادابی اور سبزے کو دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے لان کی تو حالت ہی بدل گئی۔ نیامالی رکھا ہے؟“

”نہیں بھئی۔ کون اتنے ملازموں کی درد سہی پالے۔ رومان۔ وہی تمہیں بتایا تو تھا۔ میرے شوہر کا کوئی دور کا بھانجا۔“

”ہاں ہاں وہ جو تمہارے پاس کام کرنے آیا ہے۔“

”ہاں۔ اسی نے کیا ہے یہ سب۔“

سمارانے اس کی تواضع کے لیے جو کالیک سامنے رکھا اور مہر کی نظریں باریک بینی سے اس کے کناروں پر لگی پھپھوند کو تلاش کرتے لگیں۔ مگر سمار ابھی ایسی پھوپھو میزبان نہ تھی۔ مہمان کے سامنے یہ تین ہفتے پرانا کالیک رکھنے سے پہلے اس نے بڑی نفاست اور مہارت کے ساتھ اس کے سوکتے پھپھوند زوہ کنارے کتر دیے تھے۔

”تم اس سے مالی کام بھی لیتی ہو؟“

”نہ صرف مالی کا، باورچی کا ماسی کا، چوکیدار کا اور ظاہر ہے کارخانے کا تو وہ سنبھالتا ہی ہے۔ ویسے ہر فن مولانا پ لڑکا۔ کون سا کام ہے جو اسے نہیں آتا پھر میں کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔“

”میرے گھر میں بھی بہت سے کام رکے پڑے ہیں کچھ رہنورنگ کے۔ کچھ لائٹ کے۔ لان تو خیر ہے ہی۔ تم اسے میری طرف بھی بھیجنا۔“

مہر نے لباجت سے کہا جس پہ سمار کے ماتھے پہ تل آ گئے۔

”اتنا وقت کہاں ہوتا ہے اس کے پاس۔ ویسے

بھی جتنا کام کرتا ہے اس سے دس گنا زیادہ باتیں بتاتا ہے۔“

سمارا کے لمحے میں یکایک ہی رومان کے لیے بے زاری اور کوفت ٹپکنے لگی۔

”اوشے گھنٹے کا کام چار گھنٹے میں کرتا ہے۔ تمہاری طرف بھیجوں تو میرے تو سارے کام پڑے رہ جائیں گے۔“

مہر نے منہ بتایا مگر بولی کچھ نہیں۔

(خبیث۔ یہ تو مہر کے بھی کسی کو اپنا بخار تک نہ دے)

”ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ویسے بھی ایک واحد بندے پر تم نے دو دو ڈے داریاں ڈال رکھی ہیں۔ گھر کی بھی کارخانے کی بھی۔ سب کچھ چوٹ ہو جائے گا۔“

اس وقت تو سمارانے جی کڑا کر کے مہر کی بات پنی لی مگر پھر سارا دن برپا رہی۔

”مہر۔ مفت خور، کنجوس، بس نہیں چلتا سامنے والے سے اس کی سانسیں تک مانگ لے۔“

وہ کھانا کھاتے ہوئے بھی بھڑاس نکالتی رہی۔

”ہر وقت اپنا الو سیدھا کرنے کی فکر میں ہوتی ہے مہر۔ اب اگر میں تمہیں اس کے کام کرنے بھیج دوں تو میرا کیا ہو گا۔“

جلدی جلدی بڑے بڑے لقمے ٹٹلتا رومان چونکا۔

”ارے نکالے ہوں گے اس نے ڈھیروں ڈھیر۔“

رومان سوکھے تھوکے کا لقمہ چبانا بھول گیا۔ اور ہاتھ میں پکڑا مرغابی کے گوشت کا بھنا ہوا ٹکڑا بھی واپس پلٹ میں رکھ دیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

”اگر وہ اپنا الو سیدھا کرتی ہیں تو آپ اپنا کر لیں۔“

”کیا مطلب؟ میرا کون سا الو ہے؟“

”میں ان کے سب کام کرنے پہ تیار ہوں اگر آپ ان کے بدلے ان سے پیسے مانگ لیں۔“

”کیا؟“ وہ چلائی۔

”ہاں۔ کہہ دیں کہ وہ مارکیٹ سے آدھے پیسے لے گا مگر لے گا ضرور۔“

”تمہیں اپنی کمائیوں کی پڑی ہے۔ پہلے یہ کام تو پورے کرو۔“ وہ اسے جھاڑنے لگی۔

”یہ بھی تو آپ کا ہی کام ہے آئی۔“

”پھر آئی؟“

”اوشے۔ میم۔ دیکھیں ناں۔ میں تو آپ ہی کو لا کے دیا کروں گا اپنی آمدنی۔ آپ کے علاوہ میرا کون ہے جو فال تو وقت ہوتا ہے میرے پاس اس کے کچھ پیسے آجائیں گے۔“

سمارا بھی سوچ میں پڑ گئی۔ اب رومان نے مسکراتے ہوئے بھی مرغابی کے ٹکڑے کو پھر سے اٹھا لیا۔

وہ دو بیواؤں گھر سے نکلی تھی۔

پچھلے رستے سے۔ جو کہ خود رو جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ نکل کے جنگل تک آتا تھا تو مشکل۔ ایک تو نوکیلی جھاڑیاں اوپر سے جنگلی گیدڑوں کی خوفناک آوازیں پھر پکڑے جانے کا خوف مگر رومان نے اس کی ٹریننگ کے لیے یہی وقت مقرر کیا تھا۔ اور اسے ہر حال میں مار کو متاثر کرنے۔ اور اسے خو سے شادی کے لیے تیار کرنے کے کر سیکھنے تھے۔

جادوئی گر۔

اس جوش نے اسے اتنا خوف زدہ نہ ہونے دیا جتنا وہ عموماً رہا کرتی تھی اور سب سے بڑھ کے یہ تسلی کہ جانا تو رومان سے ملنے ہے۔ ایک پرے سے۔ اس کے ہوتے کسی کی کیا مجال جو میٹھا سیف اللہ کا بال بیکا کر سکے۔

رومان کا سنی پھولوں والے پیڑ کے نیچے حسب وعدہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کاسنی پھول۔ جو پورے چاند کی روشنی میں سفید اجلے اجلے لگ رہے تھے۔

”نہیں۔ کسی جوان لڑکے کے سامنے اکیلے میں آنکھیں بند کرنے سے۔ وہ کہتی ہیں سمجھ دار لڑکیاں جوان جہان لڑکوں سے تنہائی میں نہیں ملتیں۔ اور اگر ملنا پڑے تو ان کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔“

”نہیں۔ کسی جوان لڑکے کے سامنے اکیلے میں آنکھیں بند کرنے سے۔ وہ کہتی ہیں سمجھ دار لڑکیاں جوان جہان لڑکوں سے تنہائی میں نہیں ملتیں۔ اور اگر ملنا پڑے تو ان کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔“

”نہیں۔ کسی جوان لڑکے کے سامنے اکیلے میں آنکھیں بند کرنے سے۔ وہ کہتی ہیں سمجھ دار لڑکیاں جوان جہان لڑکوں سے تنہائی میں نہیں ملتیں۔ اور اگر ملنا پڑے تو ان کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔“

”میں اتنی چھپ کے آئی ہوں تم سے ملنے۔“

”میں نے اس کا حل نکال لیا ہے۔“

رومان نے دلچسپی سے اس کے ماتھے پہ شبنم کی طرح ابھرتے قطروں کو دیکھا۔

”اب میں روز تمہارے گھر آیا کروں گا۔ ایک دو گھنٹوں کے لیے اور روزانہ تمہیں ایسے جادو سکھاؤں گا جس پہ عمل کر کے تم مار کو اپنا بنا سکتی ہو۔“

”کی؟“ وہ کھل گئی۔ اور پھر ساتھ ہی بجھ گئی۔ ”مہر ماما تمہیں گھنٹے نہیں دیں گی گھر میں۔“

”تمہاری مہر ماما نے مجھے اجازت دے دی ہے۔“

یشا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور ہمیشہ کی طرح وہ ایسا کرتے ہوئے رومان کو بڑی پیاری لگی۔ اس نے اپنی نظریں یشا کے نیم وا ہونٹوں سے ہٹا کے اس ستارے پر مرکوز کر دیں۔ جو خود بھی جھک کے یشا کی حیرت کے اظہار پہ حیران ہو رہا تھا کہ حیرانی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔

”تم نے یہ کیسے کیا رومان؟“

”جادو سے۔“

”مجھے بھی دکھاؤ ناں کوئی جادو۔ پلیز۔“ وہ چل گئی۔

”اوکے۔ آنکھیں بند کرو۔“

”ہاں!“ یشا نے فوراً سر ہلاتے ہوئے آنکھیں بند کی۔ مگر اگلے ہی پل گھبرا کے کھول دیں۔

”اب کیا ہوا۔“

”نہیں۔ میں نہیں بند کروں گی آنکھیں۔“

”کیوں؟“

”مگر میں نے منع کیا ہے۔“

”آنکھیں بند کرنے سے؟“ وہ حیران ہوا اس منطق سے۔

”وہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ وہ کیوں بھلا؟“ کتنی دقت ہو رہی تھی رومان کو اپنی ہنسی روکنے میں۔

”دیکھو ناں۔۔۔ اس وقت رات ہے۔ جنگل ہے۔ تم اور میں اکیلے ہیں۔ اوپر سے میں کیوٹ بھی ہوں اور تم بد تمیز بھی۔ اگر میری آنکھیں بند دیکھ کے تم نے مجھے۔۔۔“

کہتے کہتے اس نے زبان دانتوں تلے دبالی اور آنکھیں لمحے بھر کے لیے میچ کے جھرجھری سی لی۔

”کیا میں نے۔۔۔؟“

”تم نے مجھے۔۔۔ مجھے پیار کر لیا تو نہ نہ میں نہیں بند کرنے والی آنکھیں۔“

اب رومان سے مزید ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ اسے ہنسنے دیکھ کے میشا کو تاؤ چڑھ گیا۔

”میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔“

”میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔“ اس نے اطمینان دلایا۔ اور پھر زیر لب اضافہ بھی کیا۔ ”کم از کم تمہاری آنکھیں بند کروا کے تو نہیں۔“

”مجھے تمہیں کچھ اور دکھانا ہے۔ چلو کرو بند آنکھیں۔“

میشا ڈرتے ڈرتے آنکھیں بند کرنے لگی۔ مگر احتیاطاً اس نے جھری سی چھوڑ دی تھی۔ جسے ٹوٹ کر کے رومان نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا اور دونوں ہاتھ جو سینے پہ باندھ کے بغلوں میں دبا رکھے تھے نکالے اور اس کے سامنے کر کے کہتے ہوئے مٹھی کھولنے لگا۔

”دیکھو اب۔“

میشا نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ اور رومان نے دھیرے سے مٹھی کھولی۔

اس کی بند مٹھی میں سے جگنو آزاد ہو کے اڑنے لگے۔

میشا کی کاجل بھری آنکھوں میں کرنیں سی پھوٹ پڑیں۔ وہ سحر کے عالم میں ان جگنیوں کو اڑان بھرتے دیکھ رہی تھی۔ اور رومان سحر کے عالم میں اس کی آنکھوں میں خواب اترتے اور روشنیاں بکھرتے دیکھ رہا تھا۔

”تم تو جج جج کے پرے ہو۔“ وہ تالیاں بجانے لگی۔

”ایک اور بجک دکھاؤ ناں۔“

”ہاں۔۔۔ بولو۔“ رومان نے شخی میں آنکے فیاضی دکھائی۔ جیسے سامری اپنی گدی پہ اسے ہی تو بٹھا کے گیا ہو۔

”مجھے زینی جیسا خوب صورت بتاؤ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔“

”تم سے کس نے کہا وہ خوب صورت ہے۔“

”تمہیں نہیں لگتی؟“

”ذرا بھی نہیں۔“

”مجھے بھی نہیں لگتی۔“ میشا نے ناک چڑھائی۔

”مگر مائر کو لگتی ہے۔ تب ہی تو وہ اس سے ملتا ہے۔“

”کسی سے ملنے کے لیے اس کا خوب صورت ہونا ضروری نہیں ہے۔ دیکھو ناں۔ ہم بھی تو مل رہے ہیں جبکہ تم مجھے کہیں سے بھی خوب صورت نہیں لگتیں۔“ شاید یہ بات میشا کے سر کے اوپر سے گزر جاتی اگر کہتے ہوئے رومان کسی طرح اپنی مسکراہٹ پہ قابو پالیتا مگر یہ شرارتی مسکراہٹ میشا کو تباہی لگاتی۔

”ہاں،“ جج کہہ رہے ہو۔ تم بھی مجھے زہر لگتے ہو میں پھر بھی میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ مطلب ملنے کے لیے کسی کا خوب صورت ہونا یا اچھا لگنا ضروری نہیں ہے۔ مگر محبت کرنے کے لیے ہے۔“

رومان کی ساری شرارت اور غیر سنجیدگی ہوا ہو گئی۔

”کیا واقعی کسی سے محبت کرنے کے لیے اس کا خوب صورت ہونا ضروری ہے؟“

وہ اترے چرے، ٹھکے ہوئے لہجے کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

”ہاں خوب صورت بھی۔ اور امیر بھی۔“

رومان کے چہرے پہ افسردگی چھا گئی اور وہ اپنی قمیص کے اس چھید میں انگلی ڈال کے اسے مزید بڑا کرنے کے شغل میں لگ گیا۔ جو بالکل سامنے ہی تھا۔

”بتاؤ ناں۔ تم ایسا کیا کر سکتے ہو۔ جس سے میں مائر کو زینی سے زیادہ اچھی لگنے لگوں۔“

”اس کے لیے جو کرنا ہے، تمہیں کرنا ہے۔ مجھے

نہیں۔“

”وہی تو۔ کیا کرنا ہو گا مجھے؟“

”جو میں کہوں۔ سناؤ گی؟“

رومان نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”وعدہ۔“ میشا نے جھٹ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جسے احترام سے تھامتے ہوئے رومان اپنے گھٹنوں پہ جھکا اور اس کے ہاتھ کی پشت پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

”یہ میری سعادت ہوگی ہر پائی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“

میشا نے بڑی رعونت کے ساتھ سر جھٹکا اور اپنا ہاتھ ہلکے سے جھٹکے سے اس سے چھڑا لیا۔

”تمہیں صرف میرے نہیں۔ اس کے سامنے بھی کسی کوئن کی طرح ہی رہنا ہے۔“

”ایسے پھٹے پرانے کپڑوں والی کوئن؟“ میشا کا چہرہ اتر گیا۔ ”تم میرے لیے پرستان سے پیارے پیارے کپڑے لاؤ ناں پلیز۔“

”ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہاں سے جو چیز آئے گی، جادوئی اور عارضی ہوگی۔ یاد کرو سنڈریلا کی کہانی۔ بارہ بجتے ہی سب کچھ غائب ہو جاتا تھا۔ وہ اور وقت تھا۔ بارہ بجے کا مطلب تھا آدھی رات۔ اب تو بارہ بجے شام ہوتی ہے۔ ذرا تصور کرو۔ تم جادو کے کپڑے پہنے مائر کے سامنے شو مار رہی ہو۔ بارہ بجتے ہیں اور تمہارے کپڑے غائب۔“

”نہیں۔“ میشا نے ہلکی سی جج مار کے دونوں بازو خود پہ رکھ کے ایسے ڈھانپا جیسے واقعی سچ جج۔

”اور مائر کے اور تمہارے اصلی والے بارہ بج جائیں گے۔ اس لیے جیسی ہو، جس طرح ہو۔ ویسی رہو اور اسی طرح اسے متاثر کرنے کی کوشش کرو ویسے بھی کوئن بننے کے لیے لباس یا زیور، تاج کی نہیں۔ ایٹی ٹیوڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اس کے آگے پیچھے پھرنے کے بجائے یا الٹی سیدھی حرکتوں سے اسے اثر پکٹ کرنے کے بجائے اکٹور کرو۔ جیسے تمہیں اس کی پروا ہی نہ ہو۔ جیسے تم اسے کچھ سمجھتی

ہی نہیں ہو۔“

میشا کچھ دیر اسے بے یقینی سے گھورتی رہی۔

”تم مذاق کر رہے ہو؟“

”بالکل بھی نہیں۔“

”تو پھر تم میرا کہاڑا کر رہے ہو۔ تم چاہتے ہی نہیں کہ مائر کی مجھ سے شادی ہو۔“

وہ روٹھ کے جانے لگی اور رومان کے پکارنے پہ بھی پروا نہ کی۔

”میشا! روکو تو۔“



ادھر کارا نے الگ شوٹا چھوڑ دیا۔ بر شکوہ خانم کو فون کر کے اپنی مدد کے لیے کسی لڑکی کو طلب کیا۔ بلکہ کسی کو کیا۔ صاف صاف میشا کا نام لیا۔

”آپنل کی رسم ہے۔ اب آئی ہوں تو یہ فریضہ انجام دے کے ہی جاؤں لیکن میں اتنا عرصہ یہاں سے دور رہنے اور فیملی سے کٹ جانے کی وجہ سے سب روایتیں وغیرہ جیسے بھول سی گئی ہوں۔ میرے تو تقریباً سب ہی ملازم بھی وہیں سے آئے ہیں میرے ساتھ۔ بہتر تو یہی ہو ماکہ میں آپ کو کچھ دن کے لیے اپنا مسمان بناتی، لیکن اس دن آپ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی، میں آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتی۔“

”ہاں۔۔۔ مگر میشا۔“ وہ متذبذب تھیں۔

”آپ کے پاس پلی بڑھی ہے۔ آپ نے سب سکھایا ہو گا اسے۔ اسے کرنا ہی کیا ہے، صرف یہ دیکھنا ہے کہ سب انتظامات رسم و رواج کے مطابق ہو رہے ہیں یا نہیں۔“

”نہیں کارا۔ اسے کہاں آتا ہے یہ سب۔“

”تو ایسی۔ یا زینی۔“

”وہ تو بالکل ہی نکمیاں ہیں۔“

مگر کارا کا اصرار بڑھتا گیا۔ ناچار انہیں ٹالنے کے لیے کہنا پڑا۔

”چھ!۔۔۔ دیکھتی ہوں کچھ۔“

”یہاں! تم رات کو کہاں تھیں؟“ ان کے سنجیدگی سے پوچھنے پہ وہ گھبرا گئی۔
”میں۔۔۔ وہ۔۔۔ جنگل۔۔۔ جنگل میں تھی۔“
”جنگل میں، مگر کون؟“
”جنگلوں پکڑنے۔“
”تو رات کو؟“

”دن کو جنگلوں کہاں نظر آتے ہیں، رات کو ہی تو ہوتے ہیں گری۔“
”یہاں۔۔۔ تمہیں بالکل ڈر نہیں لگتا، جنگل میں اکیلے جانے سے۔۔۔ دن کو قتلہاں پکڑنے اور رات کو جنگلوں پکڑنے چلی جاتی ہو۔ ایسی کون سی ضرورت پڑ گئی تھی تمہیں جنگلوں کی۔“
”کسی نے بتایا تھا، جنگلوں مٹھی میں بند کر کے جو دعا مانگو پوری ہو جاتی ہے یا کوئی ایسا دروازہ ضرور کھلتا ہے جس سے دل کی مراد پوری ہونے کا چانس ہو۔“
”کیا دعا مانگی تم نے؟“

ان کے پوچھنے پہ وہ بے ساختہ گنوانے لگی۔
”بڑا سا محل جیسا گھر، نوکر چاکر، عمدہ عیش، ہرے والے کپڑے، ہیرے، جواہرات، دنیا جہنم کے ملکوں کی سیر، ہمیشہ آرام، مزے مزے کے کھانے۔ اور۔۔۔“
”اور کیا؟“

”اور ایک شہزادہ۔“
پر شکوہ خانم کو غصہ اور ہنسی بیک وقت آئے۔ مگر کمال مہارت سے انہوں نے ہنسی چھپالی اور غصہ ظاہر کیا۔

”فضول باتوں میں بہت بدل لگتا ہے تمہارا۔“
”دعا مانگنا بری بات نہیں ہے۔“
”تو پھر یہ دعا مانگو کہ تمہیں عقل آجائے۔“
”یہ دعا کیوں نہ مانگوں کہ آپ کو مجھ پہ ترس آجائے۔“

”اللہ نہ کرے، جو میں یا کوئی اور تم پہ ترس کھائے میں تو چاہتی ہوں لوگ تم پہ رشک کریں، اسی لیے تو کارا پہ مجھے بہت غصہ آیا، جب اس نے یہ بات کی

حالانکہ مجھے ہمیشہ سے بہت عزیز رہی ہے۔“
”کس بات پہ غصہ آیا تھا؟“ اس نے کریدنا چاہا۔
”اس کے گھر میں کچھ دن بعد آچل کی رسم ہونے والی ہے۔ وہی رسم جس میں لڑکے کی ماں باقاعدہ طور پہ اپنی منتخب کردہ ہو کا نام سب کو بتانی ہے۔ تیاریاں جاری ہیں جن میں مدد کے لیے اس نے تمہارا نام لیا۔“

”ج۔۔۔ کب جانا ہو گا مجھے؟“
”یہاں۔۔۔ پر شکوہ خانم کو اس کے اشتیاق پہ حیرت ہوئی۔
”اس نے کیا تمہیں ملازمہ سمجھ لیا جو۔۔۔“
”ملازمہ نہیں گری، اپنا سمجھ کے کہا ہو گا۔“
”یہاں نے فوراً بات کاٹ کر کارا کی جانب سے صفائی پیش کی۔
”مگر مجھے یہ بات بہت بری لگی۔“
”آپ نے جھٹ انکار کر دیا ہو گا۔“
”یہاں نے ہونٹ لٹکائے۔

جنگلوں ہاتھ میں لے کر دعا مانگنے والی بات اب یقین سا آ رہا تھا۔ واقعی، ایک دروازہ کھلا تو ہے، مگر گری نے بند بھی کر دیا۔
”یہی تو مصیبت ہے اسے صاف انکار کرنا، مشکل لگتا ہے۔“
”پلیز گری، انکار نہ کریں نا، پلیز، پلیز کسی کے کام آتا تو اچھی بات ہے گری۔“

”نام یہ کیسے کیسے آئیڈیاز آتے ہیں آپ کو؟“ مار ساری بات جاننے کے بعد ناگواری سے کہہ رہا تھا۔
”یہ ہماری خاندانی روایت ہے۔“
”بہت عجیب اور فضول سی ہے۔“
”جیسی بھی ہیں، مگر عمل تو کرنا ہے۔ کم از کم یہاں رہتے ہوئے تو کرنا پڑے گا۔“
”لیکن ایسا کرنے سے کتنی لڑکیوں کے دل ٹوٹیں گے۔ ان کی فیملی گز ہرٹ ہوں گی۔“

”وہ سب بھی اسی فیملی کی ہیں، ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ سب جانتی ہیں، تم ان میں سے کسی ایک کو ہی پسند کر دو گے۔“
”آپ میری پسند جانتی ہیں مام۔“ اس نے اپنی بات یاد دلانی۔
”مگر تم اسے نہیں جانتے۔“

”آپ جاننے لگا ہوں۔“
مار کی مسکراہٹ اور اعتراف نے کارا کو ٹھٹھک جانے پہ مجبور کیا۔
”کون ہے وہ لڑکی؟“
”آپ کی پیاری آنٹی کی پوتی، زینی۔“
”زینی۔۔۔ کارا اہل کے رہ گئی۔ شش و پنج کے عالم میں مار کی جانب دیکھا جو داد طلب مسکراہٹ کے ساتھ بڑے امید بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ بمشکل مسکرا کے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
”اوہ زینی۔ اچھا۔“

☆ ☆ ☆
وہاں رومان مہر کو شیشے میں اتار رہا تھا۔
”کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میں آپ کے لان کو چند ہی دن میں ہر ابھرا کروں گا اور جو کام ہیں، مجھے بتادیں، میں روز دو گھنٹے کے لیے آیا کروں گا۔“
”تمہارا تو کہتی ہے تم بہت کام چور اور ست ہو۔“
”آپ میں کیا کہوں؟“ اس نے بے چاری سی شکل بنالی۔

”خیر، یہ تو عادت ہے اس کی۔ تم اس کے پاس کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟“
”کیا کروں۔۔۔ نانا جی نے مرتے وقت نصیحت کی تھی کہ ان کے پاس جا کے ان کے بزنس میں ہاتھ بٹاؤں۔ یہ وہ ہیں نا بے چاری۔“
”تو تم اب اس دنیا میں اکیلے ہو؟“ مہر کے ذہن میں کوند اسال پکا۔

”جی۔ بالکل اکیلا۔“ اس نے منہ کچھ اور لٹکالیا۔
”او اندر آؤ۔“ مہر کا لہجہ پل میں شیرینی سے بھیک

گیا۔ وہ اسے لیے اندر آئی جہاں ایسی صوفی پہ بیٹھی پڑنگ کھاتے ہوئے بیٹھا ہے الجھ رہی تھی۔
”تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ کسی کھاتے ہوئے انسان کے سر پہ کھڑے ہوئے ڈسٹنگ نہیں کرتے بعد میں کر لیتی تھی۔“
”تم بعد میں کھا لینا، مجھے کام ختم کرنا ہے۔“
یہاں مہر اور زینی سے تو پھر بھی وہب جاتی تھی۔ ایسی سے ہرگز نہیں۔

”تم ہر بات میں مجھے جواب کیوں دیتی ہو؟“
”اور تم ہمیشہ مجھ سے سوال کیوں کرتی ہو؟“
”یہاں۔۔۔ یہ کیا شور مچا رہا ہے۔“
مہر نے اندر آتے ہی اسے لتاڑا اور ایسی نے بھی جھٹ سے شکایت جڑی۔
”مام۔۔۔ یہ میرے ساتھ بد تمیزی کرتی ہے، اس نے مجھے موٹی بھی کہا۔ لگا میں اسے دو چار۔“
”تمہیں تو ساری دنیا موٹی کہتی ہے۔ کس کس کو مار پڑاؤ گی؟“

یہاں رومان کو گھورنے کے ساتھ ساتھ ایسی کو بھی پتا رہی تھی۔
”کون کہتا ہے اتنی پیاری لڑکی کو موٹی؟ کس کی نظر اور حسن ذوق دونوں خراب ہیں؟“
ایسی ابھی ڈھنگ سے حیران بھی نہ ہو پائی تھی کہ رومان نے اگلی بات کہہ کر اسے پریشان بھی کر ڈالا۔
”یہ آپ کی بیٹی ہے میم۔ اتنی پیاری، اتنی حسین؟“

”لگتا ہے نظر اور ذوق تمہارا خراب ہے۔“
”یہاں۔۔۔ تمہیں مہمان سے بات تک کرنے کی تمیز نہیں ہے۔“ مہر کے ڈانٹنے پہ وہ بڑبڑائی ہوئی چلی گئی۔
”ہو نہ۔۔۔ مہمان۔“

”ناک میں دم کر رہا ہے اس لڑکی نے۔“
”آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے دوسرے سب مسئلے حل کرنے کے ساتھ ساتھ میں یہ مسئلہ بھی حل کر دوں گا۔“

رومان نے تسلی دی۔ مہراس یہ تو نہیں مگر اپنی ایک تازہ سوچ پر ضرور خوش ہو کے مسکرا دی کہ ابھی ابھی اس نے اپنا ایک اور اہم مسئلہ بھی رومان کے ذریعے حل کرنے کا سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

”کیسی باتیں کر رہے ہو مار؟“ زینی ہکا بکا رہ گئی۔
”میں یہ سب کیسے کر سکتی ہوں؟“
”دیکھو زینی! تم مجھے پسند ہو مگر میں چاہتا ہوں تمہام کو بھی پسند آجاؤ اور ان کے دل میں اترنے کا یہ گولڈن چانس ہے، تمہیں ان کی تھوڑی سی مدد ہی تو کرنی ہے۔“
”ٹھیک ہے، صرف اور صرف تمہارے لیے۔“
اس نے بادل خواستہ ہاں بھری۔
”تو کل ہم وہیں ملیں؟“
”کہاں۔“

”اسی جھیل۔ جہاں پہلی بار ملے تھے، بلکہ اب تم اپنا وعدہ نبھانا مجھے کشتی چلانا سکھانا۔“
زینی اس فرمائش پر گھبرا سی گئی۔
”نہیں، موسم ٹھیک نہیں ہے، ہم کشتی میں نہیں بیٹھیں گے۔“

☆ ☆ ☆

رومان گھاس تراش رہا تھا جب بیشا کو آتے دیکھا۔
”تر گیا غصہ؟“
”مجھے کوئی غصہ نہیں تھا۔“
”تمہیں غصہ تھا بلکہ جیلسی۔“
”جیلسی وہ کس سے؟“

”میں نے تمہارے سامنے تمہارے بجائے ایچی کی تعریف جو کر دی تھی۔ اسے حسین کہہ دیا تھا۔ اس بات کی جیلسی۔ اسی لیے تو تم مجھے بڑبڑا رہی تھیں۔“
”جی نہیں بڑی خوش قسمتی ہے تمہیں اپنے پارے میں۔ وہ تو میں اس لیے تم سے ایسے بات کر رہی تھی کہ مہرما تم پر اور زیادہ مہربان ہو جائیں۔ جو لوگ مجھے زہر

لگتے ہیں ان کو بہت اچھے لگتے ہیں اور جن کے ساتھ میں اچھے سے بات کروں وہ ان کو بہت برے لگتے ہیں۔“

”اوہ۔ تم تو بہت ذہین ہو، آرم امپریس یار۔“
”تم نے پھر مجھے یار کہا۔ تمیز سے رہا کرو۔“
”لیے خرے اور رعب تم مار کے سامنے دکھاؤ تو کچھ بات بھی ہے۔“
”نہیں اس کے سامنے جاؤں گی تو کچھ دکھاپاؤں گی نا“
ایک موقع ملا تھا مگر گرینی نے منع کر دیا۔
”کیسا موقع؟“

☆ ☆ ☆

”اما۔ یہ سنری موقع ہے۔“ زینی مہر کو منارہی تھی۔
”مگر کارا نے تمہاری گرینی کو فون کر کے پہلے ہی اس مقصد کے لیے بیشا کو بلوایا ہے۔“
”کیا؟ بیشا۔“

”اور یہ اسی سے سوٹ کرتا ہے۔ تم خود سوچو، ایک طرف تم مار سے شادی کرنا چاہتی ہو اور دوسری طرف وہ کرنا چاہتی ہو جس کے لیے سب سے پہلے ذہن میں صرف بیشا جیسی لڑکی کا نام آتا ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ بیشا تک کے لیے تمہاری گرینی نے منع کر دیا ہے کارا کو۔“

”زبردست۔ یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ اب تو جب آپ کارا آئی سے کہیں گی کہ چونکہ گرینی نے نہیں، آپ یہ ظاہر کریں کہ انکار گرینی نے نہیں، بیشا نے خود کیا ہے تو اس وجہ سے آپ ان کی پریشانی کا خیال کر کے مجھے مدد کے لیے بھیج رہی ہیں۔“
”تو تم نہیں بانو گی؟“

مرزج ہوا تھی جو بھی تھا کارا سے انہی رقابت کی وجہ سے وہ اس کے سامنے کبھی بھی سر نہ بٹھا رہی تھی۔
”پلیز نا۔ ان پہ بہت اچھا امپریشن پڑے گا۔“

☆ ☆ ☆

”ان پہ اچھا امپریشن ڈالنے کے لیے تمہیں وہاں ضرور جانا چاہیے، مٹاؤ گرینی کو۔“
”عجیب ہو تم۔ کبھی کہتے ہو مجھے مار کو اگنور کرنا چاہیے۔ اس پہ ظاہر ہی نہیں کرنا چاہیے کہ میں اس کی ایک نظر کے لیے مر رہی ہوں اور کبھی کہتے ہو کہ کارا آئی کے آگے پیچھے پھر کے ان کی چالوسی کرنی چاہیے۔“

”ظہریوں کو پٹانے کے طریقے الگ ہیں اور ان کی ماؤں کو پٹانے کے الگ۔“
”تمہیں یہ سب کیسے پتا، تم نے کبھی کسی لڑکے کو پٹایا۔“

”شٹ اپ۔“
وہ بھٹا اٹھا اس نامعقول سوال پہ۔

☆ ☆ ☆

کارا سے پہلے گرینی کو پٹانے کا مرحلہ سر کیا بیشا نے۔ ادھر مرنے بھی زینی کے کہنے پہ کارا کو فون کر دیا۔ اب کارا میڈم پریشان۔
”مار۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں، آئی سے میں نے خود کہا تھا بیشا کے لیے مجھے لگاؤ انکار کرنا چاہ رہی ہیں۔ مگر کر نہیں پا رہیں، ادھر مرنے خود فون کر کے زینی کے لیے کہا تو میں منع بھی نہ کر سکی۔ بہر حال مجھے کسی کی مدد کی ضرورت تو ہے ہی، لیکن اب آئی بھی بیشا کو بھیج رہی ہیں۔“

”تو بھیجے دیں۔ سو واٹ، اچھا ہے آپ کی زیادہ سے زیادہ دلچسپی ہو جائے گی۔“
وہ الٹا مطمئن ہو گیا کہ زینی پہ کام کا زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا تو اس کا موڈ آف نہیں ہو گا۔
کچھ ایسی ہی سوچ زینی کی بھی تھی۔

”آنے دو اسے بھی۔ میرا کیا جاتا ہے۔“
”مگر وہ ایسے کاموں میں بڑی تیز ہے۔“ ایچی نے ڈرنا چاہا۔
”یسا نہ ہو کارا آئی کو امپریس کر لے۔“
”ہاں ہاں پتا ہے۔ عادی ہے وہ ان سب کاموں کی اور ماہر بھی۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ اچھا ہے وہ

آجائے۔ اب سارے فضول کام وہ کرے گی، میں پورے دھیان سے مار اور کارا آئی کے دل میں اترنے کے مرحلے طے کروں گی اور مجھے پتا ہے کہ اس کے کیے کرائے کو میں نے اپنے نام کیسے کرنا ہے۔“
”اوہ۔ تو اس کے سارے کاموں کا کریڈٹ تم لینے والی ہو؟“
ایچی اب معاملے کی تہ تک اتری۔

☆ ☆ ☆

رومان پہلے گلاب کی قلمیں لگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مٹی سے بھرے تھے۔ کیلی مٹی کو تھپتھا کے وہ اٹھا اور پائپ سے ساری، بیلوں کو پانی لگانے لگا۔ اسی اثنا میں زینی اٹھاتی بل کھاتی فون پہ بات کرتی اندر سے نکلی۔
”میں کب سے ویٹ کر رہی ہوں مار! تم لیٹ ہو گئے ہو؟ کہاں ہے؟“

رومان کی مخصوص شرارتی مسکراہٹ بیک وقت ہونٹوں اور آنکھوں میں لپکی اور اس نے پائپ کا رخ زینی کی جانب کر دیا۔ وہ ایک دم ہڑبڑا تھی۔
”اوہ۔ گاڈ۔ یہ کیا ہے؟“

اس کے سنبھلتے سنبھلتے ہی رومان اسے بھگو چکا تھا۔ زینی خطا ہوتے اوسان کے ساتھ ہاتھ میں پکڑا موبائل ایک طرف پھینک کے کسی ستون کی آڑ لینے لگی۔
”کیا بد تمیزی ہے یہ۔ کون ہو تم؟“

”اوہ۔ سوری۔“
رومان چہرے پر گھبراہٹ کے آثار لیے اسی رخ پر مڑا جہاں وہ مڑی تھی اور ساتھ ہی اس کا پانی کا پائپ بھی۔
”پتا نہیں کیسے یہ۔ سوری۔“

پائپ ایک بار پھر اسے نشانے پر لیے ہوئے تھا۔ وہ چلائی ہوئی اچھل کے دوسری جانب مڑی۔
”ہٹاؤ اسے۔“
”اوہو۔ آپ تو ساری بھگ گئیں۔“
معذرت اور ہمدردی کے دوران بھی پائپ کا رخ

مسلل زین کی جانب ہی تھا یہاں تک کہ وہ چیختی چلاتی اندر کی طرف بھاگی۔
”اما۔ یہ کون ہے۔ کے گھر میں گھسار کھا ہے آپ نے۔“

رومان نے نیچے گرا مو بائل فون اٹھایا اور پائپ کی پھوار سے اسے بھی تسلی بخش انداز میں فیض یاب کرنے کے بعد دوبارہ نیچے پھینک دیا۔
مارکتی ہی دیر نہیں ملا تاربا۔ مگر دوسری جانب زین کا فون اسے مسلسل بندل رہا تھا۔

یشا چلتے نہیں بھاگتے ہوئے پگڈنڈی سے گزر رہی تھی جب رومان نے اس کے سامنے لاکے بائیک روکی۔

”منو لڑکی!“

”تمیز سے۔“

یشا نے گھر کا۔ رکی وہ پھر بھی نہیں۔

”ہر پائی نیس! رکیے تو۔“

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ زین کب کی پہنچ چکی ہوگی۔“

”نہیں پہنچی اور ابھی اسے ایک آدھ گھنٹہ اور لگے گا۔ تم آؤ، میں تمہیں دس منٹ میں وہاں پہنچا دیتا ہوں۔“

”لےئے تھینک یو رومان!“ وہ اچھل کے بائیک پر سوار ہو گئی۔

”اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ یہ تو میری ڈیوٹی ہے یار!“

”پھر سے یار؟“

یشا نے اس کی کمر باندھو کا جڑا۔ رومان نے حسب وعدہ دس منٹ کے اندر اندر بائیک کارا کے گھر کے سامنے روکی۔ راستے میں وہ اسے زین کو بھگونے اور اس کا فون خراب کرنے کا کارنامہ سناچکا تھا جس پر یشا کو بڑے زور کی ہنسی آئی تھی اور ہنستے ہنستے وہ یکدم خائف ہو گئی جب کارا کے گل جیسے گھر پہ نظر پڑی۔

پہلے اس نے اپنے کپڑے دونوں ہاتھوں سے جھاڑے ان کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کی پھر بال سنوارنے لگی۔

”رومان! میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں میں بہت بہت نروس ہوں۔“ پھر وہ اس کی بائیک میں لگے آئینے میں خود کو دیکھ کے تسلی کرنے لگی۔
”میں ٹھیک لگ رہی ہوں نا۔“

رومان نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس مسکراتا رہا۔ جانتا تھا کچھ بھی کہہ دے وہ یقین کرنے والی نہیں۔

بے اعتماد قدموں کے ساتھ پسینے کی بوندوں سے بچی پیشانی اور غنڈے رخ ہوتے وجود کے ساتھ اس نے آگے قدم بڑھانا چاہا تو ٹھنک کے رک گئی اس کا ہاتھ رومان کی گرفت میں تھا۔ یشا نے ابرو اچکا کے نظروں ہی نظروں میں سوال کیا۔ رومان اسی طرح اس کا ہاتھ تھامے تھا۔ بائیک سے اترا۔ گھٹنوں کے بل جھکا اور اس کے ہاتھ کو چومتے ہوئے عقیدت سے کہا۔

”وش یو آل دی بیسٹ مائی کو مین!“

جیسے جاو کی چھتری گھوم گئی۔

بل میں سب بدل گیا۔

یشا کی ساری گھبراہٹ ہوا ہو گئی۔ چہرے پہ اعتماد جھلکنے لگا اور اس نے بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ رومان سے چھڑایا۔ گردن اکڑائی اور ایک تمکنت بھرے اعتماد کے ساتھ شاہانہ چال چلتی اندر بڑھنے لگی۔

رومان ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی اور نظروں سے اوجھل ہوتے ہی رومان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ ایسے اوجھل ہوئی جیسے اس نے اپنی بڑی قیمتی چیز کسی کو خود اپنے ہاتھوں سوئپ دی ہو۔

ایمی منہ بنائے بیٹھی تھی۔
”زین تو زین یشا بھی وہاں گئی ہے۔ میں ہی قائل ہوں۔“

”تمہیں وہاں وقت ضائع کرنے کے بجائے یہاں دھیان دینا چاہیے۔“
مہر کے مشورے پہ وہ ہاتھ نچانے لگی۔
”کوئی نہیں۔ میں نہیں کرنے والی یشا والے کام۔“

”تم سے کہہ کون رہا ہے! لٹا سارے کام بگاڑو گی۔ بہتر ہو گا تم سارا دھیان رومان پر رکھو۔“
”رومان؟“ وہ چونکی۔

”ہاں۔ میں نے تمہارے لیے اسے منتخب کیا ہے اس سے بہتر لڑکا کوئی ہو ہی نہیں سکتا گھر واما دنانے کے لیے۔“

ایمی نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ رومان پینٹ کا ڈبا اٹھائے اندر داخل ہو رہا تھا۔ ایمی نے پہلی بار غور کیا۔
”مہوں۔ اتنا برا بھی نہیں ہے۔“

اگلے ہی بل وہ پچھلے والاں میں تھی جہاں وہ دیواریں رنگ رہا تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہا گیا کیونکہ جس دیوار پہ اس نے برش پھیرنا تھا اس سے ٹیک لگا کے ایمی کھڑی چیونچم کے بل بنا رہی تھی۔ رومان گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔
”کیا گھور رہے ہو؟“

”سوچ رہا ہوں اگر تمہیں پینٹ کروں تو کتنا ٹائم اور لگے گا۔“

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟“

”نہیں۔ سیدہ سلی۔“
”تو پھر ٹھیک ہے مجھے فضول مذاق پسند نہیں ہے۔“

اسنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتی پر شکوہ خانم نے بڑی ہی ناگواری سے یہ منظر دیکھا۔ اور فوراً ”مہر سے باز پرس کرنے لگی۔“

”یہ کس راہ چلتے کو تم نے گھر میں گھسالیہ ہے مہرا!“
”رومان کی بات کر رہی ہیں آپ؟“

”ہاں۔ تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ اس گھر میں تین تین جوان خوبصورت لڑکیاں ہیں اور تم نے ایک جوان جہان اجنبی لڑکے کو یہاں دندنانے کی اجازت

دے دی ہے۔“

”رومان بہت اچھا اور شریف لڑکا ہے اور پلیز! آپ میرے معاملوں میں نہ بولا کریں۔ مجھے اچھی طرح جانتا ہے کون کتنا قابل بھروسا ہے۔“

”تمہیں یہ پتا ہوتا تو تم سیف اللہ پہ بھی بھروسا کرتیں مہرا!“
وہ تاسف سے کہتی وہاں سے چلی گئیں۔

کارا اور زین دونوں کے چروں پہ ایک دوسرے کے لیے زبردستی کی مسکراہٹ تھی۔ جیسے دل پہ پتھر رکھ کے جھیل رہی ہوں۔

”ویسے تو کلج اور اسٹڈیز کی وجہ سے اتنا ٹائم نہیں ملتا پھر بھی ماما نے مجھے اتنا ٹریڈ تو کر دیا ہے کہ میں ضرورت پڑنے پہ کوئی بھی کام کر سکوں۔“

”ہاں۔ مہر کی ٹریننگ تو تم میں صاف نظر آرہی ہے۔“ کارا نے مسکرا کے چبھتے لہجے میں کہا۔

”میں پہلی بار یہاں ہونے والی کسی آپرل کی رسم میں شرکت کر رہی ہوں۔ سو رہے مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں ہے۔“

اس نے بے نیازی جتنی چاہی مگر دوسری جانب بھی کارا اٹھی۔

”مگر تمہیں پسند نہیں ہے جانی! تو کوئی بات نہیں۔ کوئی فورس نہیں کر رہا۔ تم بے شک اینڈ نہ کرنا سوٹ ہارٹ!“

وہ گھبرائی۔ ہانسہ پلٹ گیا تھا۔
”نہیں آنی! آپ کی بات اور ہے۔ آپ کے گھر کا کوئی بھی فنکشن میں کیسے مس کر سکتی ہوں۔“

ان دونوں کی گفتگو سے الگ یشا رومان کی ہدایت کے پیش نظر صرف اور صرف کام پر دھیان دیتے ہوئے کسی ملازم سے کشنڈ وغیرہ دیوار ہی تھی مگر تب اس کا سارا اٹھماک دھرا کا دھرا رہ گیا جب مارکو سیڑھیوں سے نیچے اترتے دیکھا۔

”زین! تمہیں میرے ساتھ فلاور شاپ تک چلنا

ہوگا۔ میں چاہتا ہوں تم اپنی پسند کے پھول آرڈر کرو۔

وہ میٹھا کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا اس کے پاس سے گزر گیا۔ زینی نے بے کاری سعادت مندی دکھائی۔
”نہیں مائرا میں کار آئی کے ساتھ بڑی ہوں ان کو میری ضرورت زیادہ ہے۔“

”نہیں زینی! مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے نہ ہونے سے یہاں میرا کوئی کام رکے گا۔“ کارا نے صاف گوئی اور بے مروتی کی انتہا کر دی۔ ”تم چاہو تو جاسکتی ہو۔“ وہ دل سے چاہتی تھی زینی چلی جائے اسے برداشت کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا سر کو جھیلنا۔

میٹھا ابھی تک کم صدمہ بتی کھڑی تھی اسے اپنے پیچھے سے آتے دونوں ملازموں کی آواز بھی نہ سنائی دی جو کوئی صوفہ اٹھائے اس کے پیچھے کھڑے منتظر تھے کہ وہ کب راستہ دے۔

”پلیز سائیڈ پر ہو جائیں۔“
کارا متوجہ ہوئی تو اس نے بھی پکارا۔
”میٹھا۔“ مگر میٹھا مائرا کو زینی کے اتنے نزدیک دیکھ کے اور اس کی پیار بھری نظریں زینی پر مرکوز دیکھ کے گنگ ہو گئی تھی۔

”اسے صرف دکھائی ہی کم نہیں دیتا۔ سنائی بھی کم دیتا ہے۔“ زینی کے طنز سب اس پر پڑے۔

کارا بھی سائز بھی اور چھ سات ملازم بھی۔ ان کی کھلکھلاہٹ نے میٹھا کو ہوش دلایا مگر ہوش آگے پھر سے اڑ گیا جب احساس ہوا کہ اس وقت کتنے لوگوں کی تسخیر بھری نظروں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

”تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا میٹھا! کہ تم راستہ روکے ہوئے ہو۔“

کارا نے ناگواری سے ٹوکا۔
”اسے کم سننے، کم دیکھنے کے ساتھ ساتھ کم سمجھنے کی بھی عادت ہے آئی! زینی نے مائرا کے ساتھ باہر نکلے نکلے ایک اور چٹکی بھری۔

میٹھا کی آنکھوں کے کنورے آنسوؤں سے بھر گئے۔

”اب کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟“
رومان کوئی سوچ بورڈ کھولے اسے ٹھیک کرتے ہوئے فون پر میٹھا سے بات کر رہا تھا جو کارا کے گھر میں ہی کسی کونے میں دبی بڑی رو رہی تھی۔
”وہ مجھے نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔“

”کیونکہ تم جان بوجھ کے اس کی نظروں میں آنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ایسے وہ تم پر توجہ نہیں دے گا۔ تم سے چڑے گا۔“

”اور اگر میں اسے نظر ہی نہ آؤں گی تو کیا وہ میرے پیچھے آئے گا بے وقوف! ان دیکھی چیز کے پیچھے کوئی کیسے جاسکتا ہے۔ دل تو اسی کی طرف جاتا ہے جو نظر کو اچھا لگے۔“

”چھپی ہوئی چیز کو ہی تو ڈھونڈنے میں مڑا آتا ہے۔ سمجھیں۔“

”کارا میم کہہ رہی ہیں باہر پھولوں کی ڈلیوری آئی ہے چیک کر لیں۔ کم تو نہیں۔“ کسی ملازمہ کے آگے کھنپے میٹھا نے فون رکھا۔
”اچھا۔ میں رات کو آگے ملتی ہوں۔ ابھی کام ہے۔“

رومان نے ابھی ریسیور رکھا نہیں تھا کہ پر شکوہ خانم آگئیں۔

”کس کی اجازت سے تم نے فون استعمال کیا؟“
”میں فون کا تار ٹھیک کر رہا تھا۔“

”میں نے خود تمہیں کسی سے بات کرتے سنا ہے۔“

”وہ تو اس لیے کہ مجھے پتا چل سکے غون ٹھیک ہوا یا نہیں۔“

”باتیں بہت بتاتے ہو تم۔“
”چائے بھی بہت اچھی بنا تا ہوں۔ بناؤں آپ کے لیے؟“ اس نے اتنی اپنائیت کے ساتھ کہا کہ وہ فوری طور پر انکار بھی نہ کر سکیں اور وہ مزید رعایت لے گیا۔
”دل کر رہا ہے نا آپ کا؟ میں جانتا ہوں اس موسم

میں زبردست سی چائے کا ایک کپ ہی آپ کا موڈ ٹھیک کر سکتا ہے۔ اور وہ بھی لاپتھی والی۔“
”تمہیں کس نے بتایا کہ مجھے لاپتھی والی چائے پسند ہے۔ یہ بات تو صرف میٹھا۔“

وہ چونکیں۔ مگر وہ ان کے اگلے سوالات سے بچنے کے لیے فوراً ہی منظر سے غائب ہو گیا۔
”میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“

میٹھا کارا کے گھر کے وسیع و عریض ڈرائیوے میں کھڑے ایک لوڈر سے پھولوں کے ٹوکڑے اتروا رہی تھی۔

”یہ والا اوپر بلکہ یہ دونوں اوپر لے جاؤ۔“ ملازموں نے حکم چلانے کا اپنا ہی سرور تھا۔

مائرا فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے اندر سے نکلا۔ میٹھا کی دھڑکن خود بخود تیز ہو گئی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ رومان کی ساری نصیحتیں بھی گونجنے لگیں۔

اس نے اپنی بے قراری پر خود کو گھر کا دھیان بنانے کے لیے وہ رخ موڑ کے کسی ملازم کو ڈانٹنے لگی۔
”کتنے ست ہو تم ذرا سا کام ہے اور گھنٹہ لگا دیا۔ جلدی کرو۔“

اور جس وقت مائرا فون کان سے لگائے اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وہ اچانک ہی مڑی اور سختی سے اس سے مخاطب ہوئی۔
”اور تم کیا فون پر گیس لگا رہے ہو۔ کام کرو کام۔“

مائرا چونکا۔ رکا۔ ”جی؟“
میٹھا نے فوراً ہی ایک پھولوں کا ٹوکڑا اسے تھما دیا اور رعب سے کہا۔

”یہ لو پکڑو۔ اندر رکھ کے آؤ اور آگے دوسرا بھی لے جاؤ۔“

”آپ نے مجھ سے کہا؟“ وہ حیرت کے مارے بے ہوش ہونے کو تھا۔

”تمہارے علاوہ دوسرا کوئی ملازم مجھے یہاں نظر نہیں آ رہا۔“

”اب کس کی بوزی۔ میں ملازم نہیں ہوں۔ میں۔“
”تم جو بھی ہو۔ مجھے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔“

وہ سرسری سا کہہ کر اندر جانے کے لیے پلٹی۔ بڑی مشکل سے چہرے پر جو بے نیازی سجائی ہوئی تھی۔ دھواں ہو گئی۔ اب وہاں بے تحاشا گھبراہٹ اور خوف نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں زور سے میچے وہ آہستہ آہستہ ہونٹ بد بداتی جا رہی تھی کہ کہنے کو تو کہہ دیا اب نجانے کیا نتیجہ نکلے اس بکو اس کا۔
”سنو۔“

بالآخر مائرا نے اپنی حیرت پر قابو پا کے اسے پکارا۔ وہ رکی ضرور مگر مڑنے سے اجراڑ کیا کہ وہ اس کے چہرے سے اس کے دل کی کیفیت نہ بھانپ لے۔

”مگر مجھے تمہارے بارے میں جاننے میں دلچسپی ضرور ہے۔“ ”میں مائرا ہوں۔ اور تم؟“

جیسے ہی اس نے سامنے آگے اپنا ہاتھ آگے کیا۔ میٹھا نے بڑے جتنوں کے ساتھ اپنے چہرے کی خوشی چھپائی اور بے نیازی نظر آتے ہوئے سرسری سا ہاتھ ملایا۔

”میٹھا۔ میٹھا سیف اللہ۔“ اور آگے بڑھ گئی۔

”وہ خود میرے پیچھے آیا اور اس نے میرا نام پوچھا۔“

میٹھا اپنی کامیابی کا سارا حال رومان کو بتاتے ہوئے حال سے بے حال ہو رہی تھی۔
”میں مائرا ہوں۔ اور تم؟“

اس نے مائرا کے انداز میں ہاتھ آگے کر کے اپنی آواز بھاری کرتے ہوئے کہا کہ اور کھلکھلا کے ہنس دی۔

”اور یہ سب اس لیے ہوا کہ تم نے اسے انور کیا۔ اسے اہمیت نہیں دی۔ میں نے کہا تھا نا۔“

”ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔“
”تو یعنی اب تم میری باقی سب باتیں بھی مانو گی؟“

Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan
a Complete Set of
5 Painting Books
in English



Water Colour I & II
Oil Colour
Pastel Colour
Pencil Colour

آپ آرٹ کے طالب علم ہیں یا پروفیشنل آرٹسٹ
برش پکڑنے سے مکمل پینٹنگ تک آپ بن سکتے
ہیں ایک مکمل آرٹسٹ

اب پینٹنگ سیکھنا بہت آسان ایک ایسی کتاب
جس میں پینٹنگ سے متعلق ساری معلومات



Art With You
شائع ہوگئی ہے

قیمت - 350/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”ماں تمہاری محبت میں گرفتار ہے مکارا آئی نہیں۔
ایسا نہ ہو کہ فنکشن پر کوئی اور انہیں تم سے زیادہ پسند
آجائے اور وہ ماں کے نام کا آپٹل اس کے سر پہ ڈال
دیں۔ مت بھولو اس رسم میں یہ اختیار صرف ماں کے
پاس ہوتا ہے اور کارا آئی کی ماں سے ذرا نہیں بنتی۔ وہ
اس بات کا بدلہ تم سے لے سکتی ہیں۔“
ایمی کی باتوں نے اسے دوسو سوں میں ڈال دیا۔



رومان کورات گزارنے کے لیے اس سے قریبی اور
اس سے محفوظ جگہ کوئی اور نظر نہیں آئی۔
میشا کے گھر کا سال خورہ گیٹ پھلانگنا اس کے لیے
کون سی نئی بات تھی۔ کچھ دن پہلے اس رات اسی
گیٹ سے کود کے توہ آیا تھا اس سے پہلی بار ملنے۔
بادام کے درخت کے نیچے وہ لیٹ گیا۔ ٹھنڈی
ہوائیں جسم کے آریار ہو کر کپکپی طاری کر رہی تھیں۔
مگر سارے دن کی تکان بار بار آنکھیں موندنے پر مجبور
کر رہی تھی۔

میشا نے کھڑکی سے دیکھا اگرچہ لان میں نیم تاریکی کا
عالم تھا مگر چاند کی ٹھنڈی روشنی سیدھی رومان کے
چہرے پر پڑ رہی تھی۔

”بے چارہ پرا۔ پرستان کی گاڑی چھوٹ گئی
ہوگی۔“

اس نے تاسف سے سوچا۔ رومان نے کچھ ایسی ہی
کہانی سنائی تھی اسے۔

اس نے شال اٹھائی اور کمرے سے نکلی۔ سوئے
ہوئے رومان پہ شال ڈالتے ہوئے وہ پل بھر کے لیے
ٹھکی۔

”سو تا ہوا کچھ معصوم لگتا ہے۔“

وہ ہلکا سا مسکرائی اور شال اوڑھانے کے بعد پلٹی تو
جھٹکا کھا کے رک گئی۔ اس کا ہاتھ سوئے ہوئے رومان
نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں اب
بھی بند تھیں مگر ہونٹوں کی شرارتی مسکراہٹ بتا رہی
تھی کہ وہ جاگ رہا ہے۔

”اب گھر بھاگو شاباش۔ دیر ہو رہی ہے۔ صبح
تمہیں جانا بھی ہو گا ماں کے پاس۔“
میشا اچھے بچوں کی طرح فوراً ہی گھر کی طرف جانے
والے راستے کی جانب مڑ گئی اور رومان سارا کے گھر کی
طرف۔ مگر وہاں ایک نئی مصیبت سامنے تھی۔ سارا
کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔
وہ دونوں ہاتھ کمرے رکھے جو خوار نظروں سے
گھورتی اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔
”یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تم نے؟ مہر کے لیے ایک
آدھ گھنٹہ جانے کی اجازت کیا دی تم نے سارا دن گھر
سے باہر گزارنا شروع کر دیا۔ اور روز آدھی آدھی رات
تک میں جاگ رہی ہوتی ہوں کہ کب تمہاری شاہی
سواری اترے اور میں گھر لاک کروں۔“
”وہ دراصل مہریم نے اتنے کام تادیے کہ۔“
”تو ٹھیک ہے۔ جاؤ اپنی مہریم کے پاس۔ جو تمہیں
اتنے کام دے سکتی ہے رات رکنے کی جگہ بھی وہی
دے۔“

سارا نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔



”ماں پوری طرح میری محبت میں گرفتار ہے۔
میرے علاوہ اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ یہ آپٹل کی
رسم والا فنکشن تو ایک فارمیٹھی ہے۔ مجھے تو بڑا مزا
آئے گا ان سب لڑکیوں کے اترے ہوئے چہرے دیکھ
کے جو وہاں ماں کے خواب سجا کے آئیں گی۔“
زینی امی کے سامنے اتر رہی تھی مگر امی بھی اپنی
ناقص عقل کے مطابق اس کی ساری اتراہٹ منی
میں ملانے کو تیار بیٹھی تھی۔

”میری مانو تو ماں سے کہہ کر یہ فنکشن کینسل کرا
دو۔ کیا فائدہ بے چاریوں کی آہ لینے کا۔“

”ہوئے دو تیار۔ مزا آئے گا۔“

”ایسا نہ ہو لوگ تمہاری حالت سے مزے لینے
لگیں۔ تمہارا مذاق بن جائے۔“
”کیا مطلب؟“

”ہاں۔ بولو۔ بولو۔“ میشا نے فی الحال تو فیاضی
دکھائی۔
”اسے مزید انگور کرو۔ بار بار کرو۔“
”کوئی نہیں جی۔“ میشا نے صاف انکار کر دیا۔ ”بس
انتا کافی ہے۔ ویسے بھی ماں کوئی انگور کرنے والی چیز ہے
بھی نہیں۔“
”تو ٹھیک ہے۔ تم اسے جی بھر کے اہمیت دو تاکہ وہ
تمہیں انگور کر سکے۔ اس نے صرف تمہارا نام پوچھا
ہے۔ شاہی کی ڈسٹ لکھیں کرنے کا نہیں پوچھا جو تم
اتنی خوش ہو رہی ہو۔“
”مگر میں بار بار اس کے ساتھ ایسے پیش آؤں گی تو
وہ برا مان جائے گا۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔
”نہیں۔ وہ چونکے گا۔ اور جب کوئی کسی کو
چونکانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ اسے اپنے بارے
میں سوچنے پہ بھی مجبور کر دیتا ہے۔ وہ تمہارے بارے
میں سوچے گا میشا۔“
”پکا؟ اس نے تصدیق چاہی۔
”ہوں۔ پکا۔“
”اچھا۔ یعنی اب میں اسے پہچاننے سے دوبارہ انکار
کروں؟“

”ارے نہیں بھئی۔ ورنہ وہ تمہاری دماغی حالت پہ
شک کرے گا کہ شاید تمہیں بھولنے کی بیماری ہے
اس سے جب بھی ملو ٹائمرل انداز میں ملو۔ اس پہ یہ
ظاہر مت کرو کہ تم اس کی خاطر وہاں جاتی ہو۔ اس کے
آس پاس مت منڈلاؤ۔ وہ بات بھی کرے تو ایسے
جواب دو جیسے اس پہ احسان کر رہی ہو۔ اس کے پیچھے
مت بھاگو۔ دیکھنا وہ خود ایک دن تمہارے پیچھے آئے
گا۔“

”سوچ لو۔ تمہارے کہنے پر ہامی بھر رہی ہوں۔ ایسا
نہ ہو میرا کباڑا ہو جائے۔“
”نہیں ہونے دوں گا۔ وعدہ کیا ہے تمہارے
خواب پورے کرنے کا۔ کر کے رہوں گا۔“
رومان کو یکایک اس پہ ڈھیر سارا پیار آیا۔ وہ ہولے
سے اس کا سر تھپتھپا کے بولا۔

”جھوٹے ڈرامے بازار!“ میٹھا مسکرا کے بولی۔
رومان نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سہل
آنکھوں کے ساتھ نیم خوابیدہ آواز میں بولا۔
”شکریہ۔ اے مہربان۔ نرم دل ملک۔“

زینی مکمل طور پر اپنی کی رات والی باتوں کے زیر اثر
تھی۔ اسے کارا کو کھانچا اور لیا دیا انداز بھی یاد آ رہا
تھا۔

”یہ صحیح کہتی ہے۔ ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ
عین موقع پر دعا دے گئیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔
مارا تو اتنا زیادہ ماما بوائے ہے کہ۔ نہیں مجھے خود کچھ
کرنا ہوگا۔“

اس نے تہیہ کر لیا تھا اس لیے چھوٹے ہی مارے
فرمائش کر دی۔

”کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟“
”تمہیں کوئی شک ہے؟“

”یقین دلانے میں کوئی حرج ہے؟“
”بالکل نہیں۔ بولو۔ کیسے یقین دلاؤں؟“

”میں چاہتی ہوں۔ تم برسوں جو آپٹل کی رسم والا
فنکشن ہو رہا ہے۔ اسے کیٹسل کراؤ۔“

”کیا؟“ مارا اس انوکھی فرمائش پر بھونچکا رہ گیا۔
”ہاں۔ اپنی مام سے کہو کہ تم اس رسم کے خلاف ہو
اور اسے بالکل بھی پسند نہیں کرتے۔“

”میں واقعی پسند نہیں کرتا اور شروع میں ہی مام
سے کہہ بھی چکا ہوں مگر وہ نہیں مانی تھیں نہ اب مانیں
گی۔“

”تم منواؤ۔ کسی بھی طرح۔“ وہ زور دے کے بولی۔
”مگر کیوں زینی؟“

”کیونکہ اس سے سوائے وقت ضائع ہونے کے اور
کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جب تم یہ طے کر چکے ہو کہ
تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہے اور یہ بات تم اپنی مام کو
بھی بتا چکے ہو تو ان سب کا مقصد کیا ہے۔“

”مام کا کہنا ہے ہمارے ہاں ہوا سی طرح پسند کی
جاتی ہے۔ میں ایک ہی بیٹا ہوں ان کا۔ وہ میرے
حوالے سے سب رسمیں پوری کرنا چاہتی ہیں۔ میں تم
سے شادی کروں گا۔ مگر یہ بات ساری فیملی کے سامنے
اسی انداز میں ظاہر کی جائے گی۔ یہ مام کا کہنا ہے۔“

”مام یہ چاہتی ہیں۔ مام وہ چاہتی ہیں۔ مام کا یہ کہنا
ہے۔ مام کا وہ کہنا ہے۔ تم خود بھی کچھ کر سکتے ہو یا نہیں؟
ہر بات اپنی مام سے پوچھ کے کرنی ہے تو مجھ سے محبت
بھی اپنی مام سے پوچھ کے کرتے۔“

وہ حسب مزاج ہو گئی۔ مگر مارکی نفیس طبیعت کو
اس کا چلا تار لگا۔ وہ ناگواری جتا گیا۔

”زینی! مجھے بالکل پسند نہیں کہ کوئی مجھ سے اس
طریقے سے بات کرے۔“

”اوہ ریلی۔ تمہیں خود بھی کچھ پسند یا ناپسند ہے؟
مجھے تو لگا ہر معاملے میں مام کی ہی پسند ناپسند چلتی
ہوگی۔“

کارا نے مارا کو بالکل ایک مختلف ماحول میں پالا تھا۔
ایسی بچکانہ بحث۔ طنز۔ طعنے۔ یہ سب اس کے مزاج
اور فطرت سے میل نہیں کھاتا تھا۔

”جب تم ڈھنگ سے بات کرنے کے موڈ میں
ہوگی تب ملتے ہیں۔“

زینی کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر وہ چلا گیا اور وہ
تلملائی رہ گئی۔

رومان نے پر شکوہ خانم کو الائیچی والی چائے پلا پلا کے
اور اپنی کچھ داریا میں سناٹا کے شیشے میں اتار لیا تھا۔
”چائے اچھی بناتے ہو تم۔ بالکل میٹھا کی طرح۔
وہی ذائقہ وہی خوشبو۔“

”اور وہی ریلیسی“ وہ بے ساختہ بولا مگر اس کی
روانی میں کئی بات انہیں چونکا گئی۔

”تمہیں کیسے پتا اس کی ریلیسی کا؟“
”ظاہر ہے۔ ذائقہ اور خوشبو ایک جیسی ہے تو
طریقہ بھی وہی ہوگا۔ چلیں میں آپ کو آپ کے
کمرے میں لے جاتا ہوں۔ آپ کے آرام کا وقت

ہو گیا ہے۔“ اس نے وہیل چیئر آگے دھکیلی۔
”تمہیں تو دو دن میں ہی میری ساری روٹین یاد
ہو گئی۔“
وہ شفقت سے مسکرائیں۔

مارا کی عادت تھی جب آپ سیٹ ہوتا خود کو کمرے
میں بند کر لیتا۔ زینی نے اس بد مزگی کے بعد دو تین بار
اس سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ فون بھی
بند کر کے بیٹھا تھا۔ وہ غصے میں پھری اس کے گھر پہنچ
گئی۔ غصہ تو آتا ہی تھا۔ سب کچھ اس کی توقعات کے
خلاف جو ہو رہا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا اس کی ناراضی
دیکھ کے مارا کے ہاتھ پر پھول جائیں گے اور اسے مانتے
ہی بنے گی۔

”کارا! آئی! مارا کہاں ہے؟“
وہ چھوٹے ہی بولی اور کارا کو اس کا مالکانہ طرز
تخاطب ذرا نہ بھایا۔ ماں بیٹا ایک جیسے مزاج کے مالک
تھے۔

”تمہیں اس سے کیا کام ہے؟ تمہیں مجھ سے یہ
پوچھنا چاہیے کہ مجھے تمہاری کسی قسم کی مدد کی
ضرورت تو نہیں۔ تم غالباً روز اسی لیے یہاں آ رہی
ہو۔“

کارا کے تنبیہی لہجے نے زینی کو سنبھلنے پر مجبور کیا۔
”میں آپ کے پاس یہی کہنے آئے والی تھی آئی! مگر دراصل
مارا مجھے بتائے بغیر کہیں چلا گیا۔“

”سے بتا کے جانے کی عادت نہیں ہے اور میں
نے بھی کبھی اس سے زیادہ سوال نہیں کیے۔ اسے پسند
نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ کہاں جاتا ہے کہاں نہیں۔ یہ
جاننا تمہارا مسئلہ نہیں ہے، تمہیں اپنے کام سے کام
رکھنا چاہیے۔“

کارا نے درشت لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔
زینی کا تو وہ حال کہ کاتو تو لہو نہیں۔ میٹھا کرا کر سیٹ
کرواتے ہوئے بار بار کن اکھیوں سے یہاں دیکھتے
ہوئے زینی کی سبکی کے مزے لے رہی تھی۔ کارا کے

منظر سے غائب ہوتے ہی زینی کے پاس آئی۔
”کچھ زیادہ ہی ہو گئی تمہارے ساتھ۔ چہ۔ چہ۔ کارا
آئی کا غصہ بھی نابل۔ شرمٹ پیو گی؟ شاید اندر لگی
آگ کچھ ٹھنڈی ہو جائے۔“
”تم میرے زخموں پہ نمک چھڑکنا بند کرو۔“ وہ
دھاڑی۔

”نہیں چاہیے مجھے تمہارا شرمٹ۔“
”جو میں بتانے والی تھی۔ اس کے بعد تو ضرور
چاہیے ہوگا۔ شرمٹ۔ مگر خیر۔ اب میں نہ بتانے والی
ہوں نہ تم سننے والی! اس نے شوشا چھوڑا اور پلٹی۔

”رکویتشا! بتاؤ! کیا کہتا تھا تم نے۔“ زینی نے بے تابی
سے اسے پکارا۔

”نہ بابا! میں نہیں بتاتی پھر تم کہو گی میں تمہارے
زخموں پہ نمک چھڑکتی ہوں۔“

”نہیں کہتی۔ اب خرے مت دکھاؤ۔ بتاؤ بھی۔“
”کارا! آئی کی رائے تمہارے بارے میں بہت بری
ہے۔“

”کتنی بری؟“

حنا

نادرہ خاتون

”تنتی ہی بری جتنی میری ہے۔“ میٹھا نے صاف گوئی سے بتایا۔
 ”تمہارا تو مجھے پتا ہے اور جتنی بری میں تمہیں لگتی ہوں گی تم مجھے اس سے دس گنا زیادہ بری لگتی ہو۔“
 زینی نے دانت کچکچا کے کہا۔
 ”چلو ہماری ایک دوسرے سے نفرت تو بنتی ہے مگر کارا آنتی کو تم اتنی زہریلوں لگتی ہو کہ وہ ہر وقت مار کو تمہارے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔“
 ”واقعی؟“

”ہاں۔ میں نے خود سنا تھا انہیں تمہاری برائیاں کرتے ہوئے اور وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ زینی میں عزت نفس نام کی کوئی چیز نہیں ہے اسے خود کو پلیٹ میں رکھ کے تمہارے سامنے پیش کرنے کا اتنا شوق ہے کہ اس کے لیے وہ کچھ بھی برداشت کر سکتی ہے۔ چاہے میں اس کی گتتی بھی انسٹل کر دوں یا چاہے تم اسے کتنا بھی نظر انداز کرو وہ چپ چاپ سب کچھ برداشت کرے گی۔“

”اے تو اسی لیے مار مجھے نخرے دکھا رہا تھا اور کارا آنتی میرے ساتھ ایسے ہوں۔ مگر یہ ان کی بھول ہے کہ میں چپ چاپ سب برداشت کر لوں گی۔ یا میرے اندر عزت نفس نہیں ہے اب ان کو پتا چلے گا زینی ہے کیا؟“
 میٹھا کھل کے مسکرائی۔
 زینی کو جوش میں لانے کا اس کا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔

”ہاں۔ میں نے نکالا تھا اسے گھر سے۔“
 سارا نے مہر کے استفسار پر بتایا۔
 ”بہت سرچڑھتا جا رہا تھا۔ تمہیں اسے اپنے گھر پر رکھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ سڑی میں باہر بڑا روتا تو دل غ ٹھکانے آجاتا۔ تمہارے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات کچھ زیادہ ہی پیدا

ہو رہے ہیں۔“
 ”نہ تو بے وقوف ہو سارا! تمہیں رومان کی وہ خوبیاں نظری نہیں آرہیں جو میں نے دیکھی ہیں۔“
 مہر کی بات سہ سارا نے مسخرانہ ہنکارا بھرا۔
 ”ہو نہ ہو۔ کون سی خوبیاں؟ ایک نمبر کا بہانے باز اور جھوٹا۔ مگر کام چور لڑکا ہے۔“
 ”مگر پوری دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے دل کا ساتھ ہے اور بہت ہی خیال رکھنے والا۔ یعنی پورا پورا ایک ہینڈ میڈ میٹرل۔“
 ”ہینڈ میڈ میٹرل؟“ سارا چونکی۔

”ہاں مجھے دیکھو میری شاہی سیف اللہ سے اس لیے زیادہ کامیاب نہ ہو سکی کہ اس پہ اس کی ماں کا کنٹرول تھا اور اوپر سے سیف اللہ کو اپنے خاندان اور حیثیت کا گھمنڈ بھی بڑا تھا۔ جبکہ رومان جیسے شوہر ہمیشہ منہمی میں رہتے ہیں۔ خاص طور پر اگر ان کو گھر داماد بنائے رکھا جائے۔ خود سوچو وہ اگر دکھائے بھی تو کس اوقات پہ اسے تو ساری عمر وب کے رہنا ہے۔“

”ہوں۔ کہتی تو تم ٹھیک ہو۔“
 مہر کی باتیں سارا کو سوچنے پہ مجبور کر گئیں۔
 ”بس یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے میں رومان کو توجہ دے رہی ہیں۔ تم تو جانتی ہو۔ زینی خوب صورت ہے۔ ذہین ہے اس کا کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ وہ سیف اللہ سے زیادہ تیز شوہر کو بھی ہینڈل کر سکتی ہے۔ مگر ای می کے لیے مجھے ایسا لڑکا چاہیے جو ساری عمر بے دام کا غلام بن کے اس گھر میں رہے۔“

مہر اپنی پلاننگ بتا کے داؤ طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جبکہ سارا اپنی اوچھڑن میں گم تھی۔
 ”بے دام کا غلام۔ اس نظر سے تو میں نے کبھی اسے سوچا ہی نہیں۔“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہجر کی شب ہے اور اُجالا ہے

کیا تصور بھی لکھنے والا ہے

غم تو ہے عین زندگی لیکن

غم گساروں نے مار ڈالا ہے

عشق مجبور و نامراد سہی !

پھر بھی ظالم کا بول بالا ہے

موت آئے تو دن پھر میں شاید

زندگی نے تو مار ڈالا ہے

کتنے اشکوں کو، کتنی آہوں کو

ایک تبسم میں اس نے ڈھالا ہے

دم اندھیرے میں گھٹ رہا ہے خمار

اور چاروں طرف اُجالا ہے

خمار بارہ بنگوی

اُداس لڑکیاں

اجل دیدہ، سحر زدہ، ستم نصیب

آئینے کے آس پاس لڑکیاں

اُداس لڑکیاں

تمام رات آفتاب ان کے انتظار میں رکھا رہا

کہ سو سکیں

تمام دن خزاں کی دھوپ ان کے گھر سے دُور

خیمہ زن رہی

کہ تیز روشنی سے مضطرب نہ ہوں

یہ زندگی کی سل پہ پس چکیں تو دنگ آئے گا

عدم نصیب عورتیں عدم کا راستہ بتائیں گی

یہ آئینے کے اس طرف گئیں تو آئینے کا باجرا سائیں گی

اُداس عورتیں سفر کے راز بے کے آئیں گی

سفر نصیب عورتیں

اجل نشاں عورتیں

عدم نژاد عورتیں

انور خالد

چسانڈ کی فصیلیں تھیں اور مکان شیشے کا
میں نے خواب میں دیکھا ساہبان شیشے کا

کیسے میں بچا لیتی خود کو تیز سورج سے
موم سے بنی تھی میں اور مکان شیشے کا

غیر کے لیے سچ کے مجھ سے رائے لیتے ہو
دل لگی زمانے سے، امتحان شیشے کا

اس قدر اُڑی مٹی، نقش مٹ گئے مارے
ریت میں چھپا دیکھو کاروان شیشے کا

صندلی مہک اٹھی میرے جسم و جاں سے بھی
بارشوں سے نکھرا ہے یہ جہان شیشے کا

میری ذات پہ ناصح انگلیاں اٹھاتا ہے
وہ کہاں سے بن بیٹھا ترجمان شیشے کا

میری کشتی دل تو ڈوبنا ہی تھی عینی
ریگ و سنگ کی لہریں اور بادبان شیشے کا
یعنی زاسید

دود اور محبت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
دودن کی مسرت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

جب جام دیا تھا ساقی نے جب دُور جلاتا تھا محفل میں
اک ہوش کی ماعت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب وقت کے نازک ہونٹوں پر مجروح ترنم رقصاں ہے
بیدار مٹیٹ کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

احساس کے میخانے میں کہاں اب فکر و نظر کی قدیں
آلام کی شدت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کچھ حال کے اندھے مانتی تھے کچھ ماضی کے قیام سخن
اجباب کی چاہت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کانٹوں سے بھرا ہے دامن دل شبنم سے سلگتی ہیں پلکیں
پھولوں کی سخاوت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب اپنی حقیقت بھی ساغر، بے ربط کہانی لگتی ہے
دنیا کی حقیقت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
ساغر صدیقی

اصول پسند

بیگم سلیم بڑی اصول پسند خاتون تھیں۔ انہوں نے
یہ اصول بتا رکھا تھا کہ کھانے کی میز پر جو بھی دیر سے
آئے گا وہ کھانے کے دوران ایک لفظ بھی بولنے کا مجاز
نہ ہوگا۔ ان کے بڑے بیٹے نسیم کی علوت تھی کہ عموماً
لیٹ ہو ہی جاتا۔ ایک دن کھانا چن دیا گیا اور نسیم نہ
پہنچا۔ کھانا شروع ہو گیا اور وہ غائب۔ جب وہ لوگ
تھوڑا بہت کھا چکے تو حضرت پہنچے۔ آتے ہی اس نے
کہا۔

”امی جان۔۔۔!“
لیکن بیگم سلیم نے تیکھی نظروں سے اس کی
طرف دیکھا۔ اس پر بھی نسیم نے ہمت کر کے کہا۔ ”وہ
بات یہ ہے امی جان!“

”ایک لفظ اور نہیں۔“ بیگم سلیم نے جواب دیا اور
نسیم خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ جب میز پر سے برتن
اٹھائے جا چکے تو انہوں نے کہا۔

”ہاں بولو! کیا بات تھی؟“
”امی جی! آپ کی نئی ساڑھی کے ساتھ وہ آپ کا
چیمٹا کتابا ہر کھیل رہا تھا۔“

یعنی اسلم بھرت کالونی

جواب

جامع مسجد فتح آباد کی مجلس انتظامیہ کے ارکان
بڑے تنگ دل اور تنگ نظر معززین تھے۔ جب علاقہ
کے مشہور غنڈے جیدے خان نے اپنے کردار میں
تبدیلی پیدا کی تو اسے دین کی خدمت کا شوق چرایا۔ اس

نے امام مسجد کے پاس جا کر مجلس انتظامیہ میں داخل
ہونے کی درخواست کی۔ امام صاحب نے اسے یہ کہہ
کر ٹال دیا کہ وہ مجلس کے دوسرے ارکان سے بات
کر کے بتائیں گے۔

اگلی میٹنگ میں انہوں نے جیدے خان کی تمنا کا
اظہار کیا تو سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور متفقہ
طور پر کیا۔

”خدا کے لیے! اسے مسجد میں گھسنے نہ دینا۔ ورنہ وہ
خانہ خدا میں بھی خرابیاں کرے گا۔“

اگلے روز پیش امام صاحب نے جیدے خان سے
کہا۔ ”میاں! میں نے تمہارا میس مجلس کے سامنے
پیش کر دیا تھا لیکن ہر ایک نے کہا کہ یہ خدا کا معاملہ ہے
اور اسی سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ تم خدا سے پوچھ لو،
اگر وہ اجازت نامہ جاری کر دیں تو ٹھیک ہے۔“

جیدے خان مایوس ہو گیا۔
ہفتہ عشرے بعد پیش امام صاحب کی سربراہ جیدے
خان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔

”کو میاں! تم نے اجازت نامہ حاصل کیا یا
نہیں؟“

جیدے خان نے آہ بھر کر کہا۔ ”پوچھا تھا مولوی
صاحب! لیکن اللہ میاں کہنے لگے۔ ہوش کرو جیدے
خان! جب سے یہ مسجد بنی ہے، انہوں نے مجھے اس
میں گھسنے نہیں دیا، تمہیں کہاں اجازت دیں گے۔“

فریال صلاح الدین۔ میٹروول سائٹ
آفر

پاگل خانے کے بڑے گیٹ پر ایک پاگل پانی کی بانٹی اور برش لے کر گیٹ پر پینٹ کر رہا تھا۔ ایک نوجوان ادھر سے گزرا اور پاگل کی یہ حرکت دیکھ کر مسکرانے لگا۔ پاگل نے برش روک کر کہا۔

”بہتے کیوں ہو میاں! دشمنوں نے مجھے پاگل بنا کر یہاں ڈال دیا ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ پانی ہے وارنش نہیں۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وقت تو گزارنا ہی پڑتا ہے۔ سو میں یہ کام کر رہا ہوں۔ دراصل جب میں یہاں سے رہا ہوں گا تو سامنے پہاڑی پر اس درخت کے نیچے سے خزانہ نکالوں گا جس کا سوائے میرے کسی کو علم نہیں ہے، پھر ساری زندگی مزے سے گزاروں گا اور سکھ کی بنی بجائوں گا۔“

نوجوان اس کی یہ بات سن کر چلا گیا۔ اگلے دن جب وہ دوبارہ پاگل خانے کے پاس سے گزرا تو وہ پاگل پھر پانی سے دروازہ پینٹ کر رہا تھا۔ نوجوان نے رک کر کہا۔

”کو بھائی! پھر وقت گزار رہے ہو؟“

”اور کیا۔“ پاگل نے سر اٹھا کر کہا۔ ”وقت جو ٹھہرا۔“

نوجوان نے آہستہ سے کہا۔ ”کل آپ نے کون سا درخت بتایا تھا؟“

پاگل ہنس کر بولا۔ ”شاباش! جلدی سے تم بھی پانی کی بانٹی اور برش لے کر میرے ساتھ کام میں شریک ہو جاؤ۔“

مدیحہ احمد۔ گلشن اقبال

اشتہار

ایک اخبار میں اشتہار دیا گیا۔

”ایک خوش شکل کروڑ پتی اعلا تعلیم یافتہ نوجوان کے لیے رشتہ درکار ہے۔ ذات پات اور جہیز کی کوئی پابندی نہیں، مگر لڑکی کا فلم کی ہیروئن سے مشابہت رکھنا ضروری ہے۔“

اشتہار میں جس فلم کی ہیروئن کا حوالہ دیا گیا تھا وہ

فلم ان دنوں مقامی سینما ہال میں پہلے ہفتے میں ہی دم توڑ رہی تھی مگر اشتہار شائع ہونے کے بعد وہ فلم شہر میں پورے بارہ ہفتے چلی۔

رخسار ظفر۔ لاہور

متفق

میاں بیوی میں کسی مسئلہ پر اختلاف رائے ہونے پر گرما گرم مباحثے کا آغاز ہو گیا۔ جب بات ختم ہونے کے بجائے بحث کے نئے نئے پہلوؤں پر بہت زیادہ جگرتی نظر آنے لگی تو جھگڑا ختم کرنے کے لیے خاوند نے کہا۔

”چلو ڈارنگ! مٹی ڈالو اس بات پر۔“ خاوند کے لہجہ سے مصالحت کا اظہار ہوتا تھا۔ ”ویسے پوری بات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمہارا خیال ٹھیک ہے۔“

”مگر تمہارے اتفاق رائے کرنے کا کیا فائدہ؟“ بیوی نے جوش میں غصہ سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

”جبکہ میں نے اپنا وہ خیال ہی بدل دیا ہے۔“

کول عدنان۔ گلستان جوہر

کار کردگی

پولیس نے جعلی نوٹ بنانے والے شخص کو پکڑا تو دوسرے شہر میں موجود ان کے سربراہ نے حکم دیا کہ جعلی نوٹ انہیں بھجوا دیے جائیں۔ دو دن بعد سربراہ نے ماتحت عملے کو فون کر کے پوچھا۔

”جعلی نوٹ اب تک نہیں ملے۔“

”جناب! وہ تو ہم نے منی آرڈر کے ذریعے بھجوا دیے تھے۔“ جواب دیا گیا۔

نمرہ رزاق۔ ڈیفنس

خیال کی تبدیلی

بیوی نے شوہر سے شکایت کیا۔ ”دیکھیے! میں نے

کس قدر پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی مہمان آجائے تو یقیناً یہی سمجھے گا کہ میں اس گھر کی باورچہن ہوں۔“

شوہر نے مسکرا کر کہا۔ ”نہیں پیاری! جب مہمان تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے کھائے گا تو فوراً اپنے خیال کو تبدیل کرے گا۔“

فاطمہ احسن۔ ڈیفنس

انکشاف

”مجھ پر چوہے کی آواز کا راز ظاہر ہو گیا ہے۔“ بیٹے میں شرابور خاتون نے کارمیک سے کہا جو خاتون کی شکایت پر ڈھائی گھنٹے سے کار کے انجن میں چوہا تلاش کر رہا تھا۔

”دراصل چوں چوں کی آواز میرے جوتوں سے نکل رہی تھی۔“ خاتون نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

ثوبیہ کاشف۔ باغبان پورہ

شکر گزار

ایک صحافی خاتون منگائی پر دل ہلا دینے والا مضمون لکھنا چاہ رہی تھیں۔ کئی مرتبہ مضمون لکھا مگر بات نہیں بنی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ مضمون لکھنے سے پہلے غرت میں پسے ہوئے مفلوک الحال لوگوں سے گفت و شنید کریں تو مضمون تاثر انگیز جائے گا۔

وہ مشاہدہ کی غرض سے غریبوں کی بستی میں پہنچیں۔ وہاں ایک بھکاری مل گیا۔ اس سے پوچھا۔

”باباجی! آنا منگا ہو گیا ہے اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”اچھا۔!“ بھکاری حیرانی سے اس طرح اچھلا جیسے اسے پچھونے ڈنک مار دیا ہو۔ ”آنا منگا ہو گیا اور مجھے پتا ہی نہیں۔ بڑی مہربانی بی بی! جی کہ آپ نے مجھے پتا دیا۔ دکان دار تو مجھ سے اب تک پرانے بھاؤ پر ہی آنا خرید رہا ہے۔“

سمیرا علی۔ لاہور

اصل رشتہ

ایک غریب خاندان کا لڑکا پڑھ لکھ کر بہت بڑا افسر

بن گیا تو اس کے مزاج ساتویں آسمان پر پہنچ گئے۔ وہ ہر وقت امیروں جیسے رنگ ڈھنگ اختیار کیے رکھتا اور اپنی اوقات بالکل ہی بھول گیا۔ غریب لوگوں سے ملنا جلنا تو رکنا، ان سے بات چیت کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ اس کا باپ دفتر میں اس سے ملنے گیا تو اس نے اپنے ساتھی سے باپ کا تعارف کچھ اس طرح سے کروایا۔ ”یہ میرے بچپن کے دوست کا باپ ہے اور کام کے سلسلے میں میرے پاس آیا ہے۔“

باپ نے بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو حیران رہ گیا اور اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے آؤدہ کھانہ تو بیٹے کو تین چار پھپر رسید کر دیے اور اس کے ساتھی سے کہنے لگا۔ ”میں اس کے دوست کا باپ نہیں بلکہ میں اس کی ماں کا دوست ہوں۔“

غزالہ شہباز۔ کراچی

حکمت عملی

اختر صاحب کو اپنے پڑوسی سے اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے کی عادت تھی۔ ایک روز وہ پڑوسی کے پاس پہنچے اور بولے۔ ”کیا آج آپ اپنی گاڑی میں کہیں جائیں گے؟“

پڑوسی نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں! گاڑی آج میرے استعمال میں رہے گی۔ آج مجھے

کئی جگہوں پر جانا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا،“ مجھے اصل میں آپ کی موٹر سائیکل کی ضرورت تھی۔“ اختر صاحب نے اطمینان سے کہا۔

غزل۔ کوئٹہ

سر اپنا احتجاج

ایک بونگ طیارے نے سمندر پر پرواز کے دوران ابھی نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کیپٹن نے اعلان کیا۔ ”خواتین و حضرات توجہ فرمائیے! طیارے کا ایک انجن خراب ہو گیا ہے، تاہم باقی تین انجن

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
”اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ نفرت
شخص وہ ہے جو سخت جھگڑالو ہو۔“
(بخاری - 78-15)

اللہ تعالیٰ کی قربت

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا۔
”جب اللہ کے تیر مرع، موت، حادثہ و غم کی صورت
میں چار سو مل رہے ہوں تو ہم کیسے بچیں؟“
آپ علیہ السلام نے فرمایا۔
”تیر انداز کے پہلو میں آ جاؤ۔“
شیخ سعدی نے کہا ہے۔ اگرچہ تیر کمان سے گزرتا
ہے لیکن دانش مند کو کمان کے پیچھے ایک کمان والا
بھی نظر آتا ہے۔
چنگیز و ہلاکو خان وغیرہ محض کمان تھے جن سے لاکھوں
تیر نکل کر دنیا نے انسانی تک پہنچے۔ کمان والا کوئی اور
تھا اور تیر اسی کے چلائے ہوئے تھے۔

غلام کی عقل

لقمان حکیم سے کون واقف نہیں۔ وہ بنی اسرائیل
کے ایک شخص کے غلام تھے۔ اس شخص نے انہیں تین
مستقل میں خریدا تھا۔ وہ اپنے آقا کی خدمت میں ہر وقت
لگے رہتے تھے۔ ان کا آقا ہر سر کھلتا تھا۔ وہ اس کھیل
میں شریک بھی لگایا کرتا تھا۔
اس کے گھر کے دروازے کے قریب ایک نہر بہتی
تھی۔ اس نے ایک دن اس شرط پر جو سر کھیل کہ جو ہار
جائے گا نہر کا سارا پانی اسے پینا پڑے گا۔ ہارنے والا ایسا

نجات

فقیر نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی تو اندر
سے ایک لمبے ترنگے کرخت صورت سے صاحب باہر
نکلے۔ فقیر نے عاجزی سے کہا۔
”حضور! کیا آپ ایک پریشان حال اور دکھی آدمی کو
اس کی پریشانیوں سے نجات دلانا پسند کریں گے۔“
”ضرور۔ ضرور۔“ ان صاحب نے قمیص کے
نیچے ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم پستول کی گولی کھا کر
نجات حاصل کرنا پسند کرو گے یا چاقو کے ذریعے؟“
شہلا اظہر دھاڑی

اندیشہ

ایک صاحب جھومتے جھاتے نائٹ کلب سے
نکلنے لگے تو دربان ان کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض
سے لپکا ہنگامہ کسی چیز میں الجھ کر گر پڑا۔
کلب کے میجر نے باہر آ کر اسے ڈانٹا۔ ”ذرا احتیاط
سے چلا کرو۔ تمہارے اس طرح گرنے سے کوئی سمجھے
گا کہ تم دربان نہیں، کلب کے ممبر ہو۔“
زیب نجم لندن

مرغا

باپ (حیرانی سے) ”مرغان! تم مرغا کیوں بنے ہوئے
ہو بیٹا؟“
”ابا جان! آپ ہی نے تو کہا تھا۔ جو کام اسکول میں
کرایا جائے اسے گھر آ کر دہرایا کرو۔“
الوینہ۔ راولپنڈی



ہمیں یہ حفاظت ہماری منزل پر اتار دیں گے۔ البتہ
آدھے گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔“
ایک گھنٹے بعد کیپٹن کی پھر آواز آئی۔ ”توجہ فرمائیے!
ہمیں افسوس ہے کہ طیارے کا دوسرا انجن بھی
خراب ہو گیا ہے، ناہم باقی دو انجنوں پر ہم اپنا سفر جاری
رکھ سکتے ہیں البتہ ہمیں دو گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔“
تھوڑی دیر اور گزری تھی کہ کیپٹن نے پھر اعلان
کیا۔ ”خواتین و حضرات! ہم انتہائی دکھ کے ساتھ
اعلان کرتے ہیں کہ جہاز کا تیسرا انجن بھی خراب ہو گیا
ہے، لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم یہ حفاظت
اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے، لیکن اب ہمیں تین
گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔“

بار بار کے اعلان سے بھٹایا ہوا ایک مسافر بڑے
غصے سے بولا۔ ”کچھ تو خدا کا خوف کرو، شرم کرو۔ اگر
جو تھا انجن بھی خراب ہو گیا تو ہم کیا ساری رات پرواز
کرتے رہیں گے؟“

شمین طارق۔ لاہور

میڈل

ایک گلوکار ہر وقت اپنے ساتھ دو میڈل لیے گھوما
کرتے تھے۔ ایک میڈل چھوٹا تھا اور ایک بڑا۔ ایک
مرتبہ ان کے ایک دوست نے خیال ظاہر کیا ”شاید
آپ کو چھوٹا میڈل کسی ہلکے پھلکے گانے پر ملے اور بڑا
میڈل کوئی کلاسیکل مقابلہ جیتنے پر ملا ہو گا؟“

”نہیں! یہ بات نہیں ہے۔“ گلوکار نے نفی میں سر
ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ایک مرتبہ گلوکاری کا مقابلہ منعقد
ہوا تھا۔ چھوٹا میڈل مجھے اس میں بہترین گانا گانے پر ملا
تھا۔“

”اور بڑا میڈل؟“ دوست نے پوچھا۔
”بڑا میڈل مجھے وہی گانا بند کرنے پر ملا تھا۔“ گلوکار
نے بتایا۔

ثریہ یار شید۔ بلدیہ ٹاؤن

”کیا صل ہے تمہارے پاس؟“ آقا نے چونک کر پوچھا۔

اس پر لقمان نے فرمایا۔
”جب وہ آپ کے پاس آکر نہر کا پانی پینے کے لیے کہے تو آپ اس سے پوچھیں گا دونوں کناروں کے درمیان کا پانی پیوں یا نہر کی لمبائی کا؟ اس پر وہ آپ سے یقیناً یہ کہے گا کہ دونوں کناروں کے درمیان کا۔ تب آپ اس سے کہیں میں پینے کے لیے تیار ہوں لیکن تم لمبائی میں پانی کو پینے سے اس وقت تک روکے رکھو جب تک کہ میں دونوں کناروں کے درمیان کا پانی نہ پی لوں آقا یہ کام اس کی طاقت سے باہر ہوگا۔“

آقا لقمان حکیم کی بات سن کر بہت خوش ہوا۔ صبح کے وقت جیسے والا شخص آیا اور کہنے لگا۔
”میری شرط پوری کرو۔“
لقمان کے آقا نے کہا۔ ”بتاؤ دونوں کناروں کے درمیان کا پانی پیوں یا لمبائی کا؟“

اس نے کہا۔ ”دونوں کناروں کے درمیان کا۔“
آقا نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم لمبائی میں پانی کو پینے سے روکو میں پانی پی لیتا ہوں۔“

”یہ تو ناممکن ہے“ اس نے جیتر سے کہا اور یوں لقمان کے آقا کی جان چھوٹ گئی۔ وہ اپنے غلام سے بہت خوش ہوا چنانچہ اس سے انہیں آزاد کر دیا۔
تمثیلہ اصغر۔ بکرات

فطری دانش،

مسلمانوں نے مدائن فتح کیا تو اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے آتش کدہ نو بہار سر د کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا۔ رہایت تھی کہ یہ آتش کدہ زرتشت کے زلمنے سے مسلسل فروزاں چلا آ رہا ہے۔ فوجی دستے نے آتش کدے کے مرکزی دروازے پر زرتشت کا یہ قول دیکھا۔

”بادشاہ کے دربار میں اسی شخص کو ماضی دینا چاہیے جس کے پاس علم، حوصلہ اور دولت ہو۔“
فوجی دستہ میں ایک بدو بھی تھا۔ اس نے زرتشت

کے قول کے نیچے کوٹھ سے یہ نکل دیا۔
”جس کے پاس ان تینوں میں ایک وصف بھی ہو اسے بادشاہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟“
نمرہ، اقرار۔ کراچی

غلام،

بادشاہ نے فقیر سے کہا۔
”مجھ سے کچھ مانگ۔“
فقیر نے جواب دیا۔ ”میں اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں؟“
بادشاہ نے کہا۔ ”کیا مطلب؟“
فقیر نے کہا۔ ”میرے دو غلام ہیں۔ لالچ اور امید۔ تو ان کا غلام ہے۔“
حادثہ، تحریم۔ گوجرہ

بیمار دلوں کا علاج،

عبداللہ انطاکی نے فرمایا ہے۔ ”پانچ چیزیں ایسی ہیں جو دل کی تمام بیماریوں کے لیے بمنزلہ دوا کے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

- 1۔ نیک لوگوں کی ہم نشینی۔
- 2۔ قرآن کا پڑھنا۔
- 3۔ پیٹ کا خالی رکھنا۔
- 4۔ نماز تہجد کی ادائیگی۔
- 5۔ نالہ نہ کرنا۔

نماز میں اہتمام،

حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں نے بچپن میں ایک عابدہ عورت کو دیکھا کہ پچھو نے اس کو نماز میں چالیس جگہ کاٹا اور اس میں کچھ بھی تغیر ظاہر نہ ہوا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔
”اے اماں جان! تو نے اس پچھو کو کیوں نہیں ہٹایا؟“
اس نے جواب دیا۔

”رک کے تو ابھی بچہ ہے، یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے کام میں اپنا کام کرتی؟“
مہوش دوگرہ۔ گوجرانوالہ

سنہرے موتی،

چیزوں کی محبت دلوں میں مستقل بس جائے تو اندھی دیواروں جیسی ہو جاتی ہے۔ باقی عمران سے رہائی نہیں ملتی۔

ہم اکثر اتنے اچھے نہیں ہوتے جتنا وہ محبت ہمیں اچھا کر دیتی ہے جو ہمارے دلوں میں اپنے پیاروں کے لیے ہوتی ہے۔

محبت چہروں سے نہیں، دلوں سے اور دلوں سے کی جاتی ہے۔ چہرے روپ بدل سکتے ہیں مگر روح روپ نہیں بدلتی۔

غلط فہمی اگر دل میں زیادہ دیر رہے تو بدگمانی کو جنم دیتی ہے اور بدگمانی فاصلوں کا باعث بنتی ہے۔

ایمان یہ نہیں کہ اللہ دیتا ہے بلکہ ایمان یہ ہے کہ اللہ یقیناً دے گا۔

آسیمہ طارق۔ منڈی بہاؤالدین

جان لیجیے،

اپنے آپ سے مت لڑیے۔ ٹوٹ جائیں گے۔
اپنے اندر دوگ مت پالیے، اس دنیا میں آپ ایک ہی تو ہیں۔

اگر کوئی آپ کو یاد نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں، اصل چیز یہ ہے کہ وہ آپ کو فراموش نہ کرے۔
جب آپ کے کسی بھی عمل سے دوسروں کی آنکھوں کے جگنو بھر جائیں اور ان آنکھوں میں خوشیوں کے بجائے دیرانیوں کا بسیرا ہو جائے تو جان لیجیے کہ اس کی ویران اور بے نور آنکھوں سے آپ کے دل کی ویرانی کا راستہ شروع ہوتا ہے۔

ہر چھوڑ کر جانے والا شخص بے وفا نہیں ہوتا اور اسی طرح ہر ساتھ رہنے والا آپ کا اپنا نہیں ہوتا۔

ہر لفظ انمول،

اگر ہم زبان کی پھیلائی ہوئی مصیبتوں کا جائزہ

لیں تو معلوم ہوگا کہ خاموشی میں کتنی راحت ہے، زیادہ بولنے والا انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ سچ اور جھوٹ ملا کر بولے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ سوچ سکے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں۔

آنکھوں دیکھا جھوٹ نہیں ہوتا۔ مگر کبھی کبھار مفہوم وہ نہیں ہوتا، جو ہماری عقل سمجھتی ہے۔

ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کریں، کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں، بلکہ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔

اپنی چھوٹی چھوٹی فضول خرچیوں سے بچیں، کیونکہ ایک چھوٹا سا مورخ بہت بڑے جہاز کو ڈبوئے کی طاقت رکھتا ہے۔

مددیکہ، نداء فیصل آباد

* زندگی ایک ایسی ٹرین ہے، جو ہمیشہ ایسے اسٹیشن پر رکتی ہے۔ جہاں آپ اترنا نہیں چاہتے۔

* ہر عمل کے اندر اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔

* کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں نبھاتے ہوئے پل صراط سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔

نقصہ۔ کراچی

عمل،

لفظ کسی بھی تعلق یا رشتے میں بہت اہم ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی بڑے بڑے لفظ بھی بے جان اور کھوکھلے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اور ایک چھوٹا سا عمل بھی بہت جاندار اور مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

سعدیہ سلیم۔ کراچی





موم کے پیکوانے

خالہ جیلدنی

مسالے دار بیسنی روٹی

اجزا :

بیسن

آٹا

تیل

دہی

لہسن اور ک پیسٹ

سفید زیرہ

اجوائن

پیاز

ہر ادھنیا پودینہ

ہری مرچ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

دو کھانے کے چمچے

آدھا پاؤ

ایک چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

ایک چٹنی

ایک عدد

آدھی گٹھی

چار عدد

پسی سرخ مرچ

آدھا چائے کا چمچ

ترکیب :

پیاز، ہر ادھنیا پودینہ اور ہری مرچ پسی کر تیل دہی اور بقیہ تمام اجزاء کے ساتھ بیسن اور آٹا میں ملا کر گوندھ لیں۔ پیڑے بنا کر روٹی بیلین اور گرم توے پر ڈالیں۔ ایک سائڈ پک جائے تو صاف کپڑے سے سینکھیں پھر پلٹ کر دوسری سائڈ بھی اسی طرح دبا کر سینکھیں پھر ہلکا ہلکا دھکی دو توں اطراف میں لگائیں۔ اچار چٹنی اور رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

اسپیگیٹھی پین پزا

اجزا :

اسپیگیٹھی

انڈے

مکھن

لہسن پیسٹ

میدہ

پسی کالی مرچ

نمک

ترکیب :

اسپیگیٹھی ابال کر چھان لیں۔ انڈے پھینٹ کر اس میں نمک، کالی مرچ، لہسن پیسٹ، میدہ اور اسپیگیٹھی کس کر دیں۔ فرانک پانی میں مکھن پگھلا کر اسپیگیٹھی کا آمیزہ ڈال کر پھیلا میں اور ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پانچ منٹ پکائیں۔ سیٹ ہو جائے تو بڑی پلیٹ میں نکال کر ساس کے ساتھ پیش کریں۔

شیرہ لدو

اجزا :

دودھ

کنڈینسڈ ملک

گھی

سوچی

کشمش

بادام

الائیچی پاؤڈر

ترکیب :

گھی گرم کر کے سوچی براؤن کر لیں۔ دودھ میں کنڈینسڈ ملک ملا کر سوچی اور الائیچی پاؤڈر شامل کر دیں۔ چولہے پر چڑھا کر ہلکی آنچ پر اتنا پکائیں کہ دودھ مکمل طور پر خشک ہو جائے اور گھی سوچی سے الگ ہونے لگے۔ کشمش ڈال کر اچھی طرح کس کر دیں اور اتار کر لٹو بنالیں۔ کٹے ہوئے بادام چھڑک

ایک کپ

آدھا کپ

چار کھانے کے چمچے

چار کھانے کے چمچے

دو کھانے کے چمچے

ایک کھانے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

کر گرم اور ٹھنڈے دونوں صورتوں میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔

روپہلی سنہری بریانی

اجزا :

تیمہ

باسمتی چاول

پیاز

لہسن اور ک پیسٹ

ثابت اور ک

ہری مرچ

ہر ادھنیا پودینہ

دہی

کیوٹہ

بریانی مسالا

زردے کارنگ

چاندی کے ورق

نمک

تیل

ترکیب :

قمیے میں (چکن کا بھی لیا جاسکتا ہے) ایک پیاز، باریک کتڑی ہوئی اور ک، آدھا ہر ادھنیا، چار ہری مرچیں، دو کھانے کے چمچے بریانی مسالا اور نمک ملا کر پسی لیں اور چھوٹی چھوٹی بالتر بنا کر فرائی کر کے چاندی کے ورق میں پلیٹ کر رکھ دیں۔

دوسری پٹلی میں تیل گرم کر کے بقیہ دو پیاز سنہری کر کے نکال لیں اور پسی لیں۔ اب اسی تیل میں اور ک، لہسن کا پیسٹ اور بقیہ بریانی مسالا دہی میں اچھی طرح پھینٹ کر شامل کریں اور خوب بھون لیں پھر بالتر ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ چاولوں کو نمک ملا کر ابال لیں، یوں کہ ایک کئی رہ جائے الگ بڑی پٹلی میں بالتر مسالے کی تہ لگائیں۔ یودینہ اور ہری مرچ



تھوڑے سے گھی میں فرائی کر لیں۔ ایک چھوٹے برتن میں ملک چاکلیٹ کو کوبادور اور دو کھانے کے چمچے دودھ ڈال کر اسے ہوتے پانی پر رکھ دیں۔ گرمائش سے چاکلیٹ پکھل کر کس ہو جائے تو اتار لیں۔ ایک چوتھائی پیالی پانی میں چینی ملائیں اور پانچ منٹ تک پکا کر شیرہ بنالیں۔ فرائی کیے ہوئے سلائس دو سے تین منٹ کے لیے شیرے میں ڈبو کر نکال لیں۔ دودھ ابال کر اس میں چاکلیٹ والا آمیزہ ڈال دیں۔ کارن فلور کو علیحدہ سے دو کھانے کے چمچے ٹھنڈے دودھ میں گھول کر ابلے ہوئے دودھ میں ملا دیں۔ چمچے ہلاتے رہیں۔ گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو شیرے میں ڈبو کر رکھے ہوئے سلائس پر لگا دیں۔ چاکلیٹ شاہی ٹکڑے تیار ہیں۔

کتر کر ڈالیں اس کے اوپر چادروں کی تہ لگا دیں۔
زردے کارنگ ذرا سے دودھ میں گھول کر چھڑک دیں
اور کیوٹہ ڈال کر آدھا گھنٹہ ہلکی آگ پر دم لگائیں۔
مزے دار روپکلی سنہری بریانی تیار ہے۔
چاکلیٹ شاہی ٹکڑے

اجزا :
بڑی ڈبل روٹی
دودھ
چینی
کوبادور
ملک چاکلیٹ
کارن فلور
گھی
ترکیب :
چار سلائس
دو پیالی
آدھی پیالی
ایک چائے کا چمچ
پچاس گرام
دو کھانے کے چمچے
تلنے کے لیے

سلائس کے تھکون ٹکڑے کاٹ لیں اور ہلکی آگ پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>



مکمل کسب و کار میں دلچسپی

شمس طاہر برٹ لاہور —————
 اس سچ ہوا سے برسرِ پیکار ہم بھی تھے
 اپنے ہی گھر میں بے درو دیوار ہم بھی تھے
 دامنِ دریدہ تم ہی نہیں تھے فقط وہاں
 بے آبرو کھڑے سرِ باندار ہم بھی تھے

اقرا محمد اشرف حافظ آباد —————
 میں سمجھا سری گھٹن مٹانے آیا تھا
 وہ جھونکا تو دیا بجھانے آیا تھا

نورین ضیا سارو کی بگرات —————
 میں نے دل کی بات رکھی اور تو نے دنیا والوں کی
 میری عرصہ بھی مجھوری بھی ان کا حکم بھی مجھوری
 روک سکو تو پہلی بارش کی بوندوں کو تم روکو
 بچی مٹی تو پھسکے گی، ہے مٹی کی مجھوری

تانیہ عبدالغفور لیانی —————
 مچا ہے میری ذات کہ جو مجھ سے ملا وہ
 نزدیک تو آیا ہے، مگر کھو بھی گیا ہے

رشدہ جھنگ جوندہ —————
 تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
 تمہارے ستم اور میری وفا میں
 مگر پھر بھی اسے میرے معصوم قاتل
 تمہیں پیاد کرتی ہیں میری دعا میں

طاہر ملک پسرور —————
 چند خوابوں کے عطا کر کے اُجالے مجھ کو
 کر دیا دنیا نے وقت کے حوالے مجھ کو
 جن کو سورج میری چوکھٹ سے ملا کرتا تھا
 اب وہ خیرات میں دیتے ہیں اُجالے مجھ کو

نجمہ بخاری منظر گڑھ —————
 تشنگی دل میں ہو محبت کی
 لوگ دریا سے لوٹ جاتے ہیں
 ایک تصویر بنتی جاتی ہے
 ایک تصویر ہم بناتے ہیں

فائزہ، اقرا، آفرین جام پور —————
 کیوں اندھیرے نکل گئے اس کو
 شہر میرا تو روشنی کا تھا
 سایہ کس کا رفیق ہوتا ہے
 چاند کا تھا، نہ چاندنی کا تھا

شیبا گل کراچی —————
 عشق کی بازی تم جیتے یا ہار گئے
 تم ہی کہو، کیا پورا قصہ لکھا جائے
 قتل ہوئی ہے یوں تو کتنی بار انا
 کیسے اپنے آپ پہ نوحہ لکھا جائے

عمارہ منیر گوجرانوالہ —————
 اسے جنوں کہ صحران میں کشتیاں اتریں
 مجھے یہ شوق کہ پانی پہ گھر بناؤں گی
 کچھ اس طرح سے بنی ہوں اس کا آئینہ
 وہ مجھ سے کچھ نہ کہے گا، میں جان جاؤں گی

غزالہ جھنگ —————
 پھر اس کے بعد تو آنکھوں میں بس گیا وہ شخص
 اگرچہ ہم نے اسے بے دلی سے دیکھا تھا
 روحی باتو —————
 دستِ نادیدہ کی تحقیق ضروری ہے مگر
 پہلے جو آگ لگی ہے وہ بجھا دی جائے

بنت فیض ملتان —————
 تو کبھی دیکھنا ان کی جھپکوں کو محسن
 کتنا روتے ہیں اوروں کو ہنسانے والے

زوبارہ خالد لاہور —————
 عشق ہمارا ہے تو دل تمام کے کیوں بیٹھے ہو
 تم تو ہر بات پہ کہتے تھے، کوئی بات نہیں
 کوثر خالد فیصل آباد —————
 تیرے خیال میں کچھ ایسا کم رہا برسوں
 میں اپنے آپ سے بھی مل نہیں سکا برسوں
 کہیں وہ فالقہ تحلیل ہی نہ ہو جائے
 میں اس سے مل کے کسی سے نہیں ملا برسوں

سیمونہ منشا دہاڑی —————
 ہجر لازم ہے تو پھر وصل کا وعدہ کیسا
 یوں خزاں رت پہ بہاڑوں کا ببادہ کیسا
 زخم دے کر نہ تم درد کی شدت بوجھو
 درد تو درد ہے کم کیسا، زیادہ کیسا

انیلا ڈہری —————
 دلوں میں فرق پڑ جائے تو اتنا یاد رکھنا تم
 دلیلیں، منتیں اور فلسفے بیکار جاتے ہیں

مقدس ظہور فیصل آباد —————
 ثابت ہوا کہ مجھ سے محبت نہیں رہی
 وہ شخص میرے پاس سے ہو کر گزر گیا

مقدس رباب چکوال —————
 تعمیر کر رہا ہے محبت کا وہ حصار
 میرے لیے غلوں کی زنجیر ہے بہت
 بیٹھا رہا وہ پاس تو میں سو جتی رہی
 خاموشیوں کی اپنی بھی تاثیر ہے بہت

تمثیلہ اصغر بگرات —————
 جب اپنے اپنے حال پہ ہم تم نہ رہ سکے
 تو کیا ہوا جو ہم سے زمانہ بدل گیا

فریحہ شبیر شاہ نکلدر —————
 اپنی تو زندگی کی عجب کہانی ہے
 جس چیز کو چاہا وہ ہی بے گانی ہے
 ہنستے ہیں دنیا کو ہنسانے کے لیے ورنہ
 دنیا دُوب جائے ان آنکھوں میں اتنا پانی ہے

صفیہ، صبا عثمان والا —————
 تو نے نفرت سے جو دیکھا تو مجھے یاد آیا
 کیسے رشتے تیری خاطر لوہی توڑ آیا ہوں
 کتنے دھندلے ہیں یہ چہرے جہنمیں اپنا لیے
 کتنی اجلی تھیں وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آیا ہوں

مہر، ملائکہ گل اورنگی ٹاؤن کراچی —————
 پاس آ ہی گیا ترک تعلق اُسے آخر
 آنکھوں میں وہ پہلی سی ندامت نہیں رکھتا
 نوشین اقبال نوشی محاوں بدرمجان —————
 پچھڑنا ہے تو الفاظِ موت ڈھونڈو
 ہمارے واسطے لہجہ ہی بہت ہے

منرہ، اقرا کراچی —————
 حوصلے بھی جواب دینے لگے
 اس قدم اس نے آڑ مایا مجھے

نجمہ اور کراچی —————
 شام کا تارا دیکھتے ہی جب جنگل روکنے لگتے ہیں
 پنچھی ہم کو چابی والے سبز کھلونے لگتے ہیں
 کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے موجوں کا سر جھک جاتا ہے
 اور کشتی کو کشتی والے آپ ڈبوئے لگتے ہیں

فاطمہ کبر والا —————
 بے حسی کی دنیا سے دو سوال میرے تھے
 کب تک جیا جائے اور کیوں جیا جائے

خنا کنول حویلی لکھا —————
 اس کے روتے سے مجھ کو بس یہ معلوم ہوا ساغر
 اسے دشوار لگتا ہے اب مجھ سے تعلق رکھنا

نوال افضل گھمن بگرات —————
 درد بیٹھا ہو تو رک رک کے کسک ہوتی ہے
 یاد گہری ہو تو تھم تھم کر قرار آتا ہے

زہیرہ جھنگ —————
 کئے وقت چاہے غلاب میں، کسی خواب میں یا سراب میں
 جو نظر سے گزر گیا، اسے یاد کرتا ہے ہر کوئی



شاعری سچ بولتا ہے امیر خالد

سکھنے کوئی کاش تجھ سے حسن گفتار
ہر بات کا ایک خوبصورت اظہار
یہ رنگ ادب کا، یہ روایت کا جاؤ
جملوں میں سلیقے سے پروئے اشعار
شاعری جذبات و احساسات کو خوبصورت
الفاظ میں پیش کرنے کا نام ہے۔ شاعری اگر دلوں کی
ترجمانی ہے تو دوسری جانب محض ایک تصوراتی تخیل
اور اختراع بھی ہے۔
نہیں صبح کو کیسی لگی میری خواہشوں کے دیار کی
جو بھلی لگی تو نہیں رہو، اسے چاہتوں سے نکھار دو
وہاں کون کھر میں ہے منتظر جسے غم ہو دیر سویر کا
یہ مختصر سی رات ہے، اسے چاندنی میں گزار دو

شاعری کے میدان میں دل بدن وسعت اور بے
آرہی ہے جو کافی خوش آئند بات ہے۔ ذاتی طور پر مجھے
سید وحی شاہ، احمد فراز، ابن انشا کا کلام زیادہ متاثر
کرتا ہے مگر اس کے علاوہ بھی بہت سے شعراء ہیں
جن کے کلام سے لطف اندوز ہوتی ہوں مگر سب سے
زیادہ مجھے سید وحی شاہ کی شاعری متاثر کرتی ہے۔
ان کے کلام میں جو برجستگی اور تازگی ہوتی ہے وہ
کسی اور کے کلام میں مجھے محسوس نہیں ہوتی۔ ان کا مجموعہ
کلام ”آکھیں بھنگ جاتی ہیں“ میں موجود یہ غزل مجھے
بہت پسند ہے۔ شاید آپ کو بھی پسند آئے۔
سے دیوار پر لڑیہ ہے تو در کا نپ رہا ہے
پھر ہے ہو تو آجرا ہوا گھر کا نپ رہا ہے

تم آنکھ کی پستلی میں چھپے سچ کو بھی تو دیکھو
بجرم تو نہیں ہے وہ اگر کا نپ رہا ہے

دیران ہے اس درجہ تیرے بعد میرا دل
اس شہر میں آتے ہوئے در کا نپ رہا ہے

احمد فراز کی نظمیں بہت خوبصورت احساسات کی
مامل ہوتی ہیں۔ ان کی غزلوں کی نسبت نظمیں زیادہ
متاثر کن ہیں جیسے کہ ان کی یہ نظم ”کینز“۔

حضور آپ اور نصف شب میرے مکان پر
حضور کی تمام تر بلا میں میری جان پر

حضور خیریت تو ہے حضور کیوں خاموش ہیں
حضور لو لکے کہ دوسرے وہاں ہوش ہیں

حضور منہ سے بیک بہ رہی ہے صاف کیجیے
حضور آپ تو لٹے میں ہیں، معافی کیجیے

حضور کیا کہا میں آپ کو بہت عزیز ہوں
حضور کا کر مہ ہے ورنہ میں بھی کوئی چیز ہوں

حضور چھوڑیے ہمیں ہزار اور درگ ہیں
حضور جانیے کہ ہم بہت عزیز لوگ ہیں

ابن انشا، فیض احمد فیض، امجد اسلام امجد، پروین شاکر
اور نوشی گیلانی کو تو آپ لوگ پڑھتے ہی رہتے ہیں
مگر میں آج ایک نئے شاعر اسعد کی غزل آپ کے ذوق
تک منتقل کروں گی جو یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔

ان کو جب نے نقاب دیکھیں گے
اک مہکتا گلاب دیکھیں گے

ان کا چہرہ کتاب جیسا ہے
پڑھ کر ہم یہ کتاب دیکھیں گے

رو برو میرے چاند ہے اب کے
آج ہم بے حساب دیکھیں گے

سایہ اس وقت ڈھل چکر ہو گا
مگر کہ جب بھی جناب دیکھیں گے

چل کے اسعد آج تم دستک دو
کیا ہے ملتا جواب دیکھیں گے

ادب اختتام کی جانب گامزن ہونے سے قبل
اپنا مختصر سا تعارف۔

میرا نام امیر خالد ہے۔ پہلے امیر وحید خان ہوا کرتی
تھی مگر چند سال قبل مسز امیر خالد کے نام میں ڈھل گئی
ادب ایک عدد انتہائی شرمناک و بے یار سے بیٹھے
کی تمنا بھی ہوں۔ اور میرے بیٹے کا نام ”الینز“ ہے۔
شعر و شاعری سے شغف شادی سے قبل بھی تھا اور
اب بھی یہ جذبہ دل میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس
کے علاوہ میری ایک اور سرفہرست بابی مختلف میگزینز
میں اپنی تحاریر ارسال کرنا بھی ہے۔

اس مفرد سے سلسلے کی ہمیشہ سے روایت رہی
ہے کہ اختتامی پیرا گراف میں عموماً نہیں اپنا کہا ہوا
کلام تحریر کرتی ہیں مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ میں اپنا
تو نہیں مگر اپنی عزیز از جان سسر نازش و حید خان کی
ایک چھوٹی سی کاوش آپ سب بہنوں کی نذر کروں گی۔
نازش کا ملکہ احباب بہت وسیع ہے اور اس کی اب
تک کی تمام شاعری اپنے ملکہ احباب میں بے انتہا
مقبول ہے اور وہی جناب میری بات تو میں نے
زندگی میں پہلا اور آخری شعر کہا تھا جس پر میرا اتنا
ریکارڈ لگایا گیا کہ زندگی میں شاعری کی جانب پہلا
قدم اور وہ بھی اتنا غیر دعائی اور تب سے میں نے

کانون کو ہاتھ لگالیے کہ آئندہ شعر و غیرہ نہیں کہنا۔

وہ شعر کچھ یوں تھا۔ کبھی کفن کو بھاڑ کے
کبھی سائبان اباڑ کے، کبھی کفن کو بھاڑ کے
چل دیے وہ اطمینان سے کہہ بان بھاڑ کے
بس اب اتنا مسکرائیں نہیں ورنہ میں آپ سب
سے ناراض ہو جاؤں گی۔ ویسے ہی میں بہت مختصرانہ
مسکرائیں اپنے ننھے سے دل پر جمیل علی ہوں۔ خیال اب
میں اصل موضوع کی جانب آتی ہوں۔ یعنی کہ نازش کی
ذاتی غزل کی جانب۔ تو جناب اب دیر صاحبہ! آپ سے
گزارش ہے کہ وہ اپنی سنسر کی قیمتی چند منٹ کے لیے
کسی غیر محفوظ مقام پر رکھ کر قبول جائیں اور تقویٰ سی
حوصلہ افزائی کر دیں۔

کیا ہوا اگر کمر ملال و بے بس ہے بہت وہ
میں بھی تو یہاں بے قرار بہت ہوں

جو پوچھ لیں کبھی وہ میرا حال دوستو
کہہ دینا دعا سے تیری میں بیمار بہت ہوں

نہ آنا ملنے تم کہ تمہیں زحمت ہوگی بے وجہ
مصروف کام میں اس اتوار بہت ہوں

قارئین بہنوں سے التماس ہے کہ وہ اپنے تبصروں
میں میرے انتخاب کے بارے میں بھی ضرور رائے دیں
کہ میرے منتخب کردہ اشعار اور غزلیں وغیرہ آپ کے
دلوں تک رسائی پا سکے ہیں یا نہیں۔





جن بے ایمان نکلا

ایک وقت تھا کہ اکثر کرکٹ کرکٹ دیکھنے والی خواتین کے ساتھ ساتھ بیشتر اداکاروں کے دلوں کی دھڑکن بھی ہوا کرتے تھے۔ خاص طور پر بھارتی اداکاروں کو کھیل سے زیادہ پاکستانی کرکٹرز ہی بھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ٹیم کوئی میچ یا سیریز کھیلنے جب جب بھارت گئی ہمارے کرکٹرز کے لگائے ہوئے چھکے وہاں کے فلمی اسٹوڈیوز کی باؤنڈریز ہی میں جا کر گرے۔ سوا اکثر کرکٹرز کے نام اداکاروں کے ساتھ جوڑے گئے۔ مثلاً ”زینت اور عمران خان“ رینارائے اور محسن حسن خان، دیا مرزا اور شعیب اختر، شمیمتہ سین اور سیم اکرم وغیرہ وغیرہ۔

مگر جناب! یہ تو ماضی کی بات تھی۔ اب تو نیا دور ہے اور اس دور کے طور طریقے بھی اور ہیں۔ سوا اس دور میں بات کرکٹرز سے امیازوں تک جا پہنچی ہے۔

بھارت کی ایک ابھرتی ہوئی خیر ماڈل لینا کپور نے ممبئی کے ایک پولیس اسٹیشن میں پاکستانی امپائر اسد رووف کے خلاف تحریری درخواست جمع کرائی ہے کہ اسد رووف نے لینا کپور سے شادی کا وعدہ کیا مگر پھر مکر گئے۔ لینا نے مزید کہا کہ اسد رووف نے انہیں فلیٹ دلانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ (اچھا تو اصل دکھ یہ ہے) لینا کے مطابق انہیں پتا ہے کہ اسد رووف شادی شدہ ہیں اور انہوں نے کہا کہ اسد رووف نے بتایا تھا کہ ہمارا مذہب ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔ (اور یہ نہیں بتایا جاتا) کہ ہندوؤں سے شادی کی اجازت نہیں دیتا؟ لینا کپور نے ثبوت کے طور پر اسد رووف کے ساتھ اپنی تصویر بھی پیش کی ہے۔

اسد رووف نے لینا کے الزامات سننے تو انہوں نے دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا کر ”اوٹ“ کہا اور تحریری درخواست کو ”غوبل“ قرار دے دیا۔ اسد رووف کا کہنا ہے کہ لینا ان کے پاس ایک پرستار کی حیثیت سے آئی تھیں اور ان سے بھارتی پروگرام ”بگ باس“ میں شرکت کی خواہش ظاہر کی تھی۔ (اے بے! تو اس اوٹ پٹانگ پروگرام کے بگ باس آپ ہیں اسد جی؟) اسد رووف نے لینا کے ساتھ تصویر کھینچوانے کا اعتراف کیا ہے۔ (ایسی تصویر بنوائی تھی تو اب بھگتیں)

(اردو شاعری کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اس میں محبوب سب سے زیادہ ظالم اور ہرجائی کے روپ میں نظر آتا ہے۔) (خود رقیب رویا اور ظالم سماج سے بھی زیادہ) فلمیں دیکھیں تو وہاں بھی ”متاثرین محبت“ محبوب کے جوہر و جفا سستے ہی نظر آتے ہیں مگر کوئی

حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ بہت ہوا تو ایک گانا گالیا کہ۔

”دل لے کے مکر گیا ہائے! جن بے ایمان نکلا۔“
دنیا میں بھی اکثریت کا یہی دستور ہے کہ شادی کا وعدہ کیا اور پھر مکر گئے۔ مگر لینا سے پہلے کسی متاثرہ شخص نے باقاعدہ شکایت درج نہیں کرائی تھی۔ اگر یہ دستور چل رہا تو اخبارات میں اور شہر میں جابہ جا دیواروں پر مختلف تھانوں کے اشتہارات لکھے نظر آئیں گے۔ جس کی سرخی ہوگی:
”محبوب صرف چند گھنٹوں میں آپ کے قدموں میں۔“

مشکل

ان دنوں آپ ایک ڈراما سیریل دیکھ رہے ہوں گے جس میں کئی جوڑے نظر آ رہے ہیں جو حقیقی زندگی میں بھی آپس میں میاں بیوی ہی ہیں۔ اس سیریل میں جہاں اکثر فنکار نہایت جم کر کام کر رہے ہیں وہیں ایک فنکار ایسا بھی ہے جو اکثر کام کرتے ہوئے خود جم سا جاتا ہے۔ پھر اسے ڈانٹ ڈپٹ سننے کو ملتی ہے۔ وہ اداکار ہیں نخرامام۔

نخرامام اداکارہ شا کے شوہر ہیں۔ وہ ڈرامے میں بھی شا کے شوہر کا رول ہی کر رہے ہیں۔ حقیقی زندگی کا رول نبھانے پر نخر کو مشکل تو نہیں ہونی چاہیے مگر ہو رہی ہے۔ نخرامام نے اپنی مشکل کچھ یوں بیان کی ہے کہ ”میں ڈرامے میں شا کے شوہر کا رول کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میں شا کی آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر بات نہیں کر سکتا۔ اس سیریل میں زیادہ تر سین ایسے تھے جن میں مجھے شا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اداکاری کرنی تھی۔ جب میں ایسے سین کرنے لگتا تو مکالمے بھول جاتا۔ جس پر مجھے

ڈانٹ پڑتی تھی۔“ (کس سے پڑتی تھی نخر جی! ڈائریکٹر سے یا شا سے؟)



گویا باقی فنکار تو واقعی اپنی حقیقی زندگی کا کردار ہی نبھا رہے ہیں، تاہم نخرامام کا کردار حقیقی ہونے کے باوجود بھی حقیقی نہیں۔ اس لیے نخر مشکل میں ہیں۔ (لیکن اگر یہ رول نبھاتے ہوئے سیریل ختم ہونے تک نخر کو شا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی عادت ہو گئی تو پھر حقیقت میں نخرامام میں ہو جائیں گی۔)

جیوشان سے

معروف فلمی اداکار شان صرف نام ہی کے شان نہیں بلکہ ہماری فلموں کی واقعی شان سمجھے جاتے ہیں۔ شان نے انکشاف کیا ہے کہ بھارتی فلموں کے معروف ہیرو عامر خان نے شان کو اپنی مشہور زمانہ فلم ”بجی“ میں ولن کے کردار کی پیش کش کی تھی۔ تاہم شان نے یہ پیش کش ٹھکرا دی تھی۔ (عامر خان کی اس فلم سے زیادہ اس میں عامر خان کا ہیرو اناٹل مشہور ہوا تھا۔ عامر خان کو دیکھ کر پاک و ہند کے اکثر نوجوانوں بلکہ بچوں تک نے اپنے سروں میں کئی سڑکیں کھدوائی تھیں۔) شان نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ

”میں نے وہ رول اس لیے نہیں کیا کہ فلم میں ولن کو پاکستانی دکھانا تھا جو پاکستان کے خلاف کچھ کام بھی کرنا ہے۔ عامر خان مجھے کافی دنوں تک فون کرتے



رہے مگر میں راضی نہیں ہوں۔

شان نے مزید بتایا کہ

”میں نے عامر خان سے پوچھا کہ ”آپ پنجابی زبان جانتے ہیں؟“ جب عامر نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے انہیں پنجابی میں کہا کہ

”تسی اندیا دے پہلوان اوتے میں پاکستان دا پہلوان آں تے میں پیسے لے کے کشتی نہیں ہاراں گا۔“

(شان جی! اس کردار سے انکار کرنے کے لیے صرف یہ ہی وجہ کافی تھی کہ عامر خان آپ کو ”ولن“ کا کردار ادا کرنے کو کہہ رہے تھے جبکہ آپ ہماری فلموں کے ”ہیرو“ ہیں۔ تاہم آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ صرف فلموں کے ہی نہیں بلکہ واقعی ہیرو ہیں۔ آپ کو عامر خان سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ

”تسی اندیا دے ہیرو اوتے میں پاکستان دا ہیرو آں تے میں پیسے لے کے ولن دارول نہیں کراں گا۔“)

ضائع

پرانے وقتوں کی بات ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو نصیحتیں کرتے تھے۔
”بڑھو گے، لکھو گے، بنو گے نواب“

شاید اسی لیے اپنی شائستہ مزاج شائستہ واحدی کو پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں، پھر وہ بڑی تو نہیں ہوئیں، تاہم ڈاکٹر ضرور بن گئیں۔ لیکن انہوں نے ابھی طب کی تعلیم حاصل کی ہی تھی کہ وہ شوہر کو پیاری ہو گئیں اور ایسی پیاری ہوئیں کہ اب وہ شوہر چھوڑنا بھی چاہیں تو شوہر انہیں چھوڑنے پر تیار نہ ہو گا۔ شوہر کی دنیا میں اتنی والمانہ پذیرائی دیکھ کر اب شائستہ کو اپنے ان چھ سال کے ضائع ہونے کا افسوس ہوتا ہے جو انہوں نے میڈیکل کالج میں گزارے تھے وہ کہتی ہیں:

”مجھے میڈیکل کی پریکٹس نہ کرنے کا بالکل بھی افسوس نہیں ہے، بلکہ اپنے چھ قیمتی سال ضائع ہونے کا افسوس ہے۔“

یہ کہہ کر شائستہ نے حسب عادت قہقہہ لگایا مگر یہ مذاق کر رہی تھیں۔ (مگر مذاق ہی مذاق میں دل کی بات بھی کہہ گئیں۔) تاہم پھر سنجیدگی سے کہا کہ:

”ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کی جاتی ہے۔ میں میزبان بن کر صبح سویرے اپنے پروگرام کے ذریعے لوگوں میں خوشیاں بانٹتی ہوں تو میرے خیال میں یہ بھی انسانیت کی خدمت ہی ہے۔“ (مذاق کر رہی ہیں ناں شائستہ جی۔ تو پھر انسانیت کی زیادہ خدمت دینا اور میرا کر رہی ہیں کہ انہوں نے اپنے ”فن“ سے زیادہ لوگوں کو خوش کیا ہو گا۔ اگر کچھ لوگ اس ”فن“ کو انگریزی کا فن سمجھ رہے ہیں تو وہ بھی غلط نہیں کہ بعض لوگوں کا فن محض مذاق ہی تو ہوتا ہے ناں!)

کچھ ادھر ادھر سے

انقلاب حقیر مصلحتوں کے خس و خاشاک سے نہیں، عشق کی آتش تند و سرکش و بے باک سے پھوٹا کرتے ہیں۔ جب عشق جنوں بھی مصلحتوں کی بالکل مار لیں تو کون سی تبدیلی؟ کیا انقلاب؟
(عرفان صدیقی۔ نقش خیال)

کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بارے میں بدگمانیاں رکھنے والوں نے کبھی پاکستان چھوڑنے کا سوچا تک نہیں۔ ایک فمیدہ ریاض گئی تھیں، وہ بھی اپنی غلطی کا احساس کر کے واپس آ گئیں۔ جبکہ قیام پاکستان سے اب تک لاکھوں مسلمانوں کی پاکستان آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ خدا کے لیے ناشکری نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کو ناشکری پسند نہیں ہے۔

(عطاء الحق قاسمی۔ روزن دیوار سے)

عدلیہ کی ساکھ کو ”نقصان“ اس ملک میں صرف آصف علی زرداری کو ہی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، کچھ اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو آصف علی زرداری کی طرح محض ”ایک فرد“ نہ ہوں۔

(نصرت جاوید۔ برملا)

اللہ کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ جمہوریت رہتی ہے یا ڈکٹیٹر شپ، سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے یا انارکی۔ اس کی اپنی ترجیحات ہیں اور وہ اپنی ترجیحات پر حساب لے گا۔
(ادریا مقبول جان۔ حرف راز)

جنرل مشرف نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے فائدے کے لیے آئین کے نیچے اوچھڑ دیے لیکن ان عورت و دشمن قوانین کو ہاتھ نہیں لگایا جن کے لیے حقوق انسانی کی تنظیمیں احتجاج کر رہی ہیں۔
(زاہدہ حنا۔ نرم گرم)

امریکا نے حافظ سعید کے سر کی قیمت ایک کروڑ ڈالر طے کر دی۔ امریکا کے اس اعلان پر پاکستان کے لبرل باشندے کیوں خاموش ہیں؟ کیا حافظ سعید صرف عالم دین ہونے کی بنا پر پاکستانی شہری نہیں رہتے؟
(زیرو پوائنٹ۔ جاوید چوہدری)

ایک طالبہ کا کہنا ہے کہ ”میں عافیہ صدیقی پر ایک فلم بنانا چاہتی ہوں۔ شاید مجھے بھی آسکر اوارڈ مل

جائے۔“ میں اس معصوم بیٹی کو کیا سمجھاؤں کہ ایسے موضوعات مغرب کی منڈی میں کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ کوئی ایسا موضوع چن جو وہاں کے بازار حصص میں اچھا بھاؤ رکھتا ہو اور اس بات کا خیال رکھو کہ تمہاری کہانی کی زد ”اسلام اور پاکستان“ پر پڑتی ہو، مغرب یا امریکا کے کسی طرز عمل کی توہین کا کوئی پہلو نہ لکھتا ہو۔

(نقش خیال۔ عرفان صدیقی)

پنجاب کے اردو پر بہت احسانات ہیں پنجاب میں نئے تجربات ہوئے۔ اردو کے تین اسکول ہیں، دکنی، لکھنؤی اور دہلوی اسکول۔ اس فہرست میں پنجاب کو بھی ہونا چاہیے۔

(انور شعور)



اصحاب سبت

(1100 قبل مسیح اندازاً)

سبت اور اس کی حرمت

ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ”دن حنیف“ یعنی اللہ کے سچے دین کی تعلیم کا سلسلہ ان کی دو شاخوں بنو اسماعیل اور بنو اسحاق کے ذریعے قوموں اور ملکوں میں پھیلا ہے۔ اس لیے ان دونوں سلسلوں

میں ”شعائر اللہ“ کے متعلق یکساں اصول پائے جاتے ہیں۔ مگر حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادے یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے جو بنی اسرائیل کہلاتی ہے اپنے زمانہ کے انبیاء علیہ السلام سے اختلاف اور جھگڑے کر کے بعض معاملات میں تشدد اور سختی کے احکام اور بعض معاملات میں ملت ابراہیمی سے جدا احکام کا بار اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔

مثلاً ”حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی امت میں عبادت الہی کے لیے ہفتہ کے سات دنوں میں سے جمعہ کا دن مقرر فرمایا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہودی بنی اسرائیل نے اپنی روایتی کج روی کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ اصرار کیا کہ ان کے لیے ہفتہ کا دن ”عبادت“ و برکت کا دن مقرر کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو ان کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے غلط اصرار سے باز آجائیں اور ملت ابراہیمی کے اس امتیاز کو جو خدائے برتر کے نزدیک

پسندیدہ و مقبول ہے ہاتھ سے ضائع نہ ہونے دیں۔ لیکن جب ان کا اصرار حد سے تجاوز ہو گیا تو وحی الہی نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع دی کہ خدائے تعالیٰ ان کے اصرار بے جا کے نتیجہ میں جمعہ کی سعادت و برکت کو ان سے واپس لیتا اور ان کے مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے ان کے لیے ہفتہ کو جمعہ کا قائم مقام بنائے دیتا ہے۔ لہذا اب آپ ان کو مطلع کر دیں کہ وہ اپنے اس مطلوبہ دن کی عظمت کا پاس و لحاظ کریں اور اس کی حرمت کو قائم رکھیں۔ ہم اس دن میں ان کے لیے خرید و فروخت، زراعت و تجارت اور شکار کو حرام کرتے اور اس کو صرف عبادت کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہم دنیا میں سب سے آخر آنے والے، آخرت میں سب سے مقدم ہوں گے“ مخصوصاً ”اہل کتاب“ سے جو کہ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ (جمعہ کا دن) ہم سب سے پہلے ان اہل کتاب پر فرض کیا گیا تھا مگر انہوں نے اس کے متعلق اختلاف ظاہر کیا اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس (جمعہ کے دن) کو قبول کر لینے کی ہدایت و توفیق دی سو دنیا میں بھی وہ اس معاملہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے اس لیے کہ یہودی کا روز عبادت جمعہ سے ایک دن بعد ہفتہ ہے اور نصاریٰ کا اس کے بعد (اتوار) کا دن ہے۔“

واقعہ کی تفصیلات

غرض ایک طویل مدت تک یہودی اسرائیل اپنے

مطلوبہ روز عبادت (سبت) کی عزت و حرمت میں اللہ کے کیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جن باتوں کو اس دن میں حرام کر دیا گیا تھا ان سے بچتے رہے مگر آہستہ آہستہ ان کی کج روی اور سرکشی بروئے کار آتی گئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کی ”جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت سبت سے متعلق ان پر لازم کیے گئے تھے“ خلاف ورزی شروع کر دی اور اگرچہ شروع میں یہ خلاف ورزی انفرادی اور خفیہ طریق پر ہوتی رہی مگر شدہ شدہ اس نے علی الاعلان جماعتی حیثیت اختیار کر لی اور بے خونی اور بے باکی کے ساتھ اس کو کیا جانے لگا بلکہ بہانے حیلے تراش کر اپنی اس بد عملی پر فخر کیا جانے لگا تب اللہ کے عذاب نے ان کو آپکڑا اور وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد مبارک سے عرصہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی۔ چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لیے مچھلی ان کا قدرتی شکار تھا اور وہ اس کو بہت محبوب مشغلہ سمجھتے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ لوگ ہفتہ کے چھ دن مچھلی کا شکار کھیتے اور سبت کا روز عبادت الہی میں صرف کرتے۔ اس لیے قدرتی طور پر مچھلیاں چھ روز جان بچانے کی خاطر پانی کی تہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ان کو آزمایا اور ان کی قوت ایمانی کا امتحان لیا حتیٰ کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا اور چھ دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قلزم میں مچھلی کا نام و نشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے روز وہ اس کثرت سے پانی پر تیرتی نظر آئیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں سے با آسانی گرفت میں آسکتی تھیں۔

کچھ دنوں تک تو یہود اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے۔ آخر نہ رہ سکے اور ان میں سے بعض بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کر لیے کہ جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو سکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور سبت کے دن مچھلیوں کی کثرت آمد سے بھی فائدہ اٹھالیں۔

چنانچہ بعض تو یہ کرتے کہ جمعہ کی شام کو قلزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے ان گڑھوں تک نہر کی طرح ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز صبح آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڑھوں میں چلا جائے اور اس طرح مچھلیاں بھی پانی کے بہاؤ سے ان میں چلی جائیں اور جب سبت کا دن گزر جاتا تو یک شنبہ (اتوار) کی صبح ان مچھلیوں کو گڑھوں میں سے نکال کر کام میں لاتے۔ اور بعض یہ کرتے کہ جمعہ کے روز دریا میں جال اور کانٹے لگا آتے تاکہ سبت کے روز ان میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح ان جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے اور یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بے حد مسرور نظر آتے تھے چنانچہ جب ان کے علمائے حق اور مخلصین امت نے ان کو اس حرکت سے روکا تو انہوں نے معترضین کو یہ جواب دیا کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ سبت کے دن شکار نہ کرو، لہذا ہم اس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ اتوار کے روز کرتے ہیں۔ باقی یہ ترکیبیں منع نہیں ہیں اور اگرچہ ان کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا مگر کج روی یہ جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتی تھی کہ ہمارا یہ حیلہ خدا کے یہاں ضرور چل جائے گا۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دین کے احکام پر صداقت و سچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے اور اسی لیے شرعی حیلے نکال کر ان کے امتثال سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ گویا خود فریبی میں مبتلا تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ان چند حیلہ جو انسانوں کی ان حرکات کا علم دوسرے حیلہ ساز افراد کو

بھی ہوا اور انہوں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی اور آخر کار بستی کی ایک بہت بڑی جماعت بپانگ دہل ان جیلوں کی آڑ میں سبت کی حرمت کی خلاف ورزی کرنے لگی۔

اس جماعت کی یہ ذلیل حرکات دیکھ کر بستی ہی میں سے ایک سعادت مند جماعت نے کمر ہمت چست کی اور ان کے مقابل آکر ان کو اس بد عملی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا۔

لیکن حیلہ جو جماعت اپنے جیلوں پر قائم رہی اور سبت کی حرمت اور اس دن شکار کی ممانعت کے احکام سے قطعاً غافل اور بے پروا ہو کر نڈر اور بے باک ہو گئی تب اچانک غیرت حق کو حرکت ہوئی اور مہلت کے قانون نے گرفت کی صورت اختیار کر لی۔

رب تعالیٰ کا حکم ہو گیا کہ جس طرح تم نے میرے قانون کی صورت و شکل کو جیلوں کے ذریعے مسخ کر دیا، قانون پاداش عمل کے مطابق اسی طرح تمہاری صورت و شکل بھی مسخ کر دی جاتی ہے تاکہ ”پاداش عمل از جنس عمل“ کے مظاہرے سے دوسرے لوگ بھی عبرت و بصیرت حاصل کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ”کن“ کے اشارہ سے ان کو بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ کر دیا اور وہ انسانی شرف سے محروم ہو کر ذلیل و خوار حیوانوں میں تبدیل ہو گئے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ سعادت مند جماعت کا جو حصہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا رہا، اس نے جب یہ دیکھا کہ متمرد اور سرکش جماعت کسی طرح حق پر کان نہیں دھرتی تو مجبور ہو کر اس نے ان سے ترک تعاون کر لیا اور کھانا پینا اور خرید و فروخت غرض ہر قسم کا اشتراک عمل ختم کر دیا حتیٰ کہ اپنے مکانوں کے دروازوں تک کو ان پر بند کر دیا تاکہ کسی قسم کا بھی اشتراک باقی نہ رہے۔

چنانچہ جس دن بد کرداروں پر عذاب الہی نازل ہوا تو ان کے معاملہ کی اس جماعت کو محنتوں خبر نہ ہوئی لیکن

جب کافی وقت گزر گیا اور اس جانب سے کسی انسان کی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی تب ان کو خیال ہوا کہ معاملہ دیگر گوں ہے لہذا وہاں جا کر دیکھا تو صورت حال اس درجہ عجیب تھی کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی وہاں انسانوں کی جگہ بندر اور خنزیر تھے جو اپنے ان عزیزوں کو دیکھ کر قدموں میں لوٹے اور اپنی حالت زار کا اشاروں سے اظہار کرتے تھے۔

سعادت مند جماعت نے باحسرت و یاس ان سے کہا کہ۔ ”کیا ہم تم کو بار بار اس خوفناک عذاب سے نہیں ڈراتے تھے؟“ انہوں نے یہ سنا تو حیوانوں کی طرح سر ہلا کر اقرار کیا اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اپنی ذلت و رسوائی کا دردناک نظارہ پیش کیا۔

تعیین مقام

قرآن عزیز سورہ اعراف میں اس بستی کے بارے میں کہ جہاں یہ حادثہ گزرا صرف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ ساحل بحر و واقع تھی مگر مفسرین نے اس کے تعین میں متعدد نام لیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت یہ نقل کی جاتی ہے کہ یہ مدین کا واقعہ ہے اور ابن زید کہتے ہیں کہ اس کا نام مینا تھا اور یہ مدین اور عینونا کے درمیان واقع تھا۔

ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ منقول ہے کہ اس بستی کا نام ایلہ تھا اور یہ بحر قلزم کے ساحل پر واقع تھی۔ عرب جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ جب کوئی طور سینا سے گزر کر مصر کو روانہ ہو تو طور سینا کی جانب ساحل بحر یہ بستی ملتی تھی یا یوں کہہ لیجئے کہ مصر کا باشندہ اگر مکہ کا سفر کرے تو راہ میں یہ شہر پڑتا تھا، یہی قول راجح ہے۔

مسخ شدہ اقوام کا انجام

جو قومیں رب تعالیٰ کے عذاب سے مسخ کر دی جاتی ہیں۔ وہ زندہ باقی نہیں رکھی جاتیں بلکہ تین دن کے اندر اندر ان کو فنا کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل کا

سلسلہ جاری نہ ہو۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے دریافت کیا کہ ”یہ بندر و خوک مسخ شدہ یہودی نسل میں سے ہیں؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”ہمیں۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر مسخ کی لعنت

مسلط کرتا ہے تو اس کی نسل نہیں چلاتا۔ یہ جانور اللہ کی مستقل مخلوق ہیں لہذا جب رب کا غضب یہودی پر نازل ہوا تو ان کو ان جانوروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ”مسخ شدہ انسان تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے اور نہ انہوں نے اس درمیان کچھ کھایا پیا اور نہ ان کی نسل کا سلسلہ چلا۔“

آدم علیہ السلام کی وفات

اور بیٹے شیمث علیہ السلام کو وصیت

”شیمث“ کا مطلب ہے ”اللہ کا دیا ہوا تحفہ۔“ آدم علیہ السلام نے ان کا یہ نام اس لیے رکھا تھا کہ ہاتھل کے قتل ہو جانے کے بعد اللہ نے انہیں شیمث عطا فرمایا۔

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ نے فرمایا۔ ”جب آدمی علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے اپنے بیٹے شیمث کے حق میں وصیت کی۔ انہیں رات اور دن کے اوقات اور ان اوقات میں ادا کی جانے والی عبادات کی تعلیم دی اور انہیں بتایا کہ ایک طوفان آنے والا ہے۔

کہتے ہیں کہ آج کل جتنے انسان موجود ہیں، ان کا نسب شیمث علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ آدم علیہ السلام کے دوسرے بیٹوں کی اولاد ختم ہو چکی ہے۔ (واللہ اعلم)

جب آدم علیہ السلام فوت ہوئے، اس دن جمعہ تھا۔

فرشتے اللہ کے پاس سے جنت کی خوشبو اور جنت کا کفن لے کر آئے اور ان کے بیٹے اور خلیفہ شیمث علیہ السلام سے تعزیت کی۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا جب آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے فرمایا۔

”بیٹو! میرا جنت کے پھل کھانے کو جی چاہتا ہے۔“ وہ تلاش کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ انہیں سامنے سے فرشتے آتے ملے، جن کے پاس آدم علیہ السلام کا کفن اور خوشبو تھی اور ان کے پاس گل کپڑے، کسیاں اور نوکریاں بھی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

”آدم کے بیٹو! تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟“ یا ”آدم کے بیٹو! تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہمارے والد صاحب بیمار ہیں اور جنت کے میوؤں کی خواہش رکھتے ہیں۔“

فرشتوں نے کہا۔ ”واپس چلے جاؤ، تمہارے والد تو فوت ہونے والے ہیں۔“

فرشتوں نے ان کی روج قبض کی، غسل دیا، کفن پہنایا، خوشبو لگائی، آپ کی قبر کھودی اور لحد تیار کی۔ پھر انہوں نے آدم علیہ السلام کی نماز جنازہ ادا کی، پھر انہیں قبر میں رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ پھر انہوں نے کہا۔ آدم کے بیٹو! تمہارے لیے یہی طریقہ ہے۔“

حضرت آدم علیہ السلام کہاں دفن ہوئے؟ اس میں اختلاف ہے۔ مشہور ہے کہ انہیں ہندوستان (کے پاس سری لنکا) میں اس پہاڑ کے قریب دفن کیا گیا، جہاں انہیں جنت سے اتارا گیا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں جبل ابی قیس پر دفن کیا گیا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے موقع پر ان کی اور حضرت حوا علیہ السلام کی میتوں کو ایک ناہوت میں ڈال کر کشتی میں رکھ لیا تھا۔ پھر (طوفان ختم ہونے کے بعد) انہیں بیت المقدس میں دفن کر دیا۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ
 ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
 ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
 ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
 اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
 آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
 لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

☆ عرق گلاب جلد سے پانی کے غیر ضروری اخراج کو
 روکتا ہے۔ عموماً گرمیوں کے دنوں میں جنہیں زیادہ
 پسینہ آتا ہے عرق گلاب کا استعمال انہیں پسینے کی بدبو
 سے نجات دلاتا ہے۔

☆ چھائیوں سے نجات حاصل کرنے اور جلد کی
 رنگت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے عموماً بازاری
 کریمیں استعمال کی جاتی ہیں مگر جلدی امراض کے
 ماہر ڈاکٹر عرق گلاب کو ترجیح دیتے ہیں۔ چہرے کی خشکی
 اور جھریوں سے بچنے اور رنگت گوری کرنے کے لیے
 عرق گلاب، گلیسرین اور لیموں کا رس ملا کر استعمال کرنا
 مفید ہے۔

☆ گھریلو خواتین جن کے ہاتھوں کی انگلیاں کپڑے
 اور برتن دھونے سے کھردری ہو کر پھٹ جاتی ہیں اور
 ان میں زخم بن جاتے ہیں۔ ایسے میں گلیسرین اور
 عرق گلاب روزانہ تین چار مرتبہ استعمال کرنا بے حد
 مفید ہے۔

☆ بغض لوگوں کی اڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔ اگر وہ
 عرق گلاب اور گلیسرین کا مکسچر لگا میں تو ان کی یہ
 بیماری ختم ہو جائے گی۔

☆ عرق گلاب زیتون اور شہد کے ساتھ مل کر جلد
 اور معدہ کے افعال بہتر بناتا ہے۔ خصوصاً صرف عرق
 گلاب پینے سے قبض دور ہو جاتا ہے اور یہ انتڑیوں کو
 جراثیم سے پاک و صاف کرتا ہے۔

☆ سیاہ مرچ کو عرق گلاب میں پیس کر دانتوں پر اس کا
 لیپ کر دیا جائے تو درد سے فوراً نجات مل جاتی ہے۔
 جبکہ عرق گلاب میں سیاہ مرچ کو پکا کر اس کا ماتھے پہ لیپ
 کیا جائے تو سردی کا زلہ دور ہو جاتا ہے۔

☆ ناخنوں پر دھبے پڑ جائیں تو عرق گلاب میں لیموں
 کے چند قطرے برابر ڈال کر ناخن دھو لینے سے دھبے اتر
 جاتے ہیں اور ناخنوں کی قدرتی چمک اور افزائش برقرار
 رہتی ہے۔



ادارہ
 حیات

مباضی میں ہمارے ہاں کی خواتین اپنے چہرے کی دلکشی
 کے لیے قدرتی اجزاء سے بنی ہوئی ایسی استعمال کرتی
 تھیں چنانچہ ان کی صحت و تندرستی اور حسن و شادابی
 بالکل نوجوانوں کی طرح برقرار رہتی تھی۔ اور ان کا چہرہ
 صاف شفاف اور تروتازہ رہتا تھا۔ عرق گلاب لیموں کا
 رس استعمال کیا کرتی تھیں۔ بعد میں جدید طب نے
 ان دونوں چیزوں کو دلکشی اور جلد کی صحت کا ضامن
 قرار دیا۔ عرق گلاب انسانی جلد کے لیے بے حد
 مفید ہے۔ جلدی امراض کے ماہرین اسے کئی بیماریوں
 میں استعمال کراتے ہیں۔

☆ عرق گلاب جلد کی قوت مدافعت بڑھاتا ہے۔ یہ
 جلد میں پانی کی صحیح مقدار قائم کرنے میں مددگار ثابت
 ہوتا ہے جس کی وجہ سے جلد ملائم، چمکدار اور ہموار
 رہتی ہے۔